ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتّب
سعید احمد اکبرآبادی

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآنِ کریم کے الفاظ کی شرح اور اُس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اُردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لُغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل ملتی ہے۔ ایک مُدرّس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اُردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کرسکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہلِ علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں "لغات قرآن" کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے۔ جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی سہولت سے نکالے جاسکتے ہیں۔ "مکمل لغات قرآن" اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد		صفحات	تقطیع		قیمت		قیمت
جلد اوّل	صفحات	۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد	پانچ روپے	مجلّد	چھ روپے
جلد دوم	"	۳۳۶	"	"	پانچ روپے	"	چھ روپے
جلد سوم	"	۳۳۲	"	"	پانچ روپے	"	چھ روپے
جلد چہارم	"	۳۸۶	"	"	چھ روپے	"	سات روپے
جلد پنجم	"	۵۰۰	"	"	آٹھ روپے	"	نو روپے
جلد ششم	"	۳۲۴	"	"	پانچ روپے	"	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبہ بُرہان۔ اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی

مجلۂ علمیہ

بُرہان

کی

۶۳ ویں جلد

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

ندوۃ المصنفین دہلی

ضمیمہ برہان جولائی ۱۹۶۹ء

فہرست مضامین ماہنامہ برہان دہلی

جنوری ۱۹۶۹ء تا جون ۱۹۶۹ء جلد ۶۲

فہرست صاحبان نگارش ماہنامہ برہان دہلی

جلد ۶۲ جنوری ۱۹۶۹ء تا جون ۱۹۶۹ء

برہان

جلد ۶۳ | ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ مطابق جولائی ۱۹۶۹ء | شمارہ ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

۱۹۷۲ء کے عام انتخابات، ملک کی موجودہ افسوسناک حالت اور مسلم مسائل کے متعلق "تیج ویکلی" کے نامہ نگار کے اصرار پر پچھلے دنوں میرا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا "تیج ویکلی" مسلم حلقوں میں برائے نام ہی پڑھا جاتا ہے ادھر مضمون کا تقاضا یہ تھا کہ مسلم حلقوں میں اس کا زیادہ سے زیادہ تعارف ہو، اصلاً اس طرح کے مضامین کی صحیح جگہ اخبارات ہیں، لیکن میرے پاس کوئی اخبار نہیں ہے اور ہر اخبار کی اپنی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں، وہ چاہتے ہیں تو غیر ضروری مضامین کو جلی عنوانات کے ساتھ شایع کر دیتے ہیں، نہیں چاہتے تو اہم اور ضروری مضمونوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، اس لیے مناسب خیال کیا گیا کہ یہ انٹرویو "برہان" کے "نظرات" میں محفوظ ہو جائے ۔ جو اخبارات اس کو شایع کرنا مفید سمجھیں "برہان" سے نقل کر سکتے ہیں۔

حالات میں اس قدر اتار چڑھاؤ ہے کہ ۷۲ء کے عام چناؤ کے متعلق ابھی کوئی آخری اور قطعی رائے دینی مشکل ہے۔ نازک تر بات یہ ہے کہ غیر معمولی شور و غوغا کے باوجود ملک میں کوئی ایسی مضبوط اور صالح اپوزیشن نہیں بن سکی جو برسر اقتدار جماعت کی جگہ لے سکے اور ان ذمہ داریوں کو پورا کر سکے جن کی پچاس کروڑ انسانوں کی آبادی سے زیادہ ملک کے نظم و نسق کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی ضرورت ہے۔

ان حالات میں دھڑے بندیوں اور اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے اگر کانگریس اس دفعہ برسر اقتدار نہ بھی آسکی تو اس سے استحکام اور ترقی کی بجائے ملک میں مزید افراتفری پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

موجودہ کانگریس کے متعلق میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بہت سے افراد جن کے ہاتھ میں زمام کار ہے۔ اقتدار کے نشہ میں مست ہو گئے ہیں اور ان میں وہ ولولہ اور اصول کے لئے قربانی دینے کا جذبہ باقی نہیں رہا جو کبھی اس تاریخی جماعت کی خصوصیت تھی۔

اب کانگریس محض قدیم روایات کا نام لے کر ان نئی جماعتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو تازہ جوش اور ولولہ کے ساتھ کانگریس کے ماضی اور اس کی سیکولر ڈیموکریسی کی پالیسی کو ڈائنامیٹ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ شاید ان ہی اندیشوں کی بنا پر گاندھی جی نے کانگریس کے موجودہ ڈھانچے کو توڑنے کا مشورہ دیا تھا۔

لیکن اس کے باوجود بھی کانگریس کی موجودہ لیڈر شپ اگر اس کا وجود ضروری سمجھتی ہے تو اس کو اس جماعت کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لئے بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اس کو ان کمزوریوں اور آلودگیوں سے

پاک کرنا ہوگا جن میں پھنس کر اس کی انقلابی روح مضمحل بلکہ فنا ہوتی جا رہی ہے۔

مسلمانوں کے مسائل اور ان کے کردار کے بارے میں آپ نے زور دیتے ہوئے کہا کہ میں بے جھجک کہہ سکتا ہوں کہ تقسیم ملک کی افسوسناک اور تاریخی غلطی کے بعد اگر یہ جماعت ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کی صدقدلانہ کوشش کرتی تو آج مسلمان کانگریس سے اس قدر دور نہ ہوتے وہ بے نوا اور پریشان حال تھے ان کو ایک نگاہ محبت کی ضرورت تھی۔

ان کی موجودہ حالت یہ ہے کہ اس جماعت کے طریق عمل سے تنگ آئے ہوئے ہیں اور کوئی دوسری ایسی تنظیم ان کو نظر نہیں آتی جس میں شامل ہو کر پارلیمنٹری پالیٹکس اور زندگی کے دوسرے میدانوں میں اپنا حق ادا کرسکیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہی نکلنا چاہیے تھا کہ چھ کروڑ انسانوں کی یہ عظیم الشان تعداد ملک کی عملی سیاست میں تقریباً بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔

پچھلے الیکشنوں کے برخلاف موجودہ انتخابات میں مایوسی اور غم والم میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں نے اکثر مقامات پر کانگریس کے خلاف اپنی رائے کا استعمال کرکے زندگی کا ثبوت دینے کی سعی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں تو زندگی کیا آتی کانگریس کو البتہ ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ گیا۔

غور کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری یہ قدیم اور وسیع وعریض جماعت اگر اپنے اصول اور روایات کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہے تو اس کو مسلم مسائل پر خاص توجہ دے کر اس ملک کے کروڑوں باشندوں کا زائل شدہ اعتماد واپس لانا چاہیے جنھوں نے تمام خطرات سے بے پرواہ ہو کر پچھلے الیکشنوں میں کانگریس کو ووٹ دیا تھا۔ ان مسائل کے حل سے نہ صرف یہ کہ ملک کی ایک ایسی اقلیت مطمئن ہوگی جس کے وجود سے اس جماعت کے ڈھانچے میں روحِ تازہ واپس آسکتی ہے بلکہ اس سے پورے ملک کو استحکام ملے گا اور فرقہ پرست طاقتیں مایوس ہو کر دم توڑنے لگیں گی۔

اس مرحلہ پر مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ یہی وقت ہے کہ موجودہ پارلیمنٹ کے مسلمان کانگریسی ممبران ایک زبان ہو کر اپنے لیڈروں پر اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ پر موثر دباؤ ڈالیں۔ اس کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں جن کی تفصیل اس وقت غیر ضروری ہے۔ پارلیمنٹ کے یہ مسلمان ممبر چاہیں تو صورتِ حال کے سدھار کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں اور ڈسپلن کے حدود میں رہ کر کر سکتے ہیں۔ مگر شاید وہ کسی دوسری ہی دنیا میں رہتے ہیں۔

صورتِ حال کا ایک اور بھی اہم پہلو ہے جس کی دہشت ناکی کا ابھی ہمیں پورا اندازہ نہیں اور وہ ہے ایک ایسے ملک کے رہنے والوں کا جارحانہ اور تشدد پسندانہ رجحان اور اس رجحان میں مسلسل اضافہ اور شدت۔ جس نے صرف عدم تشدد کی طاقت سے ملک کو ایک ایسے اقتدار سے آزاد کرایا تھا جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے حدودِ سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہمارے عدمِ تشدد کی حیرت انگیز اخلاقی طاقت کے فلسفہ پر ریسرچ کر رہی ہیں اور ہم اس نعمت کو ٹھکرا کر صوبہ پرستی، زبان پرستی اور اسی طرح کی دوسری حماقتوں کے ہمرنگ زمین دام میں پھنس رہے ہیں اور اس کے لئے ہر قسم کے تشدد اور بربریت کو روا رکھتے ہیں۔

نہیں کانگریس کے اقتدار پر ضربیں لگاتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ ملک اسی کے ذریعہ اور واسطہ سے آزاد ہوا ہے اور آزادی کے بعد ملک کی صنعتی اور زرعی ترقی کے لئے اس نے اربوں کھربوں روپے کے پلان بنائے ہیں او بنا رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بے تماشا کرپشن، کارپردازوں کی ناتجربہ کاری اور بہت سی دوسری خرابیوں کی وجہ سے ان عظیم الشان منصوبوں اور پلانوں کے نتیجے خاطر خواہ نہیں نکل رہے ہیں اور ملک کا بال بال سُودی قرضوں میں بندھ گیا ہے اگر خاطر خواہ نتیجے نکلتے تو آج ملک کی قسمت کا کچھ اور ہی انداز ہوتا۔ لیکن سالہا سال کی اس محنت کو اگر ہم نے گروہی سیاست اور کانگریس دشمنی کی قربان گاہ پر چڑھا دیا تو ان منصوبوں سے جو فائدے اب تک ہوئے ہیں یا ہونے والے ہیں وہ بھی خاک میں مل جائیں گے اور نتائج کی کامیابی اور شگفتگی کی جس توقع پر ہمارا ملک باہر کے سُودی قرضوں کے بار کو برداشت کر رہا ہے وہ توقع بھی ختم ہو جائے گی۔

یہ وقت از سرِ نو الف، بے، تے پڑھنے کا نہیں ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے۔ اس اُکھاڑ پچھاڑ میں کوئی بیدار اور مضبوط اپوزیشن وجود میں آجاتی تو بہت سی دشواریاں خود بخود دور ہو جاتیں لیکن یہاں تو عجیب کیفیت ہے کہیں نغمہ اور ساز میں ہمنوائی نہیں ہے۔

ہر ایک اپنی ڈفلی بجا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ کانگریس کو شکست دینے کے جذبے میں کچھ سیاسی پارٹیاں اگر متفق ہونے کی جدوجہد بھی کرتی ہیں تو نظریوں کے اندھے اختلاف کی اندھیریوں کی وجہ سے چند قدم بھی ساتھ نہیں چل سکتیں اور پھر مزید انتشار کا سبب بنتی ہیں۔

ملکی فسادات کے بارے میں مفتی صاحب نے خاص طور پر اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ فسادات اور بے امنی کا ہے۔ ان فسادات نے مسلمانوں کے دل و جگر کو چھلنی کر دیا ہے اور عزت و آبرو کی بربادی کے علاوہ اقتصادی اور معاشی اعتبار سے بھی وہ تباہ و برباد ہوتے جا رہے ہیں۔

فسادات کی روک تھام کا واحد حل میری رائے میں ایک ہی ہے، وہ یہ کہ وطن دوست جذبۂ خدمت رکھنے والے مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں پولیس اور فوج میں لئے جائیں۔ ہمارے صاحبِ اقتدار حضرات توہمات اور اندیشوں سے بے نیاز ہو کر اس نسخہ کو آزما کر تو دیکھیں۔

آخر میں ایک بات مسلمانوں سے بھی کہنی ہے ان کو سوچنا چاہیئے کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں ان کو یہیں جینا اور یہیں مرنا ہے وطن کی عزت و آبرو کے ساتھ ان کی عزت و آبرو وابستہ ہے ان کو ہر حالت میں ملک کی فلاح و ترقی کے ہر کام میں بھرپور حصہ لینا چاہیئے۔ دستور نے ان کو جو حقوق دیئے ہیں ان کی قدر کرنی چاہیئے۔ آئینی اور دستوری حقوق کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔

آج کی جمہوری دنیا میں اس کی زبردست اہمیت ہے۔ جہاں تک ان حقوق کو عمل میں لانے کا تعلق ہے اس کے لئے ہمیں اپنی آواز کی مضبوطی کے ساتھ رائے عامہ کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ شکوہ شکایت اور نالہ و شیون سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اس عادت کو چھوڑنا ہی پڑے گا

قومی یا مشترک حکومت کے متعلق اس مرحلہ پر میں کچھ کہنا نہیں چاہتا یہ مسائل پیچیدہ اور تفصیل طلب ہیں اس طرح کے امکانات کو ہمیں مستقبل کے حوالہ کر دینا چاہیئے۔

عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

ڈاکٹر خورشید احمد فارق، پروفیسر عربی، دہلی یونیورسٹی

(۱۷)

مذاہب اور فرقے

شہرستانی[۱] (بارہویں صدی کا ربع ثانی):

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہندو ایک بڑی قوم ہیں اور ان کا ایک بڑا مذہب ہے اور ان کے مختلف مذہبی عقائد ہیں۔ ان کا ایک فرقہ برہمن کہلاتا ہے، یہ لوگ نبوت کے بالکل منکر ہیں (اور اس کی ضرورت نہیں تسلیم کرتے)، ان کا ایک فرقہ دہریت کی طرف مائل ہے، دوسرا ثنوی[۲] عقیدے کا حامل ہے اور ابراہیمی مذہب کو حق قرار دیتا ہے لیکن بیشتر ہندو صابئی[۳] مذاہب کے پیرو ہیں، ان

---

[۱] الملل والنحل ۱/۸۰-۴۴۴ [۲] ثنویہ فرقہ کا عقیدہ ہے کہ دنیا دو جوہری اور ازلی قوتوں سے مرکب ہے، ایک روشنی اور دوسرا اندھیرا اور دنیا کے خیر و شر ان دونوں کے مظہر ہیں، ان دونوں میں ہمیشہ تصادم اور آویزش رہتی ہے اور ہر ایک دوسرے پر غالب ہونے کی کوشش کرتا ہے، اس فرقہ کے مطابق انسان کا فرض ہے کہ خیر کے ساتھ تعاون کرے اور شر کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ دے۔ [۳] یعنی ستاروں کو انسان اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دیتے ہیں اور ستاروں کو خدا کے دربار میں سفارشی مان کر ان کی تعظیم اور پوجا کرتے ہیں۔

کی ایک جماعت روحانیات[1] کی قائل ہے، ایک جماعت ہیاکل[2] پرست ہے اور ایک جماعت بتوں کی عبادت کرتی ہے.... ہندوؤں میں ایسے فلسفی بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے علم و عمل میں یونانی فلاسفہ کی طرح ہیں۔ دہری، ثنوی یا صابئی ہندوؤں کے مسلک کی تفصیل یہاں بیان کرنا ضروری نہیں کیونکہ ہم پہلے دہریہ، ثنویہ اور صابئہ فرقوں کے معتقدات کا ذکر کر چکے ہیں (اور اس کے مطالعہ سے ان ہندو فرقوں کے عقائد معلوم کئے جا سکتے ہیں)۔ اُن ہندوؤں کے پانچ فرقے ہیں جنھوں نے اپنے نظریات کی تشریح و توضیح پر کتابیں لکھی ہیں: براہمہ، اصحاب الروحانیات، اصحاب الہیاکل، بت پرست اور فلسفی۔

براہمہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس فرقہ کے براہمہ کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ابراہیمی مذہب کا پیرو ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ برہمن جن کا طرۂ امتیاز نبوت کا انکار ہے ابراہیم نبی کے کیسے قائل ہو سکتے ہیں۔ جو ہندو فرقہ ابراہیم کو نبی مانتا ہے ثنویہ کہلاتا ہے، جو روشنی اور اندھیرے کا قائل ہے۔ ان کے معتقدات کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، در اصل برہمن ایک شخص کی طرف منسوب ہیں جو برہام کہلاتا تھا، جس نے انکار نبوت کا اصول وضع کیا اور اس کے عقلاً ناقابل قبول ہونے کے مختلف وجوہ پیش کئے مثلاً اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ جو ہستی نبی بھیجتی ہے ضروری ہے

---

[1] بقول شہرستانی روحانیات سے مراد فرشتے جیسی غیر مجسم اور برائیوں سے پاک ہستیاں ہیں جو خدا اور انسان کے درمیان آسمانوں میں بصورت سبع سیارہ نظر آتے ہیں اور جن کی تعظیم کے ذریعہ انسان خدا کا تقرب حاصل کر سکتا ہے [2] ہیاکل سے سات سیاروں کے رتبع مراد ہیں، اصحاب الہیاکل صابئہ کا ایک فرقہ ہے اور اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو سات سیاروں کو خدا اور انسان کے درمیان واسطہ قرار دیتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ سیاروں کی تعظیم سے خدا کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔

کہ اس کا عقل سے ادراک ممکن ہو یا نہ ہو، اگر عقل سے ادراک ممکن ہے تو ہم عقل تام کے ذریعہ اس کا ادراک کر سکتے ہیں، اس لئے ہمیں نبی کی کیا ضرورت ہے اور اگر اُس ہستی کا عقل سے ادراک نا ممکن ہے تو ایسی ہستی عقلاً قابل قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ ناقابل ادراک ہستی کو قبول کرنا انسانی دائرہ سے نکل کر حیوانی دائرہ میں داخل ہونے کے برابر ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اس بات کے عقلی شواہد موجود ہیں کہ خدا حکیم ہے، انسان اس حکمت والے کی عبادت ان شواہد کے باعث کرتا ہے جن کو عقل تسلیم کرتی ہے، عقل اس بات کو مانتی ہے کہ عالم کو ایک قادر، عالم اور ذی حکمت ہستی نے بنایا ہے نیز یہ کہ اس نے اپنے بندوں کو بہت سی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے جو شکر کی مستحق ہیں، پس ہم اپنی عقل سے خدا کی مصنوعات میں مضمر حکمت کا ادراک کر سکتے ہیں اور اس کی عنایتوں کے شکر گذار ہوتے ہیں جو اس نے ہم پر کی ہیں اور چونکہ ہم نے عقل سے اس ہستی کا ادراک کر لیا ہے اور اس کی عنایتوں کا شکریہ بھی ادا کیا ہے اس لئے ہم اس کے ثواب کے مستحق ہیں اور اگر ہم خدا کا انکار اور اس کے احسانات کی ناشکری کریں تو سزا کے مستحق ہو جائیں گے؛ اندریں صورت ہم اپنے جیسے انسان کا کیوں اتباع کریں کیونکہ اگر وہ ہمیں خدا کی معرفت اور شکر گذاری کا حکم دیتا ہے تو یہ دونوں باتیں عقل تام کے ذریعہ پہلے ہی سے ہمیں حاصل ہیں اور اگر وہ ایسا حکم دے جو معرفت اور شکر کے منافی ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ عقل تسلیم کرتی ہے کہ اس عالم کا ایک ذی حکمت بنانے والا ہے لیکن انسان ذی حکمت کی عبادت ایسے طریقوں سے کرنا پسند نہیں کرتا جو عقل کی میزان میں قبیح ہوں۔ انبیاء نے مذہب میں ایسی باتیں داخل کر دی ہیں جن سے عقل ابا کرتی، مثلاً عبادت کے وقت ایک مخصوص گھر کی طرف منہ کرنا، اس کا طواف کرنا، سعی کرنا۔ کنکریاں پھینکنا، احرام باندھنا، تلبیہ کہنا، ایک سخت پتھر کو چومنا، جانوروں کو ذبح کرنا اور ایسے جانوروں کا کھانا حرام قرار دینا جو انسان کی غذا بن سکتے ہیں ... یہ اور اسی طرح کے قیود عقلی تقاضوں کے خلاف ہیں ...

برہمنوں کے مختلف فرقے ہیں، مثلاً ان میں سے ایک فرقہ بت پرست ہے (اصحاب البددۃ)

دوسرا فکری ریاضت کا قائل (اصحاب الفکرہ) اور تیسرا آواگون (تناسخ) کا معتقد۔

بُت پرست برہمن (اصحاب البدرہ)

برہمنوں کی رائے میں بُت وہ شخص ہے جو نہ تو پیدا ہوا ہو، نہ شادی بیاہ کرے، نہ کھائے پئے، نہ بوڑھا ہو، نہ مرے۔ اس دنیا میں ظاہر ہونے والے پہلے بُت کا نام شاکمین تھا، اس کے معنی شریف ومعزز سردار کے ہیں، یہ ہجرت سے پانچ ہزار برس پہلے ظاہر ہوا تھا۔ باخبر ہندو علماء کی رائے ہے کہ بت کے بعد بُودسیعیہ کا مرتبہ ہے، اس کے معنی ہیں راہِ حق کا طالب انسان اس مرتبہ تک صبر، فیاضی، اچھے میلانات، دنیا اور دنیا کے ساز وسامان، خواہشات لذتوں اور ناجائز کاموں سے اجتناب اور ساری مخلوق کے ساتھ محبت وہمدردی نیز دس گناہوں سے احتراز اور سیرت میں دس اچھی عادتیں پیدا کرنے سے پہنچنا ممکن ہے، دس گناہ یہ ہیں: جاندار کا قتل، غیر کے مال پر ہاتھ ڈالنا، زنا، جھوٹ، چغلخوری، فحش کلامی، گالی گلوج، لوگوں کو بُرے لقب دینا، بے ہودہ پن اور اخروی جزا سزا سے انکار۔ دس عمدہ خصلتیں یہ ہیں: سخاوت، قصور سے درگذر کرنا، غیظ وغضب میں بردباری سے کام لینا، دنیوی خواہشات سے پرہیز، فانی دنیا سے نکل کر باقی دنیا میں نجات پانے کے مسئلہ پر غور وخوض کرنا، علم وادب سے عقل کی تربیت، ہر کام کے انجام پر نظر رکھنا۔ والسادسة القدرة علی تصریف النفس فی طلب العلیات (؟) ہر شخص کے ساتھ نرمی اور اخلاق سے بات کرنا، دوستوں کے ساتھ ایثار کرنا اور حسن سلوک سے پیش آنا، خدا کی مخلوق سے دل ہٹا لینا اور حق کی طرف کلیۃً مائل ہو جانا اور حق کے وصل کی خاطر جان دے دینا۔۔۔۔

فکری ریاضت کے قائل برہمن (اصحاب الفکر والوہم)

برہمنوں کا وہ فرقہ ہے جو ہیئت اور نجوم سے واقف ہے، جس نے ستاروں کا مطالعہ

کر کے ان سے متعلق احکام وضوابط وضع کیے ہیں جو ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں .... یہ لوگ فکر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، ان کی رائے ہے کہ فکر پر محسوسات اور معقولات دونوں کا پَر تو پڑتا ہے، اس لئے یہ لوگ سخت ریاضت کرتے ہیں جس کے زیر اثر فکر کے پردہ پر محسوسات کے نقوش پڑنا بند ہو جاتے ہیں اور صرف (معقولات یعنی) عالم بالا کے نقوش ہی مرتسم ہوتے ہیں اور اس کے رموز فکر پر آشکارا ہو جاتے ہیں، کبھی ایک مشاق صاحب فکر غیب کی باتیں بتا دیتا ہے، کبھی بارش روک لیتا ہے اور کبھی کسی پر اپنا فکری شکنجہ اس طرح کستا ہے کہ وہ فوراً مر جاتا ہے .... فکر اور وہم جب محسوسات کے نقوش لینا بند کر دیتے ہیں تو حیرتناک کام انجام دینے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

تناسخ کے قائل برہمن

تناسخ کے معنی ہیں آکواگون[1] ادوار کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ... تناسخ کے مطابق جزاو سزا دنیا میں ملتی ہے آخرت میں نہیں اور ہم دنیا میں جو اعمال کرتے ہیں وہ اُن اعمال کا بدلہ ہوتے ہیں جو ہم نے پہلے اَدوار (جنم) میں کیے تھے، آرام، خوشی اور شادمانی جن سے ہم دنیا میں بہرہ ور ہوتے ہیں وہ ان اچھے اعمال کا نتیجہ ہیں جو ہم نے پچھلے جنم میں کیے تھے اور غم، تکلیف اور ناداری جس کے ہم دنیا میں شکار ہوتے ہیں ان برے اعمال کا نتیجہ ہیں جو پچھلی زندگی میں ہم سے سرزد ہوئے تھے[2]۔

ہم پہلے ان مذاہب کا ذکر کر چکے ہیں جو تناسخ کے قائل ہیں، (ہندوؤں کا) کوئی مذہب ایسا نہیں جس کی بنیاد ہی آواگون کے تصورات پر استوار نہ ہوئی ہوں، ہر (ہندو) مذہب میں تناسخ کی تشریح وتعبیر کے صرف طریقے مختلف ہیں۔ ہندوستانی برہمنوں (تناسخیۃ الہند) کا آواگون پر گہرا عقیدہ ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ مقررہ وقت پر آتا ہے اور ایک درخت

---

[1] یعنی روحوں کا ہمیشہ جسم بدلتے رہنا، اچھی روحوں کا اچھے جسموں میں داخل ہونا اور بُری روحوں کا بُرے جسموں میں۔ [2] الملل والنحل ۲۴۹/۱۔

پر بیٹھ کر انڈے دیتا ہے پھر اس کے بچے نکلتے ہیں ثم اذا تم نوعہ لف اخہ (؟) تو وہ پرندہ اپنی چونچ اور پنجوں سے اپنا جسم کھجلاتا ہے جس کے زیر اثر اس سے آگ کے شعلے نکلنے لگتے ہیں اور ان شعلوں میں وہ جل مرتا ہے، اس کے جسم سے تیل (چربی) بہکر درخت کی جڑ کے ایک گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے، جب ایک سال گذر جاتا ہے اور اس پرندے کے ظاہر ہونے کا وقت آتا ہے تو درخت کی جڑ میں مجتمع تیل سے اس جیسا ایک پرندہ پیدا ہوتا ہے اور اڑ کر درخت پر بیٹھ جاتا ہے (اور انڈے بچے دیتا ہے) اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ تناسخ کے قائل برہمن کہتے ہیں کہ دنیا اور دنیا کے باشندے اس پرندہ کی طرح ہیں جس پر ہمیشہ اکوار وادوار آتے رہتے ہیں[1] (یعنی فنا اور بقا، موت اور زیست کا کبھی ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے)۔

ابن خرداذبہ[2] (نویں صدی کا ربع ثانی):

ہندوؤں کے بیالیس فرقے ہیں، ان میں سے کچھ خدا اور رسولوں کے قائل ہیں، کچھ صرف رسولوں کے منکر ہیں اور کچھ خدا اور رسولوں دونوں کے۔

مطہر بن طاہر مقدسی[3] (دسویں صدی کا ربع ثالث):

باخبر لوگوں کا بیان ہے کہ ہندوستان میں نو سو مختلف مذہب پائے جاتے ہیں؛ ان میں سے ننیانوے (کے حالات وکوائف) معلوم ہیں اور یہ بیالیس مذہبوں میں داخل ہیں اور ان بیالیس کا دارومدار چار مذہبوں پر ہے اور یہ چار دو بڑے مذہبوں سے ماخوذ ہیں، ایک برہمنی اور دوسرا بدھ مذہب۔ بدھ مذہب رسالت کا منکر ہے۔ برہمنوں کے تین فرقے ہیں، ایک فرقہ توحید اور عذاب وثواب کا قائل ہے لیکن رسالت کی ضرورت تسلیم نہیں کرتا، دوسرا آواگون (تناسخ) کے اصول پر جزا و سزا کا قائل ہے لیکن توحید و رسالت کا انکار کرتا ہے۔

---

[1] الملل والنحل ۴/۲۴۹

[2] المسالک والممالک ص ۷۱

[3] البدء والتاریخ ۴/۱۰-۹

ادریسی[1] (بارہویں صدی کا ربع ثالث):

ہندوستان کے اکثر باشندوں کے بیالیس مذہب ہیں، بعض لوگ خدا اور رسولوں کے قائل ہیں، بعض خدا کے قائل ہیں لیکن رسولوں کے منکر، بعض دونوں کو تسلیم نہیں کرتے، بعض مورتیوں کی پوجا کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں، بعض پتھروں کے ڈھیر کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ بناتے ہیں اور اس پر تیل اور چربی ڈال کر سجدہ کرتے ہیں، بعض آگ کی عبادت کرتے ہیں اور خود کو آگ میں جلا ڈالتے ہیں، بعض سورج کے پرستار ہیں اور اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ سورج نے عالم کو پیدا کیا اور وہی اس کا نظام چلا رہا ہے، کوئی فرقہ درخت کی پوجا کرتا ہے کوئی ناگوں کی، ان کے گرد باڑے بنا دیتا ہے اور ان کو کھلاتا پلاتا ہے اور ان کی پرستش کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے، ایسے لوگ بھی ہیں جو عبادت کی زحمت ہی نہیں کرتے اور ہر مذہب کے منکر ہیں۔

ابن الندیم[2] (دسویں صدی کا ربع آخر):

بدھ

بدھ کے بارے میں ہندوؤں کی مختلف رائیں ہیں، ان کی ایک جماعت کہتی ہے کہ بدھ خدا کی مورتی ہے، دوسری جماعت کا خیال ہے کہ وہ رسول کی مورتی ہے جسے خدا نے ان کے پاس بھیجا ہے، رسول کے بارے میں بھی اختلاف ہے، ایک جماعت کہتی ہے کہ رسول خدا کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے، دوسری جماعت کی رائے ہے کہ وہ ۔۔۔ انسان ہے، تیسری کا خیال ہے کہ وہ راکشس (عفریت) ہے، ایک جماعت کا عقیدہ ہے کہ بدھ بوداسف حکیم (مہاتما بدھ) کی مورتی ہے جو (لوگوں کی رہنمائی کے لئے) خدا کے پاس سے آیا تھا۔ ہر جماعت بدھ کی پوجا اور تعظیم الگ

---

[1] نزہۃ المشتاق قلمی ۱/۶۵ [2] فہرست ص ۴۸۷

الگ طریقوں سے کرتی ہے، ایک باخبر ثقہ شخص کا بیان ہے کہ ہر ہندو فرقہ کی ایک مورتی ہوتی ہے جس کی وہ پوجا اور تعظیم کرتا ہے نیز یہ کہ بت (بُدّ) اسم جنس ہے اور مورتیاں اس کی انواع، سب سے بڑا بت انسانی شکل کا ہے اور ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، اس کے چہرہ پر کوئی بال نہیں ہے، مغموس الذقن فی الفقم (؟) اس کا جسم ننگا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مسکرا رہا ہو، ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے میں اس طرح ڈالے ہوئے ہے کہ ان سے بتیس ۳۲ کے ہندسے بنتے ہیں، اسی ثقہ راوی کا بیان ہے کہ ہر گھر میں بدھ کی ایک مورتی موجود رہتی ہے اور گھر والے کی حسب حیثیت جواہرات سے مرصع سونے یا چاندی کی یا پیتل یا لکڑی کی ہوتی ہے، مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق جس طرف سے بھی بدھ کی مورتی پر نظر پڑ جائے ہندو اس کی تعظیم کرتے ہیں لیکن زیادہ تر وہ مورتی کا رخ مغرب کی طرف رکھتے ہیں تاکہ وہ مشرق رو ہو کر اس کے سامنے آئیں۔ راوی کہتا ہے کہ بدھ کے چار چہرے ہوتے ہیں جن کو ایسی ناپ تول اور مہارت سے بنایا جاتا ہے کہ ہر طرف سے اس کا پورا چہرہ دیکھنے والے کے سامنے آجاتا ہے......

میں نے ایک خراسانی کی کتاب میں جو قدیم اور اسلامی دور کے خراسان کے حالات پر مشتمل ہے پڑھا کہ فرقہ شُمنیہ کا پیغمبر بوداسف (مہاتما بدھ) تھا اور ماوراء النہر کے اکثر باشندے اسلام سے پہلے اور قدیم الایام میں اسی مذہب کے پیرو تھے، شُمنیہ، شمنی کی طرف نسبت ہے، یہ لوگ ہر ملک اور ہر مذہب کے لوگوں سے زیادہ سخی اور فیاض منش واقع ہوئے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ان کے نبی بوداسف (مہاتما بدھ) نے تعلیم دی ہے کہ انسان کے لئے جائز نہیں کہ کسی معاملہ میں بھی نہیں کہے اور اس کے لئے مناسب نہیں کہ اس عقیدہ کا حامل ہونے کے بعد اس پر عمل پیرا نہ ہو، چنانچہ اس فرقہ کے لوگ قول اور فعل دونوں میں منفی روش اختیار نہیں کرتے، ان کا عقیدہ ہے کہ نہیں کہنا شیطانی فعل ہے اور شیطان کی مخالفت ان کا دھرم ہے[1]۔

---

[1] فہرست ص ۴۸۴۔

فرقے

مُطہر بن طاہر مقدسی[1] (دسویں صدی کا ربع ثالث):

باسُویہ (ناشدیہ)

موحّد برہمنوں کی رائے ہے کہ خدا نے ان کے پاس ایک فرشتہ انسان کی شکل میں پیغمبر بنا کر بھیجا جس کا نام باسو (ناشد) تھا، اس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی، دوسرے میں زرہ بکتر، تیسرے میں چکر (شکرتہ)، چوتھے میں پھندے دار رسی، وہ عنقار پر سوار تھا، اس کے بارہ سر تھے۔ ایک انسانی، دوسرا گھوڑے کا، تیسرا شیر کا، چوتھا بیل کا، پانچواں گدھ کا، چھٹا ہاتھی کا، ساتواں سور کا، باقی پانچ سروں کی بھی انھوں نے تصریح کی ہے، برہمنوں کا یہ موحد فرقہ کہتا ہے کہ باسو (ناشد) نے ہمیں آگ کی تعظیم کا حکم دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے آگ کو بلندی، شان اور تابنا کی عطا کر کے معزز و موقر بنایا ہے اور اس کے ساتھ بہت سے دنیوی فائدے وابستہ کر دئے ہیں۔ باسو (ناشد) نے قتل اور شراب خوری سے روکا ہے لیکن زنا مباح کر دی ہے، اس نے اپنی اور گائے کی مورتی پوجنے کا حکم دیا ہے۔ گنگا پار کرنے کی ممانعت کر دی ہے، جو برہمن ایسا کرے گا اس کا دھرم جاتا رہے گا۔

شہرستانی[2] (بارہویں صدی کا ربع ثانی):

باسویہ فرقہ کا دعویٰ ہے کہ ان کا رسول ایک روحانی فرشتہ تھا جو انسان کی شکل میں آسمان سے اترا تھا، اُس نے ان کو حکم دیا کہ آگ کی تعظیم کریں اور اس کا تقرب عطر، خوشبو اور تیل جلا کر نیز جانور قربان کر کے حاصل کریں۔ رسول نے قتل اور ذبح کرنے کی ممانعت کر دی ہے سوائے اس جانور کے جو آگ پر قربان کیا جائے، اس نے ان کے لئے یہ ضابطہ بنایا کہ گلے

---

[1] البدء والتاریخ ۴/۳-۱۲۔ [2] الملل والنحل ۱/۴۵۰۔

میں ایک دھاگا (جنیو) ڈالیں جو سیدھے کندھے سے ہو کر الٹے کندھے کے نیچے سے گذرے، رسول نے جھوٹ بولنے، شراب پینے اور غیر مذہب والوں کا کھانا اور ذبیحہ کھانے سے روکا ہے، نسل انسانی کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے زنا کی اجازت دیدی ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اس کی مورتی کی پوجا کی جائے اور دن میں تین بار اس کا طواف کیا جائے، طواف کے دوران باجے بجائیں، ناچیں اور خوشبودار چیزیں سلگائیں۔ رسول نے گائے کی تعظیم کی تاکید کی ہے نیز اس بات کی کہ جب وہ نظر آئے تو اس کو سجدہ کیا جائے ویفزعوا فی التوبۃ الی التمسیح بھا) اس نے گنگا پار کرنے کی ممانعت کر دی ہے۔

مہادیویہ (بہابوذیہ)

مطہر بن طاہر مقدسی[1]

موحد برہمنوں کا ایک فرقہ مہادیویہ (بہابوذیہ) کہلاتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ ان کا پیغمبر ایک فرشتہ تھا جسے مہادیو (بہابوذ) کہتے ہیں، وہ انسانی شکل میں اترا تھا اور بیل پر سوار تھا، اس کے سر پر مردوں کی ہڈیوں سے بنا ہوا ایک تاج تھا اور (انسانی) کھوپڑیوں کی ایک مالا پہنے ہوئے تھا، اس کے ایک ہاتھ میں کھوپڑی کا بادیہ اور دوسرے میں سہ دھارا چھوٹا نیزہ تھا، سر پر مور کی دُم کی چھتری تھی، اس نے خدا کی عبادت کا حکم دیا نیز اس بات کا کہ اس کی مورتی کی پوجا کریں تاکہ اس کے ذریعہ اُن کی دعائیں اور التجائیں خدا کے دربار تک پہنچ سکیں، اس کا حکم ہے کہ چونکہ سب چیزیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں اس لئے کسی چیز سے گھن نہیں کرنی چاہیئے۔

شہرستانی[2]

اس فرقہ کا دعوی ہے کہ ان کا رسول ایک روحانی فرشتہ تھا بہ شکل انسان جس کا نام

---

[1] البدء والتاریخ ۴/۱۴-۱۴-۱۳ ۔ [2] ۱/۱-۵۰-۲۴۸ ۔ الملل میں فرقہ کا نام باہودیہ قلمبند ہوا ہے۔

مہادیو (ماہودیہ) ہے، وہ ایک بیل پر سوار ہو کر آسمان سے اترا تھا، اس کے سر پر کھوپڑیوں کا تاج تھا، گلے میں کھوپڑیوں کی ایک مالا، ایک ہاتھ میں انسانی کھوپڑی کا بادیہ اور دوسرے میں سہ دھارا چھوٹا نیزا۔ اس نے خدا نیز اپنی مورتی کی پوجا کا حکم دیا، اس کی تاکید ہے کہ چونکہ ساری اشیاء کا بنانے والا خدا ہے اس لئے کسی سے نفرت یا گھن نہیں کرنی چاہیئے، اس کا حکم ہے کہ انسانی ہڈیوں کی مالائیں اور تاج بنا کر پہنیں اور جسموں اور سروں پر راکھ ملیں، اس نے قربانی سے روکا ہے اور روپیہ جمع کرنے کی ممانعت کر دی ہے اور ترکِ دنیا کا حکم دیا ہے۔ اس فرقہ کے لوگ خود کچھ نہیں کماتے بلکہ خیر خیرات پر گذارہ کرتے ہیں۔

مطہر بن طاہر مقدسی[۱]

کپالیہ (کابالیہ)

موحد برہمنوں کا ایک فرقہ کپالیہ (کابالیہ) ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ ہمارا پیغمبر شو (شب) نامی ایک فرشتہ ہے، وہ انسانی شکل میں اترا تھا، اُس کے سر پر اُونی ٹوپی تھی جس پر انسانی کھوپڑیاں ٹکی ہوئی تھیں۔ شو (شب) نے ان کو حکم دیا کہ انسانی آلۂ تناسل کی شبیہ بنا کر اس کی تعظیم و عبادت کریں کیونکہ اسی پر نسل انسانی کی بقا کا دار و مدار ہے۔

شہرستانی[۲]

اس فرقہ کا دعوی ہے کہ ان کا رسول ایک روحانی فرشتہ ہے جس کا نام شو (شب) ہے، وہ انسانی شکل میں آیا تھا۔ اس کے سارے جسم پر راکھ ملی ہوئی تھی، اس کے سر پر لال اون کی تین بالشت اونچی ٹوپی تھی جس پر انسانی کھوپڑیاں ٹکی ہوئی تھیں، وہ (کھوپڑیوں کی) ایک بہت بڑی مالا پہنے تھا اور اُنہی کا پٹکہ باندھے تھا اور انہی کے کنگن اور پازیب اس کے ہاتھوں اور پیروں میں

---

[۱] البدء والتاریخ ۴/۱۴ ۔ [۲] الملل والنحل ۱/۲۵۱۔ اس کتاب میں فرقہ کا نام کابلیہ مکتوب ہوا ہے۔

تھے، اس کا جسم ننگا تھا، اس کا اپنے پیروؤں کو حکم تھا کہ وہ اسی طرح کی ہیئت بنائیں۔ شونے ان کے لئے مذہبی قاعدے ضابطے بھی مقرر کئے۔

مطہر بن طاہر مقدسیؒ

دامانیہ و داونیہ (؟)

موحد برہمنوں کے دو فرقوں کا نام دامانیہ اور داونیہ ہے، یہ بھی توحید کے ساتھ رسالت کے قائل ہیں۔

رشیہ (رشتیہ)

برہمنوں کے ان فرقوں میں سے جو وجود خالق کے قائل ہیں لیکن رسولوں کی بعثت تسلیم نہیں کرتے فرقۂ رشیہ (رشتیہ) ہے، یہ لوگ عرصہ تک فکری ریاضت کر کے اپنے ظاہری حواس بیکار کر لیتے ہیں، ان کی رائے ہے کہ فکر کو محسوسات سے الگ تھلگ رکھنے سے فرشتوں کی تجلی ہونے لگتی ہے، فرشتے ان میں روحانی طہارت و لطافت پیدا کر دیتے ہیں اور ان کو فائدے پہنچاتے ہیں، رشی نہ تو دودھ پیتے ہیں نہ گوشت کھاتے ہیں اور نہ کوئی ایسی چیز جو آگ پر پکائی جائے، ان کی غذا صرف سبزی اور پھل ہے، وہ عمر کا بیشتر حصہ آنکھیں بند کئے فکری ریاضت میں گذار دیتے ہیں، ان کا دعوی ہے کہ فکر کے ذریعے وہ جو چاہیں کرا سکتے ہیں، مثلاً بارش کرانے، ہوا چلانے، قتل کرنے، پرندوں کو زمین پر اتارنے اور دعا قبول کرانے پر قادر ہیں۔

مُصَفّدہ

وجود خالق کے قائل لیکن رسولوں کی بعثت کے منکر برہمن فرقوں میں سے ایک فرقہ مُصَفّدہ

ؒ البدء والتاریخ ۴/ ۱۵۔ ۱۴۔

ہے، یہ لوگ لوہے کی زنجیر سے کمر تا پشت اپنا جسم جکڑ لیتے ہیں تاکہ کثرت علم اور ریاضت فکر سے ان کا پیٹ نہ پھٹ جائے۔

ابن الندیم[1] (دسویں صدی کا ربع آخر)

ہندوؤں کا ایک فرقہ بکرنتینیہ ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو خود کو زنجیر سے جکڑ لیتے ہیں، یہ لوگ سر اور داڑھی منڈاتے ہیں اور ستر کے علاوہ سارا جسم ننگا رکھتے ہیں، وہ کسی ایسے شخص سے نہ تو ہم کلام ہوتے ہیں نہ اس کو تعلیم دیتے ہیں جو ان کے مذہب میں داخل نہ ہو۔ جو شخص ان کا مذہب قبول کر لیتا ہے اس کو خیر خیرات کی تاکید کرتے ہیں تاکہ اس میں انکسار کی صفت پیدا ہو، ان کے مذہب میں داخل ہونے والے کو اسی وقت زنجیر سے جسم جکڑنے کی اجازت ملتی ہے جب فکری ریاضت میں اونچا درجہ حاصل کر لے۔ زنجیر کمر سے لے کر سینہ تک جکڑی جاتی ہے تاکہ علم کی زیادتی اور غلبۂ فکر سے پیٹ نہ پھٹ جائے۔

شہرستانی[2]

بکرنتینیہ سے وہ ہندو مراد ہیں جو لوہے سے اپنا جسم جکڑ لیتے ہیں، سر اور داڑھی منڈانا، ستر چھوڑ کر سارا جسم کھلا رکھنا اور کمر سے سینہ تک زنجیر جکڑ لینا ان کا شعار ہے، یہ اس لئے تاکہ کثرت علم اور شدت وہم اور غلبہ فکر سے پیٹ نہ پھٹ جائے۔۔ شاید ان کو لوہے میں کوئی ایسی خاصیت نظر آئی ہو وہم و فکر سے ہم آہنگ تھی ورنہ لوہا انشقاق بطن کیسے روک سکتا ہے اور کثرت علم سے پیٹ پھٹنے کا کیا تعلق ہے۔

مطہر بن طاہر مقدسی[3]

مہاکالیہ

وجود خالق کے قائل لیکن رسولوں کی بعثت کے منکر برہمن فرقوں میں ایک فرقہ مہاکالیہ ہے،

---

[1] فہرست ص ۴۸۹ [2] الملل والنحل ۴۴۹/۱ [3] البدء والتاریخ ۱۵/۴

مہاکال ایک بت کا نام ہے جس کی پشت پر ہاتھی کی کھال ہے اور اس سے خون ٹپکتا ہے، اس کے دونوں کان چھدے ہوئے ہیں اور اس کے سر پر (انسانی) کھوپڑیوں کا ایک تاج رکھا ہے۔ ہندو اس کی یاترا کو آتے ہیں اور اس سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ مہاکال ان کی دعائیں اور منتیں پوری کر دیتا ہے۔

ابن الندیم[1]

اس فرقہ کی ایک مورتی ہے جسے مہاکال کہتے ہیں، اس کے چار ہاتھ ہیں، اس کا رنگ آسمانی ہے، سر کے بال لمبے اور گھنے ہیں، دانت نکالے ہوئے ہے، اس کا پیٹ کھلا ہوا ہے، پیٹھ پر ہاتھی کی کھال ہے اور اس سے خون ٹپک رہا ہے، اپنے سامنے ہاتھی کے ہاتھوں کی کھال کی گانٹھ لگائے ہوئے ہے (قد عقد بجلد یدی الفیل بین یدیہ)، اس کے ایک ہاتھ میں منہ کھولے ہوئے ایک بڑا سانپ ہے اور دوسرے ہاتھ میں ڈنڈا ہے، تیسرے میں انسانی سر، چوتھا اوپر اٹھا ہوا ہے۔ اس کے کانوں میں دو سانپ بالیوں کی طرح پڑے ہوئے ہیں، جسم پر دو بڑے سانپ لپٹے ہوئے ہیں، سر پر انسانی کھوپڑیوں کا ایک تاج ہے اور کھوپڑیوں ہی کی مالا گلے میں ہے۔ اس فرقہ کے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایک راکشس (شیطان) ہے بڑا عظیم الشان بھلی بری دونوں صفات کا حامل، فائدہ اور نقصان پہنچانے پر قادر اس لئے اس کی عبادت کرنی چاہئے، مشکلات و مصائب میں وہ اس سے رجوع کرتے ہیں۔

شہرستانی[2]۔

ہندوؤں کا ایک بت ہے جسے مہاکال کہتے ہیں، اس کے چار ہاتھ ہیں، گھنے لمبے بال، اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سانپ ہے جس کا منہ کھلا ہوا ہے، دوسرے ہاتھ میں ڈنڈا، تیسرے میں انسانی سر، چوتھا اوپر اٹھا ہوا، کانوں میں بالیوں کی طرح دو سانپ پڑے ہیں اور جسم پر دو

---

[1] فہرست ص ۴۸۸ [2] الملل والنحل ۱/۴۵۴

اور بڑے سانپ لپٹے ہوئے ہیں، سر پہ کھوپڑیوں کا تاج اور گلے میں ان کی مالا ہے، ان کا دعوی ہے کہ یہ ایک راکشس (عفریت) ہے جو اپنی عظمت اور اچھے برے صفات کی بدولت مثلاً عطا کرنا، باز رکھنا نقصان اور فائدہ پہنچانا۔ عبادت کا مستحق ہے۔ ضرورت کے وقت ہندو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہندوستان میں مہاکال کے بڑے بڑے بت خانے ہیں، اس کے معتقد ہر دن تین بار آ کر اس کے سجدے اور طواف کرتے ہیں، ہندوستان میں اُجین (اختر؟) نامی ایک شہر ہے جہاں مہاکال کی ایک بڑی مورتی پائی جاتی ہے۔ ہندو ہر جگہ سے یہاں آتے ہیں اور مورتی کو سجدے کرتے ہیں اور اپنی دنیوی مرادیں مانگتے ہیں، کوئی کہتا ہے فلاں لڑکی سے میری شادی کرادو، کوئی کہتا ہے فلاں چیز مجھے دلوادو۔ بعض یاتری عرصہ تک شب و روز مہاکال کے مندر میں قیام کرتے ہیں اور قیام کے دوران بھوکے رہتے ہیں، مہاکال کے سامنے گڑگڑاتے ہیں اور منتیں مانگتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی دعا قبول ہوجاتی ہے

تہکنیہ (؟)

مطہر بن طاہر مقدسی[1]

وجود خالق کے قائل برہمنوں کا ایک فرقہ تہکنیہ ہے، ان کی ایک مورتی ہے عورت کی ہم شکل، کہا جاتا ہے کہ اس کے ہزار ہاتھ ہیں اور ہر ہاتھ میں کسی نوع کا ہتھیار ہے، جب سورج برج میزان میں آتا ہے تو اس فرقہ کے لوگ مورتی کے پاس ایک بڑی تقریب مناتے ہیں، اس پر بھینسیں، اونٹ، بکریاں حتیٰ کہ غلام اور باندیاں بلکہ آزاد لوگ تک قربان کر دئے جاتے ہیں، اسی وجہ سے تقریب کے ایام میں بے یار و مددگار لوگ اس ڈر سے چھپے رہتے ہیں کہ کہیں مورتی ان کے قتل کا حکم نہ دے دے۔

---

[1] البدء و التاریخ ۴/۱۵

شہرستانی

اس فرقہ کے لوگ عورت کی ہم شکل ایک مورتی بناتے ہیں جس کے سر پر تاج ہوتا ہے، اس کے بہت سے ہاتھ ہوتے ہیں، ہر سال جب دن رات برابر ہوجاتے ہیں اور سورج برج میزان میں داخل ہوتا ہے تو یہ لوگ اس مورتی کے سامنے ایک بڑا باڑہ بناتے ہیں اور مورتی پر بکریوں اور دوسرے جانوروں کی قربانی چڑھاتے ہیں، جانوروں کو ذبح نہیں کیا جاتا بلکہ تلواروں سے ان کی گردن کاٹ دی جاتی ہے اور دھوکہ سے لوگوں کو پکڑ کر بھی قربان کر دیتے ہیں۔ ہندوستان کے بیشتر ہندوؤں کی نظر میں یہ فرقہ اپنی اس حرکت کے باعث مطعون ہے۔

جَل بھکتیہ (جلہکیہ)

مطہر بن طاہر مقدسی[2]

یہ لوگ پانی کی پوجا کرتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ پانی کے ساتھ ایک فرشتہ رہتا ہے نیز یہ کہ پانی پر ہر قسم کے نشوونما اور زندگی کا دارومدار ہے، اسی کے ذریعہ زراعت ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ گندگی سے پاکی حاصل کی جاتی ہے۔

شہرستانی[3]

جَل بھکتیہ (جلہکیہ) سے مراد پانی کے پجاری ہیں، اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ پانی ایک فرشتہ ہے جس کے ساتھ فرشتوں کی ایک جماعت رہتی ہے نیز یہ کہ ہر چیز کی بنیاد پانی پر ہے، ہر شے اسی سے وجود میں آتی ہے، ہر چیز کی نشوونما اور بقا اسی پر منحصر ہے، اسی کے ذریعہ پاکی حاصل کی جاتی ہے اور اسی پر زراعت کا دارومدار ہے۔ دنیا کا کوئی کام بغیر پانی کے نہیں چلتا۔ اس فرقہ کا پیرو جب

---

[1] الملل والنحل ۱/۴۵۴، اس کتاب میں فرقہ کا نام دکھینیہ مکتوب ہے۔

[2] البدء والتاریخ ۴/۱۵ [3] الملل والنحل ۱/۴۵۴

پانی کی عبادت کرنا چاہتا ہے تو ستر۔۔۔ چھوڑ کر سارے جسم کے کپڑے اتار دیتا ہے اور پانی میں داخل ہوجاتا ہے۔ جب پانی کمر تک آجاتا ہے تو ایک یا دو لمحے یا زیادہ پانی میں ٹھہرتا ہے، پھولوں کی جتنی پتیاں اس کو مل جاتی ہیں ساتھ لے لیتا ہے، ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتا ہے اور تھوڑا تھوڑا کر کے ان کو پانی میں ڈالتا ہے اور اس کی حمد و ثنا کرتا ہے اور منتر پڑھتا ہے، لوٹتے وقت پانی کو ہاتھ سے ہلاتا ہے پھر چلو میں لے کر سر، منہ اور باقی جسم پر چھڑکتا ہے اس کے بعد پانی کو سجدہ کرتا ہے اور باہر نکل آتا ہے۔

اگنی ہوتریہ (اکنہوطریۃ)

مطہر بن طاہر مقدسی[1]

برہمنوں کا یہ موحد لیکن منکر بعثت فرقہ آگ کی جو سب سے بڑا عنصر ہے پرستش کرتا ہے، یہ لوگ مردوں کو اس ڈر سے نہیں جلاتے کہ آگ ناپاک ہوجائے گی۔

شہرستانی[2]

اگنی ہوتریہ (اکنواطریہ) سے آگ کے پجاری مراد ہیں، اس فرقہ کا دعوی ہے کہ آگ سب سے بڑا، سب سے مفید[3]، سب سے بلند مرتبہ، شریف ترین اور لطیف ترین عنصر ہے اور ہر عنصر کی نسبت انسان کو اس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا میں آگ ہی روشنی کا سرچشمہ ہے، زندگی، نشو و نما اور اشیا کی ترکیب آگ ہی کے میل سے ہوتی ہے، آگ کی پرستش کا طریقہ یہ ہے کہ لوگ زمین میں مربع گڑھے کھودتے ہیں اور ان میں آگ جلاتے ہیں پھر ہر قسم کے کھانے پینے کی عمدہ چیزیں، بڑھیا کپڑا، مہکتی خوشبوئیں اور قیمتی پتھر آگ میں اس کی خوشنودی اور برکت حاصل کرنے کے لئے ڈالتے ہیں۔ یہ فرقہ ہندو زاہدوں کی ایک دوسری جماعت کے برخلاف جسم کو آگ

---

[1] البدء والتاریخ ۴/۱۶ [2] الملل والنحل ۱/۵۶، ونہایت الارب نُویری ۱۰۳/۱

[3] متن میں اوسعہا حیزا بالزای ہے، ہماری رائے میں حیزا خیرا کی تصحیف ہے۔

میں جلانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہندوؤں کے اکثر راجہ اور اکابر بھی آگ کے اعلیٰ جوہر اور شریف عنصر کے باعث اس کی بے حد تعظیم کرتے ہیں اور ساری موجودات پر اس کو فوقیت دیتے ہیں۔

اس فرقہ میں زاہدوں اور عابدوں کا ایک طبقہ ہے جو روزہ رکھ کر آگ کے گرد بیٹھتا ہے، یہ لوگ اپنی ناک بند رکھتے ہیں تاکہ کسی مجرم یا گنہگار کی سانس ان کی ناک میں نہ چلی جائے۔ ان کا شعار ہے اچھے کردار اور عمدہ سیرت کی تلقین کرنا اور نازیبا کاموں سے روکنا جیسے جھوٹ، حسد، کینہ، جھگڑا، ظلم، لالچ اور غرور۔ جب انسان ان برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے تو اس کو آگ کی قربت حاصل ہو جاتی ہے۔

برگد بھکتیہ (برکسہیکیتہ)

اس فرقہ کے لوگ ایک مورتی لے کر اس کی پوجا کرتے ہیں اور اس پر نذرانے چڑھاتے ہیں۔ وہ ایک بڑا جھاڑ دار، بہت خوش نما اور خوب لمبا درخت منتخب کرتے ہیں جیساکہ پہاڑوں میں ہوتا ہے اور اس کی جائے وقوع کو اپنی عبادت گاہ بناتے ہیں، وہ مورتی کو اس درخت کے پاس لاتے ہیں اور درخت کے تنے کو اتنا کھوکھلا کرتے ہیں کہ مورتی اس میں فٹ ہو جاتی ہے پھر وہ اس درخت کے سجدے اور طواف کرتے ہیں[1]۔

بھادونیہ (؟)

ابن الندیم[2]

ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے جو لمبے لمبے بال رکھتا ہے اور بالوں کی لٹیں بنا کر منہ پر ڈال لیتا ہے، ان لوگوں کے سر کے چاروں طرف بال پڑے ہوتے ہیں، یہ شراب نہیں پیتے، ان کا ایک مقام ...

---

[1] الملل والنحل ۱/ ۴۵۴ [2] فہرست ص ۴۹۰

پہاڑ ہے جس کا نام جورعن (؟) ہے، یہ لوگ اس پہاڑ کی یاترا کرتے ہیں اور جب یاترا سے واپس آتے ہیں تو (راستہ میں واقع) بستیوں میں داخل نہیں ہوتے اور اگر کوئی عورت نظر آجاتی ہے تو اس سے دور بھاگ جاتے ہیں، اس پہاڑ پر ایک بڑا ثبت خانہ ہے جس میں ایک مورتی رکھی ہے

شہرستانی[1]

اس فرقہ کے لوگ کہتے ہیں کہ بھادون ایک بڑا فرشتہ تھا جو ایک لمبے چوڑے انسان کی شکل میں آیا تھا، اس کے دو بھائی تھے جنھوں نے اس کو قتل کر دیا اور اس کی کھال سے زمین بنائی، ہڈیوں سے پہاڑ اور خون سے سمندر، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ محض رمزیہ تعبیر ہے ورنہ کوئی انسان اتنا بڑا کب ہوتا ہے (کہ اس کے جسم سے زمین اور پہاڑ وغیرہ بن سکیں) بھادون ایک جانور پر سوار ہے، اس کے سر پر خوب بال ہیں جو اس نے منہ پر ڈال لئے ہیں، اس نے بالوں کو برابر حصوں میں بانٹ کر سر کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ڈال لیا ہے۔ اس نے اپنے متبعین کو بھی اسی طرح بالوں سے منہ ڈھکنے کا حکم دیا ہے، اس نے شراب سے اجتناب کی تاکید کی ہے، اس کا حکم ہے کہ اگر کسی جگہ غیر عورت نظر آجائے تو وہاں سے بھاگ جاؤ، اس کا حکم ہے کہ جورعن (؟) پہاڑ کی یاترا کریں، اس پہاڑ پر ایک بڑا مندر ہے جس میں بھادون کی مورتی رکھی ہے۔ اس مندر کے پروہت ہیں جن کے پاس اس کی کنجی رہتی ہے، انھی کی اجازت سے یاتری اندر داخل ہوتے ہیں، یہ پروہت جب دروازہ کھولتے ہیں تو اپنا منہ بند کر لیتے ہیں تاکہ ان کی سانس مورتی تک نہ جانے پائے۔ یاتری مورتی پر جانور قربان کرتے ہیں اور نذرانے چڑھاتے ہیں اور جب یاترا کر کے لوٹتے ہیں تو راستہ میں واقع بستیوں میں نہیں جاتے ولم ینظروا الی محرم (؟) اور کسی کو اپنے قول یا فعل سے اذیت نہیں پہنچاتے۔

---

[1] الملل والنحل ۱/۲۵۱۔

ابن الندیمؒ.

چندر بھکتیہ (جندر یہکنیہ)

یہ لوگ چاند کی پوجا کرتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ چاند ایک فرشتہ ہے جو تعظیم و عبادت کا مستحق ہے، انھوں نے چاند کی ایک مورتی بنائی ہے جو ایک گاڑی پر سوار ہے جسے چار بطخیں کھینچ رہی ہیں، مورتی کے ہاتھ میں ایک قیمتی پتھر ہے جسے چندر گیت (جندر کیت) کہتے ہیں، یہ لوگ چاند کی مورتی کو سجدہ کرتے ہیں اور اسے پوجتے ہیں۔ ہر مہینہ کے پہلے پندرہ دن روزے رکھتے ہیں اور جب تک چاند طلوع نہیں ہوتا افطار نہیں کرتے، افطار کے بعد مورتی کے پاس کھانا پانی اور دودھ لے کر جاتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں، پھر چاند کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کے سامنے دعائیں مانگتے ہیں اور اس کی مورتی کے سامنے رقص و سرود کی محفل منعقد کرتے ہیں۔ جب مہینہ ختم ہو جاتا ہے اور نیا چاند نکلتا ہے تو وہ چھتوں پر چڑھ کر اسے تکتے ہیں اور خوشبوئیں سلگاتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں اور منتیں کرتے ہیں پھر چھتوں سے اتر کر کھاتے پیتے اور خوشیاں مناتے ہیں ولم ینظروا إلیہ إلا علی الوجہ الحسنۃ (۹)

آدتؔ بھکتیہ (دینکیتیہ)

یہ لوگ سورج کے پجاری ہیں، انھوں نے سورج کی مورتی بنائی ہے اور اسے ایک گاڑی پر سوار کیا ہے جس میں پہیوں کی جگہ چار گھوڑے لگے ہیں، مورتی کے ہاتھ میں آتشیں رنگ کا ایک

---

[۱] فہرست ص ۹ - ۴۸۸، الملل والنحل ۴۵۲/۱ اور نہایۃ الارب ۵۶/۱ میں بھی فہرست سے ملتا جلتا ذکر موجود ہے۔ الملل میں فرقہ کا نام جندر یکنیہ اور نہایۃ الارب میں حندریکتیہ بالحاء المہملہ قلمبند ہوا ہے۔

[۲] سنسکرت میں آدت سورج کو کہتے ہیں۔

تیمنی پنتھ ہے۔ اس فرقہ کا دعویٰ ہے کہ سورج سب سے بڑا فرشتہ ہے اور اس لائق کہ اس کی عبادت کی جائے اور اسے سجدہ کیا جائے۔ اس لئے وہ اس کی مورتی کو سجدے کرتے ہیں اور سلگتی ہوئی خوشبو لے کر، بانسری اور دوسرے ساز بجاتے ہوئے اس کا طواف کرتے ہیں۔ اس مورتی کے لئے جائدادیں وقف ہیں جن سے آمدنی ہوتی ہے، اس کے پروہت اور منتظم ہیں جو اس کی اور اس کی جائداد کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ دن میں تین بار مورتی کی پوجا کی جاتی ہے۔ پوجا کے دوران مختلف منتر اور اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ مورتی کے پاس بیمار، کوڑھی، جذامی اور دوسرے خبیث اور مزمن امراض والے آتے ہیں، مندر میں قیام کرتے ہیں اور راتیں گذارتے ہیں اور مورتی کو سجدے کرتے ہیں، اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں اور اس سے اپنی صحت کے لئے التجا کرتے ہیں، کھانا پینا ترک کر دیتے ہیں اور مورتی کی خوشنودی کے لئے روزے رکھتے ہیں یہاں تک کہ کوئی خواب میں آکر مریض کو بشارت دیتا ہے کہ تم شفایاب ہوئے اور تمہاری مراد بر آئی۔ مشہور ہے کہ مورتی خواب میں آکر خود مریض سے مخاطب ہوتی ہے اور وہ صحتیاب ہو جاتا ہے۔[۱]

شہرستانی[۲]

اس فرقہ کا دعویٰ ہے کہ سورج ایک فرشتہ ہے باعقل و روح۔ اس سے ستاروں کو نور اور عالم کو روشنی ملتی ہے اور موجودات عالم کی بقا کا اسی پر دارومدار ہے۔ سورج آسمان کا بادشاہ ہے اور اس لائق کہ اس کی تعظیم کی جائے، اس کو سجدے کئے جائیں، اس کے لئے خوشبوئیں سلگائی جائیں اور اس سے دعائیں مانگی جائیں۔ اس فرقہ کا نام آدت بھکتیہ (دنیکیتیہ) ہے یعنی سورج کے پجاری۔ یہ لوگ سورج کی ایک مورتی بناتے ہیں جس کے ہاتھ میں آگ کے ہمرنگ ایک پتھر ہوتا ہے، اس کا ایک خاص مندر ہے جو اس کے نام پر بنایا گیا ہے، مندر کے لئے جائدادیں اور گاؤں وقف ہیں، اس کے پروہت اور منتظم ہیں، زائرین مندر آتے ہیں اور (دن میں) تین بار مورتی کی پوجا کرتے

۱؎ فہرست ص ۴۸۸ ۲؎ ۲۵۲/۱

ہیں۔ بیمار اور روگی بھی آتے ہیں اور مورتی کی خوشنودی کے لئے روزے رکھتے ہیں، پوجا کرتے ہیں اور اپنی صحت کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔

ابن الندیم[۱]

اَلشیہ (اَلشنیہ)

اس فرقہ کے لوگ کھانے پینے سے اجتناب کرتے ہیں۔

گنگا یاتریہ (گنکا یاترہ)

ہندوؤں کا ایک فرقہ گنگا یاتریہ (گنکا یاترہ) کہلاتا ہے، یہ لوگ سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوجائے تو اس کو چاہیئے خواہ دور ہو یا قریب گنگا میں جاکر غسل کرے، ایسا کرنے سے اس کے گناہ دھل جاتے ہیں۔

راجمرتیہ (راحمرسہ)

یہ لوگ راجاؤں کے فدائی ہوتے ہیں اور ان کی مدد ان کا دین ایمان ہے، وہ کہتے ہیں کہ راجاؤں کو خدا نے راج عطا کیا ہے اور ان کی خاطر اگر ہم مارے جائیں تو ہمیں جنت نصیب ہوگی۔

سادھو، فقیر، سنیاسی

سلیمان تاجر[۲] (نویں صدی کا ربع ثانی)

ہندوستان میں ایک فرقہ ہے جسے بیکر جین (بھکشو) کہتے ہیں، یہ لوگ ننگے رہتے ہیں، ان کی

---

[۱] فہرست ص ۴۸۹ - ۹۰ [۲] سلسلۃ التواریخ ۲/۱۲۷

ستر اور جسم لمبے لمبے بالوں سے ڈھکے ہوتے ہیں، ان کے ناخون لمبے ہوتے ہیں کیونکہ ان کو تراشا نہیں جاتا، یہ لوگ ہمیشہ گشت میں رہتے ہیں، ان کے ہر فرد کے گلے میں انسانی کھوپڑی کا ایک بادیہ ڈوری سے لٹکا ہوتا ہے، جب اسے بھوک ستاتی ہے تو وہ کسی ہندو کے دروازہ پر جاکر کھڑا ہو جاتا ہے، گھر والے جلدی جلدی پکے ہوئے چاول لاکر اس کو دیتے ہیں اور اس کے آنے سے خوش ہوتے ہیں۔ بھکشو انسانی سر کے بادیہ میں چاول لے کر کھاتا ہے اور جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ چلا جاتا ہے۔

بزرگ بن شہریار[1] (دسویں صدی کا ربع ثالث):

میں نے ایک گذشتہ باب میں ہندوستان کے عابدوں اور زاہدوں کا کچھ ذکر کیا ہے[2]، ان کے کئی طبقے ہیں جن میں سے ایک کا نام بیکور ہے، ان کی ابتدا لنکا میں ہوئی، یہ لوگ مسلمانوں کو پسند کرتے ہیں اور ان سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں ننگے رہتے ہیں، نہ ان کے پیروں میں جوتی ہوتی ہے نہ تن پر کپڑا، کبھی کوئی بیکور چار انگل لمبا اور اتنا ہی چوڑا کپڑا ایک دھاگے سے کمر پر باندھ کر آگے پیچھے ستر پوشی کر لیتا ہے، جاڑوں میں بیکور کمر سے گھاس کی چٹائیاں لپیٹ لیتے ہیں، بعض بھکشو شہرت کی خاطر مختلف رنگوں کے پیوندوں کی دھوتی پہنتے ہیں اور جلائے ہوئے مردوں کی راکھ سارے جسم پر مل لیتے ہیں، سر منڈا دیتے ہیں اور ڈاڑھی مونچھ کے بال نوچ ڈالتے ہیں، بغلوں اور ناف کے بال نہیں کاٹتے لیکن اکثر اوقات ناخون کاٹ لیتے ہیں، ہر بھکشو کے پاس مردہ انسان کی کھوپڑی ہوتی ہے جس میں عبرت اور اظہار تواضع کے لئے وہ کھاتا پیتا ہے۔

سلیمان تاجر[3]

ہندوستان میں ایسے لوگ (سنیاسی) پائے جاتے ہیں، جو جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتے

---

[1] عجائب الہند ص ۱۵۵ [2] مطبوعہ نسخہ میں یہ ذکر موجود نہیں۔ [3] سلسلۃ التواریخ ۱/۵۱

رہتے ہیں اور انسانوں سے میل جول نہیں رکھتے، وہ اکثر و بیشتر گھاس پات اور جنگلی پھلوں پر گذارہ کرتے ہیں، عورتوں سے الگ رہنے کے لئے پیشاب کی نالی میں لوہے کا ایک حلقہ ڈالے رہتے ہیں، کچھ سنیاسی ننگے رہتے ہیں اور کچھ سورج کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کے جسم پر چیتے کی ذراسی کھال ہوتی ہے، میں نے اس ہیئت میں ایک شخص کو دیکھا پھر سولہ[16] سال بعد میرا اس شخص کے پاس سے گذر ہوا تو میں نے اسے سابقہ حال اور ہیئت میں کھڑا پایا، میں حیران تھا کہ سورج کی تمازت سے اس کی آنکھیں کیوں نہ بہ گئیں۔

دمشقی[1] (چودھویں صدی کا ربع اول):

جوگی (جوکیہ) اور یوگی (یوکیہ)

ہندوؤں کے عبادت گذار اور عالم فرقوں میں ایک جوگی فرقہ ہے، یہ لوگ خارق العادت کام کرتے ہیں، نظر بندی کے کرتب اور وہم و خیال کے طلسمات دکھاتے ہیں، دوسرا فرقہ یوگی کہلاتا ہے، ان کا امتیازی شان ریاضت اور دنیا سے بے تعلق ہے، یہ لوگ اپنے جسم کے بال صاف کر دیتے ہیں اور کبھی تنہا نہیں رہتے بلکہ جہاں ہوتے ہیں دو دو اور جہاں بھی جاتے ہیں دو دو کی ٹولیوں میں، ان کی ایک عادت یہ ہے کہ وہ منی کے موذی فضلہ کو بطور علاج اپنے دوسرے ساتھی کے سُرین میں داخل کر کے سکون حاصل کرتے ہیں؛ ان کے ایک ساتھی کے گلے میں گھنٹی پڑی ہوتی ہے، جب اس کو بھوک لگتی ہے تو وہ شہر کے دروازہ یا بازار یا گلیوں یا مندر کے دوار پر آکر خاص انداز سے گھنٹی بجاتا ہے، یہ آواز سب سے پہلے جو آدمی سن لے وہ فوراً دونوں ہاتھوں میں چاول بھر کر اس کے پاس آجاتا ہے، گھنٹی والا چاول لے کر اپنے ساتھی کے پاس جاتا ہے اور اس کے پاس رکھ دیتا ہے اور خود ہٹ جاتا ہے، ساتھی حسب ضرورت چاول کھا کر اٹھ جاتا ہے تب گھنٹی والا

---

1. نخبۃ الدہر ص ۲-۱۷۱

آتا ہے اور بھوک، کے مطابق چاول کھالیتا ہے اور باقی چھوڑ کر اٹھ جاتا ہے، دینے والا آتا ہے اور بچا ہوا کھانا بطور تبرک، اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے اٹھا لے جاتا ہے۔ برکت کی ہی خاطر ہندو راجاؤں اور اکابر کا کریا کرم یوگی کرتے ہیں اور ان کی راکھ محفوظ کر لیتے ہیں۔ جب حکمران راجہ کی سواری نکلتی ہے تو اس کے ساتھ دو[2] یوگی سونے کی تھالوں میں وہ راکھ لئے ہوئے چلتے ہیں اور جلوس کے لوگ تھوڑی تھوڑی راکھ منھ اور جسم پر ملتے رہتے ہیں، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اے راجہ تیرا بھی یہی انجام ہونے والا ہے، سوچ سمجھ کر زندگی گذار، ظلم سے بچ اور اچھے کام کیا کر۔

ہندو فلسفی

شہرستانی[1]۔

یونانی فلاسفر فیثا غورس کا قلانوس نامی ایک شاگرد تھا جس نے اس سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی، وہ ہندوستان کے کسی شہر میں آیا اور وہاں فیثا غورس کے فلسفہ کی اشاعت شروع کی۔ برجمنن بڑا ذہین، صائب فکر اور نقاد نظر ہندو تھا جسے عالم بالا کے حالات معلوم کرنے سے خاص دلچسپی تھی، اس نے قلانوس سے فلسفہ پڑھا اور اس کے نظریات سے استفادہ کیا، قلانوس کی وفات پر برجمنن سارے ہندو فلسفیوں کا امام ہوگیا۔ اس نے لوگوں کو جسم گھلانے اور روح د فکر کو توانا اور روشن بنانے کی تلقین کی، وہ کہتا تھا کہ جو شخص اپنی روح میں رفعت اور روشنی پیدا کرے گا اور جلد از جلد اس گندی دنیا سے نکلنے کی کوشش کرے گا اور اپنے جسم کو آلودگیوں سے صاف کرے گا اس پر کائنات کے رموز آشکارا ہو جائیں گے، وہ ہر غائب کو دیکھ سکتا ہے، ہر مشکل پر فتح پا سکتا ہے اور مسرور و شاداں جی سکتا ہے، نہ زندگی سے بیزار ہوگا

---

[1] الملل والنحل ۸/۱ - ۴۵۵

نہ تکان محسوس کرے گا۔ برجمنن نے ہندوؤں کو سیدھا راستہ دکھا دیا اور ان کے سامنے دل کو لگتی دلیلیں پیش کیں تو ہندو تہذیب نفس اور تنویر روح کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ برجمنن یہ بھی کہا کرتا تھا: اس دنیا کی لذتوں کو چھوڑ کر ہی تم دوسرے عالم کی کامیابی پا سکتے ہو اور وہاں کی لذتوں سے ہمیشہ کے لیے متمتع ہو سکتے ہو۔ ہندوؤں نے اس کے خیالات و نظریات کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے نظریات ان کے دل و دماغ میں اچھی طرح راسخ ہو گئے۔ جب برجمنن کا انتقال ہو گیا۔ اور اس وقت تک اس کے نظریات ان کے ذہنوں میں یہ خوب مرتسم ہو چکے تھے اور ان کے دلوں میں جلد از جلد عالم بالا پہنچنے کی بیتابی بڑھ چکی تھی، تو ہندوؤں کے دو فرقے ہو گئے، ایک فرقہ کی رائے تھی کہ اس دنیا میں اولاد پیدا کرنے سے زیادہ بڑی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کیونکہ تناسل جسمانی لذت کوشی اور شہوانی نطفہ کا نتیجہ ہوتا ہے اور ہر وہ محرک جو عمدہ کھانے پینے سے پیدا ہو اور شہوت کو جگائے، حیوانی لذت کی خواہش کو اکسائے اور بہیمانہ جذبات میں جوش پیدا کرے اس قابل ہے کہ اس کو دبایا جائے، بنا بریں اس فرقہ کے لوگ اتنا کم کھاتے جو صرف ان کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہوتا اور ان کی ایک جماعت جسے عالم بالا پہنچنے کی عجلت تھی کم کھانا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ اس فرقہ کی ایک دوسری جماعت کا طرز عمل یہ تھا کہ جب ان میں سے کسی کی عمر زیادہ ہو جاتی تو وہ خود کو آگ میں جلا ڈالتا تھا تزکیہ نفس اور تطہیر جسم اور نجات روح کی خاطر؛ ان کی ایک تیسری جماعت دنیوی نعمتیں، عمدہ کھانے اور عمدہ لباس فراہم کرکے ان کو اپنے سامنے رکھتی تاکہ آنکھیں ان کو دیکھیں اور ان کے حیوانی جذبات بھڑکیں اور ان کی طرف لپکیں عین اس وقت یہ لوگ قوت عقلی و تمیز سے کام لیکر اپنے دل کو ان پرکشش چیزوں کی طرف سے ہٹا لیتے، نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کے جسم دبلے ہو جاتے اور نفس حیوانی کمزور پڑ جاتا اور دونوں کا تعلق ایک دوسرے سے منقطع ہو جاتا۔

دوسرے فرقہ کا موقف تھا کہ تناسل، طعام و شراب اور دوسری لذتوں کو اعتدال کے ساتھ اختیار کیا جائے چنانچہ یہ لوگ ایک معتدل و متوازن زندگی بسر کرتے تھے اور شاذ و نادر ہی صحیح

حدود سے تجاوز کرتے تھے۔ دونوں فرقوں کی ایک جماعت نے فیثا غورس کے فلسفیانہ نظریات کا اتباع کرکے اپنی روحوں کو ایسا توانا اور عقل کو ایسا منور کرلیا کہ اپنے دوسرے ہم مسلک ہندوؤں کے دلوں سے اچھے برے خیالات کا ادراک کرنے لگے اور ان کے حالات بتانے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ موخرالذکر کے دلوں میں بھی فکری ریاضت، اور نفس امارہ کو قابو میں رکھنے اور مذکورہ جماعت کی سطح تک پہنچنے کی پر زور خواہش پیدا ہوگئی۔ ان فرقوں کا نظریہ خدا کے بارے میں یہ ہے کہ وہ نور محض ہے لیکن اس نے اپنے اوپر کسی نہ کسی جسم کا پردہ ڈال لیا ہے تاکہ بس وہی دیکھ سکے جو اس کا اہل ہو..... ان کا عقیدہ ہے کہ

اور جس نے اپنے شہوانی جذبات سے جنگ کرکے خود کو دنیوی لذتوں سے بچالیا وہ نجات پالے گا اور جو دنیوی لذتوں میں پھنسا رہے گا وہ دنیا کا قیدی بنا رہے گا۔ شہوانی جذبات سے لڑائی میں کامیابی کے لئے ان برائیوں نیز ان کے محرکات و مسببات سے اجتناب ضروری ہے تجبر (؟)، غرور، تسکین، شہوت اور لالچ۔ جب سکندر[1] ہندوستان کے ان علاقوں[2] میں پہنچا اور وہاں کے ہندوؤں سے جنگ کا ارادہ کیا تو ان دو فرقوں میں سے ایک کا شہر سکندر کے لئے فتح کرنا مشکل ہوگیا، یہ وہ فرقہ تھا جو دنیا میں لذتوں کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے کا قائل تھا، بڑی کوشش کے بعد سکندر اس علاقہ کو فتح کرسکا اور اس فرقہ کے فلاسفہ کی ایک جماعت کو قتل کر ڈالا۔ یونانی حملہ آوروں کو فرقہ کے مقتولین کے زمین پر پڑے ہوئے جسم ایسے نظر آتے جیسے شفاف پانی میں مچھلیوں کے صاف ستھرے لاشے ہوں، یہ دیکھ کر ان کو اپنے کئے پر پشیمانی ہوئی اور انھوں نے فرقہ کے باقی لوگوں کو قتل کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ دوسرے فرقہ نے جو شادی بیاہ اور تناسل کو برا خیال کرتا تھا نیز جسمانی شہوت سے تائب تھا، سکندر کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اس کی فلسفہ دوستی اور علم سے رغبت نیز فلاسفہ اور ارباب دانش کی تعظیم کو سراہا تھا اور اس سے درخواست کی تھی کہ ان سے مناظرہ کے لئے ایک فلسفی بھیجدے، سکندر نے ایک فلسفی بھیج دیا جسے نظریاتی اور عملی فلسفہ میں بحث کرکے انھوں نے ہرا دیا۔ سکندر پر ان کی فلسفیانہ دانش مندی کا ایسا اثر ہوا کہ وہ شاندار عطیئے اور انعامات دیکر ان کا علاقہ چھوڑ کر چلا گیا۔

---

[1] ہندوستان پر سکندر نے ۳۲۵ قبل مسیح حملہ کیا تھا [2] متن کے فی تلک البلاد کا ترجمہ، شہرستانی نے

سراج الدین ابن الملقن

ڈاکٹر حافظ عبد العلیم خاں صاحب لکچرر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں شافعی فقہار کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے جنھوں نے نہ صرف فقہ و حدیث میں قابلِ قدر اضافے کیے بلکہ فن تاریخ و تذکرہ اور دیگر علوم و فنون میں بھی ایسی بیش قیمت تصانیف چھوڑ گئے ہیں جو رہتی دنیا تک ان کی یاد کو تازہ کرتی رہیں گی۔ انھیں میں ایک مشہور نقیہ، محدث اور مؤرخ سراج الدین ابن الملقن (م ۸۰۴ھ) بھی گزرے ہیں پیش نظر مقالے میں ان کی حیات اور تصانیف کا مختصر جائزہ لیا جائے گا۔ ابن الملقن اپنے زمانہ کے مشہور و معروف فقیہ، محدث اور کثرتِ تصانیف میں یگانۂ روزگار تھے اور ان کی تصانیف کی تعداد تین سو تک بتلائی جاتی ہے

تذکرہ نگاروں اور مؤرخین نے مصنف کا نام عمر، کنیت ابوحفص اور لقب سراج الدین لکھا ہے۔ عام طور پر "ابن الملقن" کے نام سے مشہور تھے اور بلادِ یمن میں "ابن النحوی" کے نام سے پکارے جاتے تھے[1]۔ ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

عمر بن علی بن احمد بن محمد بن عبد اللہ الأنصاری، الوادی آشی القاهری،

---

(۱) السخاوی: الضوء اللامع لاہل القرن التاسع (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۳ھ) ۶/۱۰۰

الشافعی[1]۔

مصنف کے آبار و اجداد میں سے صرف ان کے والد نورالدین، ابوالحسن علیؒ کے حالات زندگی ملتے ہیں۔ اُن کے علاوہ ان کے آبار و اجداد میں سے اور کسی فرد کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل سکی ہے۔ ان کے والد نحو کے مشہور عالم تھے اور اس فن میں یگانۂ روزگار تھے۔ اُس زمانے کے بہت سے اکابر علمار نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ وہ اصلاً اندلس کے ایک شہر وادی آش[۳]

---

(۱) حالات کے لیے دیکھیے: (ا) (مخطوطات) ابن الملقن: العقد المذہب فی طبقات حملۃ المذہب ورق ۱۵۴ (الف) (نسخہ مکتبہ خدابخش پٹنہ)

ابن قاضی شہبہ: طبقات الشافعیہ (نسخہ تحقیقی راقم الحروف) نمبر ۷۳۹

(۲) مطبوعات) السخاوی: الضوء اللامع ۶/۱۰۰—۱۰۵؛ ابن العماد: شذرات الذہب ۷/۴۴

ابن فہد: لحظ الالحاظ بذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۱۹۷ – ۲۰۰

السیوطی: ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۳۶۹۔ السیوطی: حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر و القاہرۃ ۱/۲۴۹۔

ابن ہدایت: طبقات الشافعیہ ص ۹۰

الشوکانی: البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع ۱/۵۰۸

البغدادی: ہدیۃ العارفین ۱/۷۹۱۔ البستانی دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۴/۷۴

الزرکلی: الأعلام ۵/۲۱۸۔ کحالہ عمر رضا: معجم المولفین ۷/۲۹۷

بروکلمن: ۲/۹۲، ذیل بروکلمن: ۱/۶۸۰، ۷۵۳، ۲/۱۰۹

(۲) السیوطی: بغیۃ الوعاۃ فی طبقات النحویین و اللغاۃ (مطبعۃ السعادۃ قاہرہ ۱۳۲۶ھ) ص ۳۲۷

(۳) وادی آش جس کو انگریزی (Guadix) کہتے ہیں اندلس کے مشہور شہروں میں سے ایک شہر ہے۔ اس کے اور غرناطہ کے مابین ۴۰ میل کا فاصلہ ہے۔ (لحظ الالحاظ ص ۱۱۵)

کے رہنے والے تھے۔ لیکن اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر تکرور[1] چلے گئے تھے۔ اور ایک زمانے تک اہالی تکرور کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے رہے اور تعلیم کے ذریعہ خوب مال و دولت حاصل کیا۔ پھر نہ معلوم کس بنا پر وہاں سے قاہرہ منتقل ہو گئے اور وہیں رہ پڑے اور شادی وغیرہ کر لی[2]۔

مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ ابن الملقن کی ولادت ربیع الاول ۷۲۳ھ ہجری میں قاہرہ میں ہوئی۔ لیکن تاریخ کے بارے میں تھوڑا اختلاف ہے۔ اس بارے میں سخاوی (م ۹۰۲ھ) نے دو قول نقل کیے ہیں۔ پہلا قول جس کو سخاوی نے صحیح تر بتلایا ہے یہ ہے کہ مصنف کی ولادت ۲۲ ربیع الاول کو ہوئی تھی اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی پیدائش ۲۴ ربیع الاول بروز شنبہ ہوئی تھی[3]۔ ابن فہد (م ۸۷۱ھ) نے بھی قولِ ثانی کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے[4]۔

ابن الملقن کی عمر ابھی ایک ہی سال کی ہوئی تھی کہ ان کے سر سے اُن کے والد کا سایہ اُٹھ گیا اور وہ ہمیشہ کے لئے شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کے والد نے غالباً اپنے آخر زمانے میں شیخ شرف الدین عیسیٰ المغربی[5] (الملقن) کو مصنف کی پرورش اور تربیت کے لیے نگراں مقرر کر دیا تھا۔ ابن الملقن کے والد کے انتقال کے بعد شیخ مغربی نے اُن کی والدہ

---

(۱) تکرور جنوب مغرب میں ایک شہر ہے۔ اور وہاں کے لوگ حبشیوں سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔ دیکھیے یاقوت الحموی: معجم البلدان (طبع بیروت ۱۹۵۶ء) ۳۸/۲

(۲) السخاوی: الضوء ۱۰۰/۶ و ابن فہد: لحظ الالحاظ ص ۱۹۷

(۳) السخاوی: الضوء ۱۰۰/۶

(۴) ابن فہد: لحظ الالحاظ ص ۱۹۷

(۵) الشیخ عیسیٰ المغربی کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں علیحدہ سے کوئی اطلاع نہیں ملتی ہے۔ ابن الملقن کے حالات کے ذیل میں اتنی معلومات بہم پہونچ سکی کہ وہ جامع ابن طولون قاہرہ میں قرآن پاک کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

سے عقد کرلیا اور اس طرح مصنف اپنی والدہ اور سوتیلے والد کے زیر سایہ پرورش پانے لگے۔

ابتداءً مصنف اپنے نام کے ساتھ "ابن النحوی" لکھا کرتے تھے چونکہ شیخ مغربی "بلقن" کے لقب سے مشہور تھے اس لیے مصنف کے اپنے نام کے ساتھ "ابن النحوی" لکھنے پر ان پر ناراض ہوتے تھے اور ان کو مجبور کرتے تھے کہ وہ بجای "ابن النحوی" کے "ابن الملقن" لکھیں۔ اسی بنا پر مصنف اپنے آپ کو ابن الملقن لکھنے لگے اور اسی لقب سے مشہور رہے[1]۔

ابن الملقن کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے سوتیلے والد کے زیر نگرانی ہوئی۔ زمانہ کے رواج کے مطابق انھوں نے سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد فقہ کی کتاب "العمدۃ" کو زبانی یاد کر ڈالا۔ شیخ مغربی غالباً مسلکاً مالکی تھے کیونکہ وہ "ابن الملقن" کو مالکی مذہب کی کتابیں پڑھانا چاہتے تھے لیکن مصنف کے حقیقی والد کے بعض احباب نے شیخ سے اصرار کیا کہ ابن الملقن کو فقہ شافعی کی کتابیں پڑھائی جائیں چنانچہ انھوں نے ابن الملقن کو امام نووی[2] (م ۶۷۶ھ) کی مشہور اور متداول

---

(۱) السخاوی : الضوء ۶/۱۰۰ ؛ ابن فہد : لحظ الالحاظ ص ۱۹۷

(۲) یحیی بن شرف بن مری بن حسن بن حسین، ابوزکریا، محی الدین، النووی (۶۳۱-۶۷۶ھ) مشہور محدث اور فقیہ شافعی تھے۔ انھوں نے مختلف علوم وفنون میں کتابیں لکھی ہیں ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں: ریاض الصالحین۔ شرح المہذب۔ کتاب الاذکار۔ المنہاج فی شرح مسلم۔ کتاب الایضاح۔ کتاب الخلاصۃ۔ کتاب التبیان۔ طبقات الشافعیۃ۔

تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: السبکی: طبقات الشافعیۃ ۵/۱۶۵؛ ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ ۱۳/۲۶۸؛ ابن تغری بردی: النجوم الزاہرۃ ۷/۲۷۸؛ النعیمی: الدارس فی تاریخ المدارس ۱/۲۴؛ الزرکلی: الاعلام ۹/۱۸۴۔

کتاب منہاج الطالبین پڑھانی شروع کی۔ منہاج ختم کرنے کے بعد انھوں نے مصر کے مشہور عالم، فقیہ اور محدث ابوالفتح ابن سید الناس[1] (م ۷۳۴ھ) اور قطب الدین الحلبی[2] (م ۷۳۵ھ) کی خدمت میں حاضر ہوکر منہاج الطالبین تمام و کمال سنائی۔ مصنف کو بچپن ہی سے فقہ سے بیحد شغف تھا اس لیے انھوں نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اپنے دور کے مشاہیر اور اکابر علماء کے سامنے زانوی تلمذتہ کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنے والد کے شاگرد

---

(۱) محمد بن محمد بن احمد بن عبداللہ، ابوالفتح، فتح الدین، الاندلسی المصری المعروف بابن سید الناس (۶۷۱ - ۷۳۴ھ)۔ اپنے زمانے کے مشاہیر علماء و فقہاء میں شمار کیے جاتے تھے۔ جامع صالح اور جامع خندق میں ایک عرصے تک پڑھاتے رہے۔ شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کئی عمدہ کتابیں لکھی ہیں جن میں "عیون الاثر" اور "شرح الترمذی" مشہور ہیں۔

حالات کے لیے ملاحظہ ہو: طبقات الشافعیہ ۶/۲۹، فوات الوفیات ۲/۱۶۹؛ الوافی بالوفیات ۱/۲۸۹؛ الدرر الکامنہ ۴/۲۰۸؛ النجوم الزاہرۃ ۹/۳۰۳، شذرات الذہب ۶/۱۰۸

(۲) عبدالکریم بن عبدالنور بن منیر الحلبی (۶۶۴ - ۷۳۵ھ) اپنے زمانے کے مشہور محدثین اور علمائی کبار میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے پوری عمر حدیث ہی کی خدمت انجام دی۔ نقد حدیث کے بڑے ماہر تھے۔ اسماء رجال کے فن میں بھی ید طولی رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابوں کی شرحیں لکھیں جن میں بخاری کی شرح اور حافظ عبدالغنی کی "کتاب السیرۃ" کی شرح بہت مشہور ہے۔

حالات کے لیے ملاحظہ ہو: الفوائد البہیۃ ص ۱۰۰، حسن المحاضرۃ ۱/۲۰۲ غایۃ النہایۃ ۱/۴۰۲، ذیل طبقات الحفاظ للحسینی ص ۱۳، البدایہ والنہایہ ۱۴/۱۷۱ النجوم الزاہرۃ ۹/۳۰۶ - الأعلام ۴/۱۷۷۔

جمال الدین الاسنوی[1] (م ۷۷۲ھ) سے کتب فقہیہ پڑھنی شروع کیں اس کے بعد تقی الدین السبکی[2] (م ۷۵۶ھ)، کمال الدین النشائی[3] (م ۷۵۷ھ) اور عزالدین ابن جماعة[4] (م ۷۶۷ھ) کی خدمت

---

(۱) عبدالرحیم بن الحسن بن عمر بن علی بن ابراہیم، ابو محمد، جمال الدین الاسنوی الشافعی (۷۰۴-۷۷۲ھ) شافعی فقہاء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ۷۲۱ھ میں اپنے وطن اسناسے قاہرہ آئے اور وہیں ۷۲۷ھ سے تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ مصر کے مختلف مدارس جیسے مدرسہ اقبغاویہ، المالکیہ، الفارسیہ اور الفاضلیۃ میں ایک عرصے تک پڑھاتے رہے۔ تیس سال کی عمر کے بعد تصنیفی کام شروع کیا اور تھوڑے عرصے میں کئی بیش قیمت تصانیف مختلف فنون میں لکھ ڈالیں۔ جن میں جواہر البحرین، کتاب التمہید، طراز المحافل، طبقات الشافعیۃ، شرح منہاج الطالبین بہت مشہور رہیں۔

حالات کے لیے دیکھیے: الدرر الکامنہ ۲/۳۵۴؛ بغیۃ الوعاۃ ۳۰۴؛ النجوم الزاہرۃ ۱۱/۱۱۴؛ شذرات الذہب ۶/۲۲۳؛ الأعلام ۴/۱۱۹۔

(۲) علی بن عبدالکافی بن علی بن تمام بن یوسف، ابوالحسن، تقی الدین السبکی (۶۸۳-۷۵۶) مشہور فقیہ شافعی گذرے ہیں۔ ۷۳۹ھ میں عہدۂ قضا پر فائز کیے گئے اور ۱۶ برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ مدرسہ عادلیہ، غزالیہ، اتابکیہ، شامیہ، مسروریہ میں عرصہ تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو پچاس تک بتلائی جاتی ہے جن میں سب سے زیادہ مشہور الدر النظیم فی تفسیر القرآن الکریم ہے۔

حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تاج السبکی: طبقات الشافعیۃ ۶/۱۴۶-۲۲۶، الدرر الکامنہ ۳/۶۳؛ البدایہ والنہایۃ لابن کثیر ۱۴/۲۵۲، النجوم الزاہرۃ ۱۰/۳۱۸ قضاۃ دمشق لابن طولون ص ۱۰۱۔ شذرات الذہب ۶/۱۸۰۔ الأعلام ۵/۱۱۶۔

(۳) احمد بن عمر بن احمد بن مہدی، کمال الدین، النشائی الشافعی (۶۹۱-۷۵۷ھ) اپنے زمانے کے عمدہ خطیب اور مصنف تھے۔ جامع الامیر ایدمر الخطیری بولاق میں بحیثیت خطیب فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی تصانیف میں جامع المختصرات، کتاب المنتقی، الابریز فی الجمع بین الحاوی والوجیز بہت مشہور رہیں۔

حالات کے لیے ملاحظہ ہو: السبکی: طبقات الشافعیہ ۵/۱۷۵، ابن حجر: الدرر الکامنہ ۱/۲۲۴؛ النجوم الزاہرہ ۵/۱۶۴۔ شذرات الذہب ۶/۱۸۲۔ الاعلام ۱/۱۷۹

(۴) عبدالعزیز بن محمد بن ابراہیم بن سعد اللہ بن جماعۃ، ابو عمر، عزالدین الکنانی الحموی الدمشقی (۶۹۴-۷۶۷ھ)۔ مصر کے مشہور شافعی فقہاء میں شمار کیے جاتے ہیں (بقیہ حاشیہ ص ۴۸ پر)

میں حاضر ہو کر فقہ کی اہم اور منتہی کتابیں پڑھیں۔ فقہ کے ساتھ ساتھ مصنف کو عربی ادب، اور علم نحو سے بھی کافی دلچسپی تھی انھوں نے اپنے زمانے کے مشہور نحوی اور ادیب۔ البوحیان[1] (م ۷۴۵)، جمال الدین ابن ہشام[2] (م ۷۶۱ھ) اور شمس الدین

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷) ایک زمانے تک بلاد مصریہ کے قاضی رہے۔ اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے شام کے قاضی بھی مقرر کر دیئے گئے تھے ۷۶۶ھ میں عہدۂ قضا سے مستعفی ہو گئے اور ایک سال تک مدرسہ خشابیہ اور جامع ابن طولون میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں: تخریج احادیث الرافعی، المناسک الصغری، السیرۃ الکبری، السیرۃ الصغری۔ بعض متاخرین نے لکھا ہے کہ نووی کی منہاج الطالبین کی شرح لکھنی شروع کی تھی لیکن مکمل نہ ہو سکی۔

تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: السبکی: طبقات الشافعیہ ۶/۱۲۳؛ الدرر الکامنہ ۲/۳۷۸؛ الاعلام ۴/۱۵۱

(۱) محمد بن یوسف بن علی بن حیان بن یوسف، البوحیان، اثیر الدین الجیانی الغرناطی المصری (۶۵۴-۷۴۵ھ) ان کا شمار اکابر نحاۃ میں کیا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد پچاس سے زائد بتلائی جاتی ہے۔ جن میں البحر المحیط تفسیر قرآن مجید، شرح التسہیل، طبقات نحاۃ الاندلس، تحفۃ الاریب فی غریب القرآن منہج السالک علی الفیۃ ابن مالک بہت مشہور ہیں۔

تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: السبکی: طبقات الشافعیہ ۶/۳۱، الصفدی: فوات الوفیات ۲/۲۸۲؛ ابن حجر: الدرر الکامنہ ۴/۳۰۲؛ السیوطی: بغیۃ الوعاۃ ص ۱۲۱ المقری: نفح الطیب ۱/۵۹۸؛ ابن تغری بردی: النجوم الزاہرہ ۱۰/۱۱۱؛ ابن العماد: شذرات الذہب ۶/۱۴۵؛ بروکلمن ۲/۳۲ وذیل ۲/۱۳۵، الزرکلی: الأعلام ۸/۲۶۔

(۲) عبد اللہ بن یوسف بن احمد بن عبد اللہ بن یوسف، البومحمد جمال الدین (بقیہ حاشیہ ص ۳۹ پر)

ابن الصائغ[1] (م ۷۷۶ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اس فن میں بھی یکتائے روزگار ہو گئے۔ فن تجوید حاصل کرنے کے لیے اس زمانے کے مشہور مجوّد برہان الدین الرشیدی[2] (م ۷۴۹ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کئی برس تک اس فن کی تعلیم حاصل کرتے رہے اور اس میں خوب ماہر ہو گئے۔ مصنف کو فن خطاطی سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ مختلف خطوط کی مشق کے لیے مصر کے مشہور خطاط ابن السراج الکاتب[3] (م ۷۴۷ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خاص طور پر خط منسوب میں کافی مہارت

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸) ابن ہشام (۷۰۸ - ۷۶۱ھ) ادب عربی اور نحو کے ائمہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی مشہور کتابیں مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب عمدۃ الطالب فی تحقیق تصریف ابن الحاجب، شذور الذہب، قطر الندیٰ، الجامع الصغیر وغیرہ ہیں۔ حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے: الدرر الکامنہ ۲/۳۰۸؛ النجوم الزاہرۃ ۱۰/۱۳۶؛ الأعلام ۴/۲۹۱

(۱) محمد بن عبدالرحمٰن بن علی، ابو عبداللہ شمس الدین الشہیر بابن الصائغ (م ۷۷۶ھ) اپنے زمانہ کے مشاہیر میں شمار کیے جاتے تھے۔ ادیب، شاعر اور فقیہ بھی تھے۔ قاہرہ میں، جامع ابن طولون میں بہت دنوں تک قرآن وحدیث کا درس دیتے رہے۔ فوجی معاملات کے قاضی بھی رہے ہیں۔

دیکھیے: النجوم الزاہرہ ۵/۲۸۵

(۲) ابراہیم بن لاجین بن عبداللہ برہان الدین الرشیدی (۶۷۳ - ۷۴۹ھ) اپنے زمانہ کے مشہور قضاۃ اور خطیبوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ نحو اور تفسیر کے بھی بڑے ماہر تھے۔ قبہ منصوریہ میں بہت دنوں تک درس دیتے رہے پھر جامع امین حسین بن حیدر میں خطیب مقرر کر دیئے گئے۔

حالات کے لیے دیکھیے: طبقات الشافعیۃ السبکی ۶/۸۳؛ النجوم الزاہرہ ۱/۳۳۴؛ الدرر الکامنہ ۱/۲۹ بغیۃ الوعاۃ للسیوطی ص ۱۸۱، شذرات الذہب ۶/۱۵۸۔

(۳) ابوبکر محمد بن محمد بن نمیر، شمس الدین ابن السراج الکاتب (م ۷۴۷ھ) اپنے زمانے کا عمدہ خطاط تھا۔ اور مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھتا تھا۔

حالات کے لیے دیکھیے: ابن تغری بردی: النجوم الزاہرۃ ۵/۴۹؛ شذرات الذہب ۶/۱۵۲۔

حاصل کی۔ ان کے خط کا نمونہ الاعلام میں موجود ہے[1]۔

اوائل عمری میں ابن الملقن کو فقہ، ادب عربی اور علم نحو سے زیادہ دلچسپی رہی لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کی پوری توجہ فن حدیث پر مرکوز ہو گئی۔ اس فن کو حاصل کرنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے کے لئے مصر کے مشہور محدثین اور اکابر علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جن میں خاص طور پر ابو الفتح ابن سید الناس[2] (م ۷۳۴)، قطب الدین الحلبی[3] (م ۷۳۵ھ) محمد بن غالی[4] (م ۷۴۱ھ) جمال الدین المعدنی الحنبلی[5] (م ۷۴۵ھ) صدر الدین المیدومی[6] (م ۷۵۴ھ) عبد الرحمن بن عبد الہادی،

---

(۱) الزرکلی: الأعلام جلد ۵/ لوحہ نمبر ۸۱۰

(۲) ملاحظہ کیجئے حاشیہ نمبر ۱ ص ۳۶ (۳) دیکھیے حاشیہ نمبر ۲ ص ۳۶

(۴) محمد بن غالی بن نجم بن عبد العزیز، شمس الدین ابو عبد اللہ الدمیاطی (۶۵۰ - ۷۴۱ھ) قاہرہ میں حدیثیں بیان کرتے تھے ان سے کثیر جماعت نے سماعتِ حدیث کی۔ ربیع الاول ۷۴۱ھ میں وفات پائی۔

حالات کے لیے دیکھیے: ابن حجر: الدرر الکامنہ ۴/۱۳۳

(۵) یوسف بن محمد بن نصر بن ابی القاسم، جمال الدین المعدنی الحنبلی (۶۶۴ - ۷۴۵ھ) ان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے ہیں۔ الدرر الکامنہ ۴/۴۷۶ پر ان کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ نجیب اور العز الحرانی اور ابن علاق سے سماعتِ حدیث کی۔

(۶) المیدومی: محمد بن محمد بن ابراہیم بن ابی القاسم بن عنان، صدر الدین، ابو الفتح المیدومی (۶۶۴ - ۷۵۴ھ) شعبان ۶۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ مشائخ وقت سے سماعت حدیث کی۔ یہ آخری شخص ہیں جنھوں نے ابن علاق، ابن النجیب سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ قاہرہ میں حدیث پڑھایا کرتے تھے۔

حالات کے لیے دیکھیے:

ابن حجر: الدرر ۴/ ۱۵۷، النجوم الزاہرۃ ۵/ ۱۳۹

محمد بن احمد الفارقی، ابراہیم بن علی الزرزاری کے پاس رہ کر حدیث کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ حسن بن السدید اور عرضی کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کی بعض کتابوں کو سنایا۔ اس کے بعد مزید مہارت حاصل کرنے کے لئے، علم حدیث کے اچھے ماہرین مغلطائی[1] (م ۷۶۲ھ) اور زین الدین السرخسی کی خدمت میں رہے اور انھیں کی توجہ اور عنایات سے اس فن میں خوب ماہر ہو گئے[2]۔

طلب حدیث کے شوق نے ابن الملقن کو مصر چھوڑ کر دیگر بلاد عربیہ کے سفر کرنے پر مجبور کیا تاکہ دیگر مقامات کے ممتاز محدثین سے بھی استفادہ کریں چنانچہ بقول سخاوی (م ۹۰۲ھ) اور ابن قاضی شہبہ (م ۸۵۱ھ) ۷۷۰ ہجری میں اور بقول ابن العماد (م ۱۰۸۹ھ) ۷۷۷ ہجری میں انھوں نے دمشق کا سفر کیا[3] اور وہاں کچھ دنوں مقیم رہے۔ دوران قیام وہاں کے علماء و فضلاء کے حلقۂ درس میں شرکت کرتے رہے خاص طور پر ابن امیلہ[4] (م ۷۷۸ھ) سے حدیث کی

---

(۱) مغلطائی: مغلطامی بن قلیج بن عبد اللہ، ابو عبد اللہ، علاء الدین، البکجری المصری (۶۸۹-۷۶۲ھ) علم حدیث کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مختلف مدارس میں حدیث کی تعلیم دیتے رہے اور اسی میں اپنی زندگی گذار دی۔ آخر عمر تک پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہے۔ ۲۴ر شعبان بروز سہ شنبہ ۷۶۲ھ میں انتقال کیا۔
تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: ابن فہد: لحظ الالحاظ ص ۱۳۳؛ لسان المیزان ۶/ ۴۲

(۲) ابن قاضی شہبۃ: طبقات الشافعیہ رقم ۷۳۹۔

(۳) الضوء اللامع ۶/ ۱۰۱؛ شذرات الذہب ۷/ ۴۴۔

(۴) عمر بن حسن بن یزید بن امیلۃ بن جمعۃ بن عبد اللہ المراغی المزی (۶۸۰-۷۷۸ھ) اپنے زمانے کے محدثین عظام میں شمار کیے جاتے تھے اور تقریباً پچاس سال تک درس حدیث دیتے رہے۔ جامع مزہ میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔
حالات کے لیے دیکھیے: شذرات الذہب ۶/ ۲۵۸، النجوم الزاہرہ ۵/ ۲۸۹

بہت سی کتابیں پڑھیں۔ دمشق اور مصر کے محدثین جیسے المزی[1] (م ۷۴۲ھ) وغیرہ نے اجازتے بھی عنایت کیے۔

ابن قاضی شہبہ (م ۸۵۱ھ) نے ابراہیم بن اسحاق المناوی[2] (م ۷۵۷ھ) کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے کہ حصول علم کی خاطر، ابن الملقن نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر، اصول فقہ میں ان کی کتاب شرح المعالمین کا بھی کچھ حصہ پڑھا تھا۔[3]

ابن الملقن متعدد صفات حسنہ سے متصف تھے۔ بہت خوبصورت اور قد آور انسان تھے۔ ان کی گفتگو میں بڑی شیرینی تھی۔ عزلت نشینی پسند کرتے تھے لیکن اس کے باوجود عوام

---

(۱) المزی: یوسف بن عبدالرحمن یوسف بن عبدالملک بن یوسف بن علی، جمال الدین، ابوالحجاج، المزی (۶۵۴ ــ ۷۴۲ھ) فقہ، حدیث کے ائمہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ صرف ونحو بلاغت و معانی بیان میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں "تہذیب الکمال" اور "الاطراف" بہت مشہور ہیں۔

حالات کے لیے دیکھیے: السبکی: طبقات الشافعیۃ ۶/ ۲۵۱، ابن حجر: الدرر الکامنہ ۴/ ۴۵۷؛ النجوم الزاہرۃ ۱۰/ ۷۶؛ ابن العماد: شذرات الذہب ۶/ ۱۳۶ الزرکلی: الأعلام ۹/ ۳۱۲

(۲) المناوی: ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم القاضی شرف الدین المناوی المصری (م ۷۵۷ھ) اپنے زمانے کے اکابر علماء میں شمار کیے جاتے تھے ایک کثیر جماعت سے سماعت حدیث کی۔ جامع ازہر اور دار الحدیث الفارقانیہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان کی تصانیف میں شرح فرائض الوسیط بہت مشہور رہے۔

حالات کے لیے دیکھیے: ابن حجر: الدرر الکامنہ ۱/ ۱۷، ابن تغری بردی: النجوم الزاہرۃ ۱۰/ ۳۲۳

(۳) ابن قاضی شہبہ: طبقات الشافعیہ نمبر ۷۳۹

سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے گاہے بگاہے ہنسی مذاق کو بھی پسند کرتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی تصانیف ان کی تقریروں سے بہتر سمجھی جاتی تھیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فن خطابت سے واقف نہ تھے۔ لوگوں کے ساتھ بہت رواداری برتتے تھے۔ ان کو مال و دولت سے بھی وافر حصہ ملا تھا۔ ان میں بخل نہ تھا۔ فقراء و مساکین سے بیحد محبت کرتے تھے اور ان پر اپنا کافی مال خرچ کرتے تھے۔ عبادت وریاضت میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ ہر سال ماہ رمضان میں جامع حاکم میں اعتکاف کیا کرتے تھے[1]۔

ابن الملقن بہت ذہین تھے۔ کافی مطالعہ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ۸۰ سالہ زندگی میں علم فقہ وحدیث کی ایسی خدمات انجام دیں کہ اطراف عالم میں ان کا شہرہ ہوگیا ان کے بعض اساتذہ ان کی ذہانت سے اتنے متاثر تھے کہ اُن کو بڑے اچھے القاب سے یاد کرتے تھے۔ ان کے ایک استاذ العلائی[2] (م ۷۶۱) ھ ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کو "الامام" "شرف الفقہار والمحدثین والفضلاء" کا خطاب دے دیا[3]۔ اسی طرح ان کے معاصرین بھی ان کی ذہانت وفطانت

---

(۱) الضوء اللامع ۶/۱۰۴؛ ابن قاضی شہبۃ: طبقات الشافعیۃ نمبر ۷۳۹، ابن فہد: لحظ الالحاظ ص ۱۰۱۔ البدر الطالع ۱/۵۰۸

(۲) خلیل بن کیکلدی بن عبد اللہ، ابوسعید، صلاح الدین العلائی الدمشقی (۶۹۴ــــ ۷۶۱ھ) مشہور فقیہ شافعی تھے۔ حدیث وفقہ کے بڑے اچھے عالم تھے۔ ساری زندگی تعلیمی کاموں میں مصروف رہے مدرسہ تنکزیہ، اسدیۃ، صلاحیہ میں بہت دنوں تک پڑھاتے رہے۔ ان کی تصانیف ہرفن میں ان کی امامت کے شاہد ہیں۔ ان کی تصانیف میں "القواعد" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے علاوہ عقیلۃ المطالب فی ذکر اشرف الصفات والمناقب، جامع التحصیل فی رواۃ المراسیل تنقیح الفہوم فی صنع العموم بھی ہیں ـــــ حالات کے لیے دیکھیے: لحظ الالحاظ للحسینی ص ۴۳

(۳) الضوء اللامع ۶/۱۰۱

سے بڑے متاثر تھے۔ مثال کے طور پر النماری نے ابن الملقن کے لیے "علم الاعلام" "فخر الانام" "شیخ الاسلام" "علامۃ العصر" "سیف المناظرین" "علم المفیدین والمدرسین" جیسے القاب استعمال کیے ہیں[1]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن الملقن اپنے معاصرین اور اساتذہ کے حلقوں میں کن نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

چونکہ دوران تعلیم ہی سے ابن الملقن کے اساتذہ ان کی ذہانت اور استعداد کے معترف تھے اس لیے انھوں نے ان کو فتویٰ دینے اور تدریس کے لیے اجازے دے دی تھی۔ ایک ماہر فقہ ہونے کی وجہ سے، مصنف ایک عرصے تک قاہرہ میں قاضی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ تاریخ وسیر کی کتابیں اس بارے میں خاموش ہیں کہ ابن الملقن کب سے عہدۂ قضا پر فائز ہوئے۔ بہرحال تمام تذکرہ نگاروں نے یہی لکھا ہے کہ وہ ایک زمانے تک عہدۂ قضا پر فائز رہے۔ ابن الملقن ۸۰۰ھ میں قاضی القضاۃ کے عہدے کے لیے بہت کوشاں ہوئے۔ اس وقت مصر پر مملوک بادشاہ برقوق[2] حکومت کرتا تھا۔ وہ ابن الملقن کی بڑی عزت کرتا تھا اور اپنے مقربین میں سمجھتا تھا۔ اس نے سراج الدین البُلقینی[3] (م ۸۰۵ھ) سے مشورہ کیا کہ

---

(۱) الضوء اللامع ۱۰۴/۶ (۲) برقوق بن انص — انس — ابوسعید سیف الدین الملک الظاہر العثمانی (۷۳۸ — ۸۰۱ھ) - مصر کا پہلا چرکسی بادشاہ تھا۔ اس نے تقریباً ۲۱ سال تک مصر پر حکومت کی بہت بہادر بادشاہ تھا لیکن بقول سخاوی بڑا حریص اور لالچی تھا۔

حالات کے لیے دیکھیے: الضوء اللامع ۱۰/۲ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۵۵۸/۳ الاعلام ۱۸/۲

(۳) عمر بن رسلان بن نصیر بن صالح بن شہاب بن عبدالخالق، سراج الدین ابوحفص البُلقینی المصری (۷۲۴ — ۸۰۵ھ) اپنے زمانے کے مشہور فقیہ، لغوی، منطقی اور محدث تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں الفیض الجاری علی صحیح البخاری بہت مشہور ہے۔

حالات کے لیے دیکھیے: الضوء اللامع ۸۵/۶، شذرات الذہب ۵۱/۷ قضاۃ دمشق لابن طولون ص ۱۰۹ - الأعلام ۲۰۵/۵

ابن الملقن اور ابن ابی البقار[1] م ۷۸۵ھ میں سے قاضی القضاۃ کے عہدہ کے لیے کون زیادہ مناسب ہے۔ بلقینی (م ۸۰۵ھ) نے معاصرانہ چشمک کی بناء پر علم وفضل کے لحاظ سے دونوں کو کمتر بتلایا لیکن اس کے باوجود برقوق نے ابن الملقن کو قاضی القضاۃ مقرر کردیا[2]۔ لیکن مخالفین خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ برکۃ الزینی اور اس کے ساتھیوں نے کسی مالی معاملہ میں (جس کی تفصیل نہیں ملتی) ابن الملقن کے جعلی دستخط بنا کر، برقوق کو ان کی طرف سے بدظن کردیا۔ لیکن اکمل الدین الحنفی[3] (م ۷۸۶ھ) نے درمیان میں پڑ کر معاملہ کو رفع دفع کرادیا[4]۔

---

(۱) عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن یحییٰ بن علی بن تمام بن یوسف، ولی الدین ابوذر بن ابی البقار السبکی (۷۳۵ ــ ۷۸۵ھ) اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ فقیہ بھی تھے۔ مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔ مصر میں قاضی کی حیثیت سے بھی عرصے تک کام کرتے رہے۔

حالات کے لیے دیکھیے: الدرر الکامنہ ۲/۲۹۲؛ النجوم الزاہرۃ ۱۱/۲۹۸؛ شذرات الذہب ۶/۲۸۸ قضاۃ دمشق لابن طولون ص ۱۱۲۔

(۲) لحظ الالحاظ ص ۱۹۸، الضوء اللامع ۶/۱۰۴۔

(۳) محمد بن محمد بن محمود، ابوعبداللہ، اکمل الدین البابرتی، الحنفی (۷۱۴ ... ۷۸۶ھ) فقہ حنفی کے بہت بڑے عالم تھے۔ ادب عربی کے بھی فاضل تھے۔ مملوک سلطان برقوق کے دست راست اور مشیر کار تھے۔ ان کی تصانیف میں شرح تلخیص الجامع الکبیر اور العنایۃ فی شرح الہدایۃ، شرح مشارق الانوار، شرح مختصر ابن الحاجب بہت مشہور ہیں۔

حالات کے لیے دیکھیے: بدائع الزہور فی وقائع الدہور ۱/۲۶۱، الفوائد البہیۃ ۱۹۵ النجوم الزاہرۃ ۱۱/۳۰۲ بغیۃ الوعاۃ ص ۱۰۳، الاعلام ۷/۲۷۱۔

(۴) الضوء اللامع ۶/۱۰۴

غالباً اس واقعہ کا شدید اثر ابن الملقن پر پڑا اور کچھ عرصے کے بعد وہ ازخود اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد سے انھوں نے اپنی پوری توجہ تصنیف وتالیف پر مرکوز کر لی۔ انھوں نے مدرسہ سابقیہ، جامع حاکم[1] اور دار الحدیث الکاملیہ[2] میں تدریسی کام بھی شروع کر دیا۔ حدیث اور فقہ میں ان کی تبحر علمی اور مہارت کی وجہ سے ان کے پاس دور دور سے لوگ آیا کرتے تھے اور فیض اٹھاتے تھے۔

چونکہ ابن الملقن کو شروع ہی سے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا اس لیے انھوں نے کافی کتابیں جمع کر لی تھیں۔ عمر کے آخری حصے میں ان کا یہ قیمتی سرمایہ نہ معلوم کس طرح نذر آتش ہو گیا۔ ان کی ذاتی تصانیف کے بہت سے مسودات جل کر خاکستر ہو گئے۔ مصنف کے دل ودماغ پر شدید صدمہ پہونچا اور ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ اُن کے لڑکے نور الدین علی (جن کے حالات آگے آرہے ہیں) نے ان کو مکان میں مقید کر دیا اور عوام الناس سے ملنا جلنا بند کر دیا لیکن اس کے باوجود مصنف اپنے تصنیفی کام میں برابر مشغول رہے۔ اسی حالت میں شب جمعہ ۱۶ ربیع الاول ۸۰۴ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ اور اپنے والد کے پہلو سعید السعداء میں سپرد خاک کیے گئے[3]۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

---

(۱) یہ مشہور ومعروف مسجد قاہرہ میں باب الفتوح کے نزدیک ہے۔ اس کو فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ نے ۳۹۳ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ المنہل الصافی لابن تغری بردی تحقیق احمد یوسف نجاتی مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۶ — ۷۷/۱۔

(۲) اس کو الملک الکامل ابوبکر محمد بن العادل نے ۶۲۲ھ میں تعمیر کرایا اور چاروں فقہی مسلک کے ماننے والے علماء کا تقرر کیا تھا (القلقشندی: صبح الاعشیٰ ۳۶۳/۳)

(۳) الضوء اللامع ۱۰۵/۶۔ طبقات الشافعیۃ لابن قاضی شہبۃ رقم ۷۳۹۔ لحظ الالحاظ ص ۲۰۱؛ البدر الطالع ۵۰۸/۱۔

ابن الملقن کی کتنی اولاد تھیں اس کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں بصراحت کہیں نہیں ملتا۔ ان کے صرف ایک لڑکے نور الدین، علی[1] کے حالات ملتے ہیں۔ یہ ۷۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۰۷ھ میں ۳۹ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ یہ اپنے والد کی طرح عالم و فاضل نہ تھے۔

تلامذہ :

ابن الملقن فقہ اور حدیث میں، اپنے زمانہ میں امام کی حیثیت رکھتے تھے اور اُن کو ابتدار ہی سے تدریسی کاموں سے دلچسپی تھی عرصہ تک مدرسہ سابقیہ، جامع حاکم اور دار الحدیث الکاملیہ میں پڑھاتے رہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اشخاص محض ان کی تبحر علمی کی وجہ سے، دور دور سے، ان کے پاس آتے تھے اور اُن سے فیض اٹھاتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہونچتی ہے۔ ابن الملقن مسلکاً شافعی تھے لیکن فقہ و حدیث میں ایسی شہرت کے مالک تھے کہ حنفی، حنبلی، مالکی، شافعی سبھی ان کی شاگردی اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ یہاں پر چند مشہور شاگردوں کا ذکر کیا جا رہا ہے ورنہ تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں صدہا لوگوں کے حالات ملتے ہیں جنھوں نے ابن الملقن سے کسی نہ کسی شکل میں شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔

۱۔ ابراہیم بن احمد بن المیلق القاضی برہان الدین الشاذلی الشافعی المعروف بابن المیلق[2] (۷۸۴ ـــ ۸۹۴ھ) اپنے زمانے کے مشہور قاضی اور عمدہ خطیب تھے۔ ایک عرصے تک ابن الملقن کی خدمت میں رہ کر مختلف فنون کی کتابیں پڑھیں۔

۲۔ ابراہیم بن احمد بن غانم بن علی القدسی المعروف بابن غانم[3]۔ ان کی پیدائش ۷۸۰ ہجری میں ہوئی۔ وفات کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔ خانقاہ صلاحیہ میں متولی کے فرائض

---

(۱) شذرات الذہب ۶۹/۷

(۲) الضوء اللامع ۱/۹-۱۰ (۳) الضوء ۱/۲۱

انجام دیتے تھے ۔ ابن الملقن سے سماعت حدیث کی ۔

۳ - ابراہیم بن احمد بن محمد ، ابو محمد ، برہان الدین التجندی ، الحنفی[1] (۷۷۹ ــ ۸۵۱ھ) اپنے زمانے کے اچھے مجود تھے ۔ ابن الملقن سے فقہ وحدیث کی تعلیم حاصل کی ۔

۴ - ابراہیم بن علی بن احمد ، برہان الدین البہنسی الشافعی[2] (۷۶۱ ــ ۸۴۶ھ) انھوں نے ابن الملقن کو نووی (م ۶۷۶ھ) کی منہاج الطالبین اور ابن مالک کی الفیہ سنائی تھی اور اُن سے اجازہ بھی حاصل کیا تھا ۔

۵ - ابراہیم بن محمد بن احمد بن محمد ، ابو حامد النویری المالکی[3] (۷۹۷ ــ ۸۱۹) فقہ اور نحو کے امام تھے ۔ ابن الملقن کو انہی دونوں علوم سے متعلق کتابیں سنائیں اور افتاء و تدریس کے لئے اجازہ حاصل کیا ۔

۶ - ابراہیم بن محمد بن خلیل ، ابو الوفا ، الطرابلسی ، الحلبی المعروف بالقوف ، سبط ابن العجمی[4] (۷۵۳ ــ ۸۴۱ھ) انھوں نے ابن الملقن سے فقہ کی کتابیں پڑھیں اور ان کو خرقہ بھی عطا کیا ۔

۷ - ابراہیم بن محمد بن علی بن احمد العلوی النحریری المعروف بابن البدوی[5] (۷۸۰ - ۷۶۱ھ) انھوں نے ابن الملقن سے مختلف کتابیں پڑھیں ۔

۸ - احمد بن اسماعیل بن محمد بن اسماعیل قطب الدین القلقشندی[6] (۷۶۴ - ۸۴۴ھ) ابن الملقن کو منہاج الطالبین سنایا اور فقہ کی بعض دوسری کتابیں پڑھیں ۔

۹ - احمد بن ابی بکر بن رسلان بن نصیر بن صالح ، شہاب الدین البلقینی المعروف ــــ

---

(۱) الضوء ۱/۲۴ ؛ البدر الطالع ۱/۸ ؛ نظم العقیان ص ۱۳ ؛ الاعلام ۱/۲۳

(۲) الضوء ۱/۸۱ (۳) الضوء ۱/۲۷

(۴) الضوء ۱/۳۸ - لحظ الالحاظ ص ۳۱۴ ؛ البدر الطالع ۱/۲۸ ؛ الاعلام ۱/۶۲

(۵) الضوء ۱/۲۴۳ (۶) الضوء ۱/۲۴۳

بالعجیمی[1] (۷۶۷ — ۸۴۴ھ) فن فرائض کے امام تھے۔ فقہ شافعی کی بنیادی کتابیں ابن الملقن سے پڑھیں۔

۱۰۔ احمد بن حسین بن علی بن شہاب الدین، ابوالبقاء، الزبیری[2] (۷۷۰ — ۸۵۴ھ) ابن الملقن سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔

۱۱۔ احمد بن رجب بن طیبغا المجدی الشافعی المعروف بابن المجدی[3] (۷۶۷ — ۸۵۰ھ) ابن الملقن سے فقہ کی کتابیں پڑھیں۔

۱۲۔ احمد بن عبدالرحمن بن احمد بن عبدالرحمن البارنباری[4] (۷۵۰ — ۸۲۲ھ) نمونی منش انسان تھے۔ ابن الملقن سے کئی کتابیں پڑھیں۔

۱۳۔ احمد بن عبدالرحمن بن عوض بن منصور الاندلسی، الطلنبذی[5] (۷۵۱ — ۸۳۲ھ) ابن الملقن کی خدمت میں بہت دنوں تک رہے اور ان سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔

۱۴۔ احمد بن عثمان بن محمد الریشی المعروف بالکوم الریشی[6] (۷۷۸ — ۸۵۲ھ) انھوں نے ابن الملقن سے کتاب العمدہ پڑھی تھی

۱۵۔ احمد بن علی بن احمد بن علی بن عبدالمغیث، ابوالعباس النشرتی[7] (۷۶۱ — ۸۶۰ھ) فقیہ اور مجود تھے۔ ابن الملقن سے فقہ کی کتابیں پڑھیں۔

---

(۱) الضوء ۱/۲۵۳ (۲) الضوء ۱/۲۸۹

(۳) التبر المسبوک ص ۱۴۹ ؛ بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۲ ؛ البدر الطالع ۱/۵۶ ؛ الضوء اللامع ۱/۳۰۰ ۔ الاعلام ۱/۱۲۱

(۴) الضوء ۱/ ۳۲۵

(۵) الضوء ۱/۳۳۲ ؛ ہدیۃ العارفین ۱/۱۲۴ معجم المؤلفین ۱/۲۶۷

(۶) الضوء ۲/۲-۳ (۷) الضوء ۲/۹

۱۶۔ احمد بن علی بن محمد بن علی بن احمد العسقلانی المعروف بابن حجر[1] (۷۷۳ — ۸۵۲ھ) ابن الملقن کی خدمت میں رہ کر حدیث میں مہارت حاصل کی اور ان کی کتاب "البدر المنیر" کا خلاصہ تیار کیا۔

۱۷۔ احمد بن عمر بن احمد، ابو العباس، شہاب الدین الشاذلی المعروف بالشاب التائب[2] (۷۶۷ — ۸۳۲ھ) ابن الملقن سے کئی کتابیں پڑھیں۔

۱۸۔ احمد بن عمر بن سالم، شہاب الدین العبلاتی معروف بہ شامی[3] (۷۸۵ — ۸۵۲ھ) کتاب العمدہ اور الالفیہ حفظ کرکے ابن الملقن کو سنایا اور مسلسل بالاولیۃ کی حدیثیں ان سے لکھیں۔

۱۹۔ احمد بن محمد بن ابراہیم شہاب الدین ابو العباس الفیشی[4] المالکی المعروف بالحناوی (۷۶۳ — ۸۴۸ھ) ابن الملقن کو الالفیہ سنائی اور کئی دوسری کتابیں پڑھیں۔

۲۰۔ احمد بن محمد بن احمد، شہاب الدین الزفتاوی[5] (۷۷۴ — ۸۶۱ھ) فقہ کی کتابیں ابن الملقن سے پڑھیں۔

۲۱۔ احمد بن محمد بن عبداللہ، ولی الدین ابو حاتم، البہنسی[6] (۷۷۸ — ۸۵۴ھ) ابن الملقن سے علم نحو اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔

۲۲۔ احمد بن محمد بن عثمان، شہاب الدین، ابو العباس، الاموی، العثمانی، المعروف

---

(۱) التبر المسبوک ص ۲۳۰؛ البدر الطالع ۸۷/۱؛ الدر الکامنہ۔ خاتمۃ للناشر بذائع الزہور ۳۲/۲۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۱۳۱/۱۔ الأعلام ۱۷۳/۱

(۲) الضوء ۵۰/۲ (۳) الضوء ۵۳/۲

(۴) التبر المسبوک ص ۱۰۶، الضوء ۶۹/۲

(۵) الضوء ۷۶/۲ (۶) الضوء ۱۳۱/۲

بابن المحمرہ[1] (۷۶۷ ـ ۸۴۰ھ) ابن الملقن سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔

۲۳۔ احمد بن موسیٰ بن عبداللہ، شہاب الدین المغربی الصنہاجی[2] (۷۸۰ ـ ۸۵۸ء) ابن الملقن سے علم فقہ خوب اچھی طرح سیکھا۔

۲۴۔ اسحاق بن ابراہیم بن احمد تاج الدین التدمری[3] (م ۸۳۳ھ) ابن الملقن نے ان کو فقہ میں اجازہ دیا تھا

۲۵۔ ابوبکر بن احمد بن محمد، ابوالصدق، تقی الدین ابن قاضی شہبہ[4] (۷۷۹ ـ ۸۵۱ھ) ابن الملقن سے فقہ اور حدیث کی کتابیں پڑھیں۔

۲۶۔ حسن بن احمد بن مکی، العلقمی[5] (۷۷۰ ـ ۸۳۳ھ) منہاج الطالبین اور الفیہ بن مالک ابن الملقن سے پڑھیں۔

۲۷۔ حسن بن محمد بن ایوب الحسینی المعروف بالشریف النسابہ[6] (۷۶۷ ـ ۸۶۶ھ) ایک زمانے تک ابن الملقن کے حلقہ درس میں شریک ہوتے رہے۔

۲۸۔ حسین بن احمد بن محمد، بدر الدین ابوعلی الہندی المکی[7] (۷۴۲ ـ ۸۲۴ھ) قاہرہ میں ابن الملقن کے حلقہ درس میں شریک ہوئے۔

۲۹۔ خلف بن علی بن محمد التروجی الشافعی[8] (۷۶۰ ـ ۸۴۴ھ) انھوں نے مؤطا

---

(۱) الضوء ۲/۱۸۶ (۲) الضوء ۲/۲۲۹

(۳) الانس الجلیل ۲/۴۸۳، کشف الظنون ۱۵۸۹ ـ الضوء ۲/۲۷۶

(۴) الضوء ۱۱/۲۱؛ النجوم الزاہرۃ ۷/۳۱۴؛ حوادث الدہور ۱/۲۵ شذرات الذہب ۷/۲۶۹ ـ الاعلام ۲/۳۵

(۵) الضوء ۳/۹۲ (۶) الضوء ۳/۱۲۱

(۷) الضوء ۳/۱۳۷ (۸) الضوء ۳/۱۸۴

امام مالک، ابن الملقن کو سنائی تھی۔

۳۰۔ رضوان بن محمد بن یوسف، زین الدین، ابوالنعیم، الصحراوی[1] (۷۶۹ — ۸۵۲ھ) ابن الملقن کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے رہے۔

۳۱۔ سلیمان بن ابراہیم بن عمر بن علی نفیس الدین الزبیدی الحنفی[2] (۷۴۵ — ۸۲۵ھ) ابن الملقن سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔

۳۲۔ سلیمان بن فرح بن سلیمان، علم الدین التحکینی الحنبلی[3] (۷۶۰ — ۸۲۲ھ) مختلف علوم و فنون کی کتابیں، ابن الملقن سے پڑھیں۔

۳۳۔ شعبان بن محمد، زین الدین ابو الطیب العسقلانی المعروف بابن حجر[4] (۷۸۰ - ۸۵۹ھ) قرآن مجید اور کتاب العمدہ ابن الملقن سے پڑھی۔

۳۴۔ صدقہ بن علی بن محمد، نجم الدین، الشارمساحی[5] (م ۸۵۰ھ) ابن الملقن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابو اسحاق الشیرازی (م ۴۷۶ھ) کی کتاب التنبیہ پڑھی اور ان سے اجازہ بھی حاصل کیا۔

۳۵۔ عبدالرحمن بن عبدالوارث، نجم الدین المالکی[6] (۷۸۳ — ۸۶۸ھ) ابن الملقن سے کچھ کتابیں پڑھیں۔

۳۶۔ عبدالرحمن بن علی بن عمر، ابوہریرۃ، المعروف بابن الملقن[7] (۷۹۰ — ۸۷۰ھ) یہ ابن الملقن کے پوتے ہیں۔ انھوں نے مختلف علوم و فنون کی کتابیں ابن الملقن سے پڑھیں۔

---

(۱) الضوء ۳/۲۲۶ ۔ الاعلام ۳/۵۳

(۲) الضوء ۳/۲۵۹ (۳) الضوء ۳/۲۶۹

(۴) الضوء ۳/۳۰۴ (۵) الضوء ۳/۳۱۸

(۶) الضوء ۴/۹۰ (۷) الضوء ۴/۱۰۱

۳۷۔ علی بن احمد بن خلیل، نور الدین، الاسکندرانی المعروف بابن بصال[1] (۷۷۳-۸۴۷ھ)
ابن الملقن سے سماعتِ حدیث کی اور ان کی بہت سی کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھیں۔

۳۸۔ عبدالرحمٰن بن محمد بن حسن، تقی الدین الزبیری المعروف بابن القاقوسی[2] (۷۸۶-۸۶۴ھ) انھوں نے ابن الملقن سے حدیث کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔

۳۹۔ عبدالرحمٰن بن محمد بن یحیٰی، ابو الفضل، زین الدین، السندبیسی[3] (۷۸۵-۸۵۲ھ)
ابن الملقن سے حدیث کی سماعت کی۔

۴۰۔ عبدالرحیم بن محمد بن عبدالرحیم، عز الدین، ابو محمد المعروف بابن الفرات[4] (۷۵۹-۸۵۱ھ) ابن الملقن سے ۷۷۱ ہجری میں کتاب العمدہ پڑھی تھی۔

۴۱۔ عبدالسلام بن داؤد، عز الدین، السلطی المعروف بالعز القدسی[5] (۷۷۲-۸۵۰ھ)
قاہرہ میں ایک عرصے تک ابن الملقن کی خدمت میں رہے اور بہت سی کتابیں پڑھیں۔

۴۲۔ عبدالعزیز بن محمد بن عبداللہ ابو محمد المالکی المعروف بابنِ عبدالعزیز[6] (۷۸۰-۸۵۸ھ)
ابن الملقن سے کتاب العمدہ پڑھی تھی

۴۳۔ عبدالغنی بن عبدالحمید، تقی الدین ابو محمد المغربی، المنوفی[7] (۷۷۰-۸۵۸ھ) ابن الملقن سے فقہ کی تعلیم ہیں حاصل کی۔

۴۴۔ عبدالغنی بن محمد بن احمد، زین الدین القمنی[8] (۷۸۲-۸۶۷ھ) انھوں نے کتاب التنبیہ، العمدۃ اور الفیہ ابن مالک، ابن الملقن کو سنائیں اور انھوں نے ان کو اجازہ دیا۔

---

(۱) شذرات الذہب ۷/۲۶۰ (۲) الضوء ۴/۱۲۶ (۳) الضوء ۴/۱۵۰
(۴) التبر المسبوک ۱۹۳۔ الضوء ۴/۱۸۶ الاعلام ۴/۱۲۳
(۵) الضوء ۴/۲۰۳ (۶) الضوء ۴/۲۲۸
(۷) الضوء ۴/۲۵۳ (۸) الضوء ۴/۲۵۴

۴۵ - عبداللطیف بن احمد بن علی بن محمد، نجم الدین، ابوالثناء الحسنی المکی، الفاسی[1] (۷۷۸ - ۸۲۲ھ) ابن الملقن سے فقہ کی کتابیں پڑھیں

۴۶ - عبداللطیف بن محمد بن عبداللہ، ابوالطیب الزفتاوی[2] (م ۸۷۷ھ) کتاب التنبیہ الالفیہ، اور "العمدۃ" ابن الملقن کو سنائیں اور انھوں نے ان کو اجازہ دیا۔

۴۷ - عبداللہ بن احمد بن عبدالعزیز بن موسی العزاری البشبیشی[3] (۷۶۲ - ۸۲۰ھ) ابن الملقن سے فقہ کی کئی کتابیں پڑھیں۔

۴۸ - عبداللہ بن محمد بن عیسی، جلال الدین العوفی[4] (۷۷۵ - ۸۴۵ھ) فقہ کی کتابیں ابن الملقن سے پڑھیں۔

۴۹ - عبدالمؤمن بن علی بن عبدالمومن الرومی الشامی[5] (۷۵۶ - ۸۳۳ھ) حدیث کی کتابیں ابن الملقن سے پڑھیں۔

۵۰ - علی بن احمد بن اسماعیل ابوالفتوح، القلقشندی[6] (۷۸۸ - ۸۵۶ھ) ابن الملقن کے پاس رہ کر فن فقہ کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔

۵۱ - علی بن ابی بکر بن علی، نورالدین البکری البلبیسی[7] (۷۸۲ - ۸۵۹ھ) ابن الملقن کے حلقہ درس میں شامل ہوتے تھے اور بہت سی کتابیں اُن سے پڑھیں۔

تصانیف:

ابن الملقن کا تصنیفی دور کب سے شروع ہوتا ہے، تاریخ کی کتابوں میں، قطعیت کے ساتھ، کہیں مذکور نہیں۔ سخاوی (م ۹۰۲) نے زین الدین العراقی (م ۸۰۶ھ) کے حوالے

---

(۱) الضوء ۴/۳۲۲ (۲) الضوء ۴/۳۳۶

(۳) الضوء ۵/۷ (۴) الضوء ۵/۶۰ (۵) الضوء ۵/۹۰

(۶) الضوء ۵/۱۶۱ (۷) الضوء ۵/۲۰۴

سے لکھا ہے کہ "ابن الملقن نے عنفوانِ شباب ہی سے تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا تھا"[1] خود ابن الملقن اپنی کتاب "خلاصۃ البدر المنیر" کے آخر میں رقم طراز ہیں:-

هذا آخر ما وقع عليه الاختصار من كتابنا المسمى البدر المنير في تخريج احاديث الشرح الكبير الى أن قال وكان الابتداء في اختصاره يوم الجمعة تاسع عشرين من شعبان المكرم والفراغ منه في يوم الجمعة رابع شوال كلاهما سنة تسع واربعين وسبع مائة[2]

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ مصنف نے ۲۹ شعبان بروز جمعہ ۷۴۹ھ میں کتاب البدر المنیر کی تلخیص کا کام شروع کیا تھا اور ۴ شوال بروز جمعہ ۷۴۹ھ میں اس کو مکمل کر دیا۔ ابن الملقن کی ولادت ۷۲۳ھ میں ہوئی اور خلاصۃ البدر المنیر کی تکمیل کے وقت اس کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنف نے ۷۴۹ھ سے پہلے "البدر المنیر" لکھی ہوگی اور اس طرح اس نے ۲۶ سال کی عمر سے یقیناً قبل ہی تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا ہوگا۔

ابن الملقن نے حدیث، اصولِ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ، تاریخ وتذکرہ، علم نحو اور دیگر علوم وفنون میں بہت سی کتابیں لکھیں جیسا کہ آگے کی تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔ مورخین نے ان کی تصانیف کی تعداد تین سو تک بتلائی ہے جن میں اکثر کتابیں مصنف کے حین حیات میں نذر آتش ہوگئیں۔ اب بھی ساٹھ سے زائد تصانیف مشرق ومغرب کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں جن میں بعض بخطِ مصنف ہیں اور بعض مصنف کے حین

---

(۱) الضوء اللامع ۶/۱۰۱

(۲) فہرست مشروح بعض کتب نفیسہ قلمیہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (مطبوعہ ۱۳۵۷ھ) ۲/۲۰۵

حیات میں لکھی گئی ہیں۔ ابن الملقن کی تصانیف نے ان کی زندگی ہی میں اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ ان کے بعض معاصرین نے ان کو بطور ماخذ کے استعمال کیا ہے۔ جیسے بقول ابن قاضی شہبہ (م ۸۵۱ھ) احمد بن حمدان شہاب الدین الاذرعی (م ۷۸۳ھ) نے نووی کی منہاج الطالبین کی شرح لکھتے وقت ابن الملقن کی شرح المنہاج سے پورا پورا استفادہ کیا تھا[1]۔

مصنف کو سب سے زیادہ دلچسپی، حدیث اور فقہ سے تھی۔ اسی لیے ان کی زیادہ تر تصانیف انھی فنون پر مشتمل ہیں۔ ان کی تصانیف کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ ان کے بعض ہم پلہ معاصرین نے ان کی بعض کتابوں پر تقریظیں لکھی ہیں اور ان کے کام کو بہت سراہا ہے جیسے تاج الدین السبکی (م ۷۷۱ھ) نے ان کی کتاب "البدر المنیر" پر تقریظ لکھی۔ اسی طرح عماد الدین ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے بھی ان کی کسی کتاب پر تقریظ لکھی تھی[2]۔

مذکرہ بالا امور سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن الملقن کی زندگی ہی میں ان کی کتابیں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جاتی تھیں اور صرف عوام ہی نہیں بلکہ علماء و فضلاء بھی اُن کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔

میرے علم کے مطابق، ان کی تمام تصانیف میں سے صرف ایک مختصر رسالہ "الکلام علی سنة الجمعة قبلها و بعدها" ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوا ہے اور اس کی اشاعت کا شرف ہندوستان کو حاصل ہے۔ اب ہم ذیل میں فن وار ان کی تصانیف کا مختصر تعارف کرائیں گے۔

(باقی)

---

(۱) ابن شہبہ : طبقات الشافعیہ نمبر ۷۳۹

(۲) السخاوی : الضوء اللامع ۶/ ۱۰۱

(قسط نمبر ۱۸)

ہندو تہذیب اور مسلمان

جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاذ تاریخ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو برہان ماہ ۱۹۶۵ء)

اس رسم کے بعد شادی تک ہر تیج تہوار کے موقعہ پر لینے دینے کی کئی رسمیں عمل میں آنے لگتی تھیں۔ مثلاً شب برات کو دولھا کے یہاں سے دولہن کے لئے آتشبازی، مہندی، چوڑیوں کے جوڑے، مٹھائی کے خوان جاتے تھے۔ اسی طرح دوسری طرف سے دولھا کے لئے آتشبازی اور مٹھائی وغیرہ آتی۔ دوسرے تیوہاروں مثلاً رمضان، عید، بقرعید اور محرم اور پھولوں کی سیر کے ایام میں آپس میں چیزیں بھیجی جاتی تھیں۔[1]

پنجاب کے علاقے میں اس کے بعد کچھ اور رسمیں ادا ہوتی تھیں مثلاً سیالکوٹ میں ایک میراثی، نائی اور ایک برہمن لڑکے کے گھر جاتا تھا اور جب وہ اس کے گھر پہونچتا تھا تو تھوڑا سا تیل دہلیز پر ڈالا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ گھر میں داخل ہوتا تھا۔ اس رسم کو "تیل ڈالنا" کہتے تھے۔ منہ جھٹلانے کی رسم کے بعد کھچڑی کی رسم ادا ہوتی تھی اس موقع پر لڑکے کے والد کے گھر میں نقارے بجائے جاتے تھے اس موقع پر حاضرین لڑکے کے باپ کو ایک ایک روپیہ دیتے تھے جو لڑکی کا حق ہوتا تھا، میراثی و نائی وغیرہ کے رخصت ہونے کے وقت انھیں بدائی (وداعی) دی جاتی تھی۔[2]

گجرانوالہ علاقے کے دولتمند گھرانوں میں "ٹیکا" کی رسم ادا ہوتی تھی۔ اس دستور کے مطابق

---

[1] رسوم دہلی ص ۹۱۔۹۴، گزشتہ لکھنؤ ص ۳۵۱، ۳۵۲ نیز Observations etc., pp. 193-94

[2] Tribes & castes I.P. 806

ڑکی والے ایک نائی، میراثی، برہمن، اور ایک درزی مع ایک گھوڑے، اونٹ اور لڑکے اور اس کے والد کے لئے کپڑے بھیجتے تھے۔ اس کے علاوہ لڑکے کے لئے ایک انگوٹھی، اکیس روپے نقد مصری کے پانچ کوزے اور کچھ سوکھی کھجوریں بھی ہوتی تھیں۔[۱]

شادی کی لگن دھرنا | جب طرفین شادی کی تیاریاں کر لیتے اور دولہا دولہن شادی کے لائق ہو جائے تو دولہا کی ماں بہنیں اور قریبی رشتے کی عورتیں مٹھائی کے خوان ساتھ لے کر اور اگر بڑا گھر ہوتا تو باجے گاجے کے ساتھ دولہن کے گھر جاتیں اور تاریخ ٹھہرا کر واپس چلی آتی ہیں[۲]۔ اس رسم کو شادی کی لگن بھرنا کہتے ہیں[۳]۔ میر حسن دہلوی نے لکھا ہے کہ اس دن لڑکی والے ایک تھال میں کچھ چیزیں لڑکے والوں کے ہاں ایک رقعہ کے ساتھ بھیجتے تھے جس میں شادی کی تاریخ لکھی ہوتی تھی[۴]۔ ہندوستانی مسلمان طرح طرح کے توہمات کے شکار تھے اور اب بھی ہیں لہذا اسی بنا پر وہ لوگ، سال کے کچھ مہینے اور دن مثلاً محرم وغیرہ میں شادی کرنا منحوس خیال کرتے ہیں اس لئے تاریخ کے ٹھہرانے میں مبارک مہینہ، مبارک دن اور مبارک گھڑی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور اس موقع پر نجومیوں کے مشورہ سے تاریخ ٹھہرتی تھی۔ مثلاً ایک بادشاہ نے اپنے لڑکے کی شادی کے موقع پر نجومیوں کو طلب کیا اور ان سے تاریخ دریافت کی۔

ایک اچھی سی تاریخ ٹھہرائیے دیا حکم ہم نے تمہیں آئیے!

بلا شگون کو بتا سال سن مقرر کیا ساعت کا دن[۵]!

اگر تاریخ کے ٹھہرانے میں شگون اور بدشگون کا خیال نہ رکھا جاتا اور خدانخواستہ شادی کے

---

[۱] Trials of eastern I, p. 805-6

[۲] رسوم دہلی۔ ص ۹۴۔۹۵ observations etc. p. 115

[۳] کلیات سودا۔ جلد دوم۔ ۱۴۳، ۱۶۱، ۱۹۰، ۲۰۸، ۲۹۰، ۲۲۳

[۴] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۱، تاریخ عجیب آباد۔ ص ۵

[۵] ایضاً ص ۱۲۱ کلیات سودا۔ ج ۲۔ ص ۲۱۹، ۲۲۳، ۲۲۹ Observations etc — p 195

دن یا بعد میں کوئی حادثہ پیش آجاتا تو ان کو یہی خیال ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ ساعت بد اور منحوس گھڑی کی وجہ سے ہوا تھا۔ حضرت قاسم کی شادی کے دن جو واقعات پیش آئے۔ وہ اس وجہ سے تھے کہ ان کی شادی کی تاریخ منحوس گھڑی میں ٹھہرائی گئی تھی۔

اور کیا کہوں میں بیاہ کی نوبت جو دھرائی ۔ چھائی ہے زن و مرد کی دن رات پٹائی

مائیوں بٹھانا — دراصل یہ پنجابی رسم تھی اور اس میں دولہن کو مانجھے (یعنی چارپائی) پر بٹھایا جاتا تھا اور رفتہ رفتہ مانجھا بٹھانا مائیوں بٹھانا بن گیا۔[۵] مختصر یہ کہ شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد دس پندرہ دن پہلے دلہن کو زرد کپڑے پہنا کر مائیوں بٹھاتے تھے اور لڑکے کو صرف ایک دو روز پہلے۔ اس موقع پر رشتے کی عورتیں جمع ہوتی تھیں اور دولہن کے کپڑے زرد رنگ میں رنگے جاتے تھے، اور اسے نہلا دھلا کر اور سر کی چوٹی گوندھ کر اسے مائیوں بٹھایا جاتا تھا پہلے دولہن کو چوکی پر بٹھاتے تھے یہ دہنیں ملیدہ کے سات نوالے اسے کھلاتیں اور اس کے ہاتھ پر ابٹنا رکھتی تھیں۔ بعد ازیں اس کی ماں اس کے دونوں ہاتھوں میں روپیہ، ایک پان کا بیڑہ، سات پنڈیاں رکھتی اور کہتی "بیٹی ہم تمہارے فرض سے ادا ہوئے" اس کے بعد دلہن کو لیجا کر ایک کوٹھری میں ایک پلنگ پر بٹھا دیتے اور اس طرح اسے مقید کر دیا جاتا اور روزانہ اس کے بدن پر اُبٹنا ملا جاتا تھا۔ دولہن کا بچا اور گندھا ہوا ابٹنا لگن میں اور ڈھائی سیر اُبٹنا کشتیوں میں رکھ کر، کم سے کم سوا سو اور زیادہ سے زیادہ پانچ سو پنڈیاں مع دیگر سامان کے دولہا کے گھر بھیجی جاتیں۔ ابٹنے کے ساتھ یہ سامان ہوتا تھا۔ ابٹنے کی لگنی، کٹورا، تشتری، شلپچی، آفتابہ، لوٹا تیترا، رکابی کا جوڑا دو سرپوش جس میں ورق لگی ہوئی پنڈیاں بھری ہوں رگیارہ، رومال، نہانے کی چوکی، سوزنی، دولنگیاں، زرد کپڑے یعنی مائیوں کا جوڑا۔ تیل کی شیشی اور چادر وغیرہ مائیوں بٹھانے کے دن سے سہاگ کھوریا

---

observations etc. P. 197, 195 - ۲۹۹، ۵۰، ۱۴۴ — ص ۱۴۴ — جلد دوم — کلیات سودا — [۴]

[۵] رسوم دہلی — ص ۶۲ — کلیات سودا — جلد دوم ص ۱۷۰

گانا شروع ہو جاتا تھا۔ [۵۱]

ابٹنا کھیلنا [۵۲] | دولہا دلہن کو مائیوں بٹھانے کے بعد اندر عورتوں اور باہر مردوں میں ابٹنا کھیلا جاتا تھا۔ اس موقع پر بالکل ہولی کی رنگ پاشی کا سماں بندھ جاتا تھا۔ دولہن کے رشتہ دار دولہن کے ہاں اور دولھا والے دولھا کے ہاں ابٹنا کھیلتے تھے اور اس کے برخلاف دہلی کے قلعۂ معلیٰ میں دولہا والے دولہن کے ہاں اور دولہن والے دولہا کے ہاں ابٹنا کھیلنے جایا کرتے تھے۔ اور بہادر شاہ ظفر کے بعد بھی مغلیہ خاندان کے افراد میں یہ رسم جاری رہی تھی [۵۳]

ساچق [۵۴] | اصل رسم حنابندی کا نام ساچق ہے۔ مرزا قتیل نے اس رسم کا تفصیلی ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے

---

۵۱ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ رسوم دہلی ص ۹۵، ۱۰۰، ہفت تماشا ص ۱۶۲، گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۲-۳۵۳

Tribes and Castes, I, P. 814.

اس موقعہ کی ایک اور رسم کا اہلیہ میر حسن علی نے ذکر کیا ہے اس کا نام "موسل میں نارا باندھنا" تھا۔ یہ رسم خالص ہندوانہ تھی۔ اس کے مطابق جب ابٹنا تیار ہو جاتا تھا تو موسل کے ہتھے پر صندل، چھالیا اور پانوں کا تیار کیا ہوا ایک لیپ لگایا جاتا تھا اور ایک نئے لال کپڑے میں چھالیا باندھ کر اس پوٹلی کو اس سے باندھ دیا جاتا تھا اس کے بعد سات سہاگنیں ابٹنا پیسنے بیٹھتی تھیں۔ اس کے بعد ایک لال کپڑے میں دھان رکھا جاتا تھا اور ایک پان کے پتے کے ساتھ اس موسل کے ہتھے پر نارا سے باندھ دیا جاتا تھا اور عورتیں ظاہرا اس کو کوٹنے میں لگ جاتی تھیں۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو Observations etc, PP 207-208

۵۲ ابٹن ایک قسم کا مرکب ہوتا ہے جو ہلدی اور جو کا بھنا ہوا آٹا، کھلی، چھیل چھبیلا، ناگر موتھا، تج، بالچھڑ، تیزپات اور تیل ڈال کر پانی میں گھولا جاتا ہے اور منہ بدن کی صفائی کے لئے لگایا جاتا ہے۔

Observations P. 207

۵۳۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۲-۳۵۳۔ رسوم دہلی ص ۱۰۰-۱۰۱

۵۴ ساچق، ترکی لفظ ہے مگر رسم شادی میں مستعمل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک اور مغل اس رسم کو اپنے ساتھ لائے تھے۔

کہ اس موقع پر مٹکیوں کو پوتا جاتا تھا اور ان پر پھول بوٹے بنائے جاتے تھے۔ ان میں نقل بھرا جاتا تھا جو شکر اور چنے کے آٹے سے تیار ہوتا تھا اور پستہ، بادام اور مصری سے انھیں پُر کیا جاتا تھا۔ چار مٹکیوں کو ایک تخت پر رکھتے تھے۔ ہر ایک تخت کو ایک مرد اٹھاتا تھا اور ان تختوں کی کمی و بیشی لڑکے کے والدین کی مالی اور معاشی حالت پر منحصر تھی۔ اور اسی طرح آرائش کے تختے[۱] جماتے تھے۔ چیزوں کی کمی و بیشی طرفین کی مالی اور

---

۵۱ مرزا قتیل نے ان تختوں کی تفصیل یوں بیان کی ہے "یہ تختے کاغذ اور ابرق کو کاٹ چھانٹ کر کاغذی پھولوں کے درختوں کو سبز پھولوں کے ساتھ جماتے ہیں۔ اور میوہ دار درخت بناتے ہیں جیسے سیب، انجیر، انگور، انار، اور دوسرے ہندوستانی میوے مثلاً از قسم نارنگی اور شریفہ اور ان کے علاوہ پری طلعت عورتوں اور ہر قسم کے مرد یعنی مغل، فرنگی اور دکھنی لوگوں کے کاغذی مجسمے بنا کر جُدا جُدا ایک تخت پر بٹھاتے ہیں۔ ہفت تماشا۔ ص ۱۴۰

۵۲ اشیاء میں امیروں کے ہاں چاندی کا "سہاگ پڑا" اس میں دو سونے چاندی کی کنگھیاں، سہاگ کا عطر، اور منقش شیشیوں پھلیل، کٹیلی جس میں چھیل چھبیلا، ناگر موتھا، بالچھڑ، چھوٹی الائچیاں، کپور کچری، لونگیں چنبیلی کی جڑ، ہلدی، جوز، جوتری، تیزپات، صندل، زعفران، مشک دانہ، اور مستی کی دو پڑیاں ہوتی تھیں۔ چاندی کی چار ٹھلیاں، دو میں دودھ اور دو میں شربت بھرا ہوا، سوا پانچ سیر کھانڈ پانچ سیر قند، ڈھائی سیر مہندی کے تین پڑے، بابا فرید کے نام کے جن پر چاندی سونے کے خول چڑھے ہوتے تھے۔ گیارہ سیر مہندی، پانچ سیر کلاوہ پچیس من نقل، پانچ من قرص، گیارہ من میوہ ...... ان کے علاوہ ایک جوڑا برات کا، برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ہفت تماشا۔ ص ۱۴۰-۱۴۲۔ گلزار شجاعی ۵۷ء

رسوم دہلی۔ ص ۱۰۱-۱۰۴، گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۳۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان ٹھلیوں پر عموماً سُوہے کا کپڑا ناڑے سے بندھا ہوا ہوتا تھا اور جلوس میں ان سب ٹھلیوں کے آگے چاندی کی ایک دہی کی مٹکی ہوتی تھی اور اس کے منہ پر سُوہا کپڑا سے باندھ دیا جاتا تھا اور اس کے گلے میں مبارک فال کے لئے دو ایک مچھلیاں بھی بندھی ہوتی تھیں۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۳۵۳۔

سماجی حالت پر موقوف تھی۔ علاوہ ازیں میوے کے چند خوان ہوتے تھے اور پھولوں کے ہار اور دوسرے زیور مثلاً بازو بند، اور دست بند برائے دلہن۔ پھر اپنے رشتہ داروں کو لے کر حسبِ حیثیت ہاتھی یا گھوڑے یا میانہ پر اور عورتوں کو میانہ، چوپال، ڈولی، پر سوار کر کے اور دولھا کو ہاتھی یا خاندانی رسم کے مطابق گھوڑے پر سوار کر کے بڑی شان و شوکت کے ساتھ دولہن کے گھر جاتے تھے[1] دولہن کے گھر پہونچنے پر دولھا کو ایک مسند پر بٹھلاتے تھے۔ بعد ازیں رقص و سرود شروع ہو جاتا تھا جب دو پہر رات گذر جاتی تو گلاب سے معطر کیا ہوا شربت پیش کیا جاتا تھا۔ دولہن کی طرف کے لوگ اس شربت کو اس صورت میں مجلس میں لاتے تھے کہ جگ تو ایک ہاتھ میں ہوتی تھا اور چینی یا شیشہ کے چھوٹے چھوٹے پیالے چاندی یا کسی دوسری دھات کی تھالی میں رکھے ہوئے کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ میں ہوتے تھے پہلا شربت دولھا کو پلایا جاتا تھا اور اس کے بعد دوسروں کو۔ دولھا کے لئے یہ ضروری تھا کہ شربت چکھنے کے بعد پانچ روپے یا کم یا ایک دو اشرفی اس تھال میں ڈالے اور ایک دو روپے نگن میں بھی ڈالتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی شربت چکھنے کے بعد زرِ نقد تھالی میں ڈالتے تھے مختصر یہ کہ یہ شربت صرف چکھنے کے لئے ہوتا تھا پینے کے لئے نہیں بعضے تو لبوں سے چھو کر پیالہ رکھ دیتے تھے مگر مقررہ رقم تھالی میں ضرور ڈال دیتے تھے۔

اس کے بعد ویسی ہی شان و شوکت کے ساتھ دولھا اپنے گھر واپس آتا تھا[2]۔ یہ رسم امیر و غریب سب کے ہاں عمل میں آتی تھی۔ اجیت سنگھ راٹھور کی لڑکی سے فرخ سیر بادشاہ کی شادی کے موقع پر یہ رسم ادا ہوئی تھی اور بادشاہ نے بڑی شان و شوکت سے ساچق کی چیزیں دولہن کے گھر بھیجی تھیں

---

[1] ہفت تماشا ص ۱۴۲، ۱۴۳، رسوم دہلی ص ۱۰۷، گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۳ کلیات سودا جلد دوم

کسی ساچق کا دیکھا ہے یہ آئین | کہ تم کے سر اٹھا کر ٹکیاں کیں

بنا بیٹھی کی بچیاں نیزوں پہ دھرتیں | چلے دولہن کے گھر یوں لے مٹھائی ص ۲۱۹

بزم ص ۱۰۷، ۱۸۱، ۲۱۶، ۲۲۲، یہ رسم منگنی کے وقت بھی ادا کی جاتی تھی Observations etc P.P. 192-93

Observations etc, P.P. 199-200

[2] ہفت تماشا ص ۱۴۳

مؤرخ کا بیان ملاحظہ ہو:

اسباب ساچق را ترتیب لائق و آئین گزین را بلحاظ ساختند و حضرت خدیو جہاں و خاقانِ زماں ... تشریف فرمودہ .... و اسباب و اشیاء مذکورہ را کہ خلاصہ نفائس بحر و کاں بود بنظر انور در آوردہ تورہ ہا بہ بیگمان عفت نشان را انجملہ خوان کہ در ہر یک یازدہ پارچہ قطع ناکردہ بود با دو رقم جواہر کہ نہ لک روپیہ قیمت داشت، بقدوۂ مخدرات اسوۂ مطہرات ملکہ ملکی ..... حضرت بیگم صاحبہ و دیگر بیگمان از ہژدہ پارچہ تا یازدہ پارچہ کہ با اکثر آں چیزے چند از جواہر نیز بود، مرحمت فرمودند و حکم نمودند کہ خوانہائے تنقلات و فواکہ و عطریات را خواجہ خواصان داروغہ خاصہ در دیوان عام بردہ بجہت امرائے عظام و مقربان بارگاہ ... بفرستند۔[1]

اسی طرح اپنے بیٹے مغل علی خاں کی شادی میں قاسم علیخاں نے تحائف ساچق میں خشک میوے اشیائے خوردنی پچاس خوان رنگ برنگ اور قسم قسم کے کپڑے، عطریات، ہار اور پان خانۂ عروسی کو بھیجے تھے۔[2]

---

[1] صحیفۂ اقبال۔ ص ۳۱ (الف)

[2] گلزار شجاعی ص ۲۲۲ اپنے لڑکے شجاع الدولہ کی شادی میں نواب صفدر جنگ نے رسمی چیزوں کے علاوہ پندرہ سو چاندی کے پیالے بھی بھیجے تھے۔ اخبار محبت ص ۴۸۰۔ اسی طرح نواب آصف الدولہ کی شادی کے موقع پر رسم ساچق اعلیٰ پیمانہ پر ادا کی گئی تھی۔ "ساچق باتمام جلوس کہ قریب پنجہزار تھالیہ گلی نقاشی گوناگوں و چند ازاں از نقرہ پُر از میوہ و نقل و خوانہائے لوازمات، و قند و ہار گل و برگ تنبول جمع یکجا (کذا) طلا و نقرہ و شیشی ہائے عطر و پھلیل و کشتیہائے پوشاک نفیس و جواہر کہ تعداد آں بہ ہزاراں می رسید و قریب دو ہزار تخت و چوکی وغیرہ گلکاری از موم و کاغذات آرائش و ہر گونہ اقسام لوازمات کہ از اندازہ شمار بیروں بود، بہ تمام شوکت و حشمت نواب شجاع الدولہ بخانہ شولہ پوری زوجہ قمر الدین خاں بُرد۔ گلزار شجاعی ص ۴۰۹

[3] ہفت تماشا۔ ص ۱۴۳، گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۴، رسوم دہلی ص ۱۰۷ - ۱۰۹

Observations etc, P.P. 2-5?-

حنابندی | ساچق کے روز یا اگلے دن یا اس کے دو تین دن بعد اگر کوئی خاص وجہ مانع نہ ہوا تو شب حنابندی قرار پاتی تھی[1]

اس کا طریقہ یہ تھا کہ دولہن کے گھر سے اس طرف کے لوگ دولھا کے واسطے مہندی اس صورت میں لائے تھے کہ آرائش کے تختے جو ساچق کے روز دولہا کے گھر سے گئے تھے، اسی جگہ چھوڑ دئے جاتے تھے، کیوں کہ قاعدہ یہ تھا کہ واپسی کے وقت داماد کے ساتھ آرائش واپس نہیں آتی[الف] بلکہ حنابندی کی رات کو دولہن کے گھر سے اس کے گھر پہونچا دیتے تھے تاکہ شادی کے روز فریق ثانی اسے دوبارہ برات کے ساتھ لے کر آئے، اور دیگر سامان مثلاً نقارہ، ضروری ساز و سامان و آرائش و آتش بازی کے ہمراہ بھائی اور دولھا کے ہمراہی، دوسرے عورت و مرد اور رقص کرنے والی عورتیں آگے آگے ہوں، لیکن دولھا کے ماں باپ اور بڑا بھائی وغیرہ جو عمر کے لحاظ سے اس کے باپ، کے برابر ہوں، حنا کے ساتھ نہیں جاتے تھے بلکہ ساچق کے روز اور شادی کی رات کو بھی مجلس میں نہیں بیٹھتے تھے مختصر یہ کہ حنا پہونچنے کے بعد دولہا کو زنان خانے میں بلاتے تھے تاکہ رشتے کی سالیاں اس کے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگائیں اور جب وہ مہندی لگا چکتیں تو دولھا کے لئے ضروری تھا کہ کچھ روپے بطور نیگ انہیں دے۔ اگر ان میں سے کوئی دولہا سے بڑی ہوتی تو وہ دولھا کو سلامی میں روپے دیتی۔

علاوہ ازیں مہندی کے ساتھ دولہا کے لئے وہ جوڑا بھی جاتا تھا جو وہ شادی کے دن پہن کر فریق ثانی کے گھر آتا تھا۔ اس جوڑے میں عام طور پر عہد مغلیہ کے درباری وضع کا خلعت، شملہ جیغہ، سرپیچ اور مرصع کلغی ہوتی تھی اور اگر لڑکی والے صاحب ثروت ہوتے تھے تو موتیوں کا ہار اور سونے کا سہرا بھی ہوتا تھا[2]۔ مہندی کے طباقوں کے علاوہ سو پچاس طباقوں میں ملیدہ

[الف] کلیات سودا۔ جلد دوم ص ۱۶۱۔ [1] گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۴، ہفت تماشا ص ۱۴۳ نیز ملاحظہ ہو:۔ نادرات شاہی ص ۱۰۸، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۲۲، ۱۲۴، [2] گذشتہ لکھنؤ "ان طباقوں میں" سبز و سرخ شمعوں کو نصب کر کے روشن کر دیتے ہیں اسی طرح کے مہندی کے بہت سے طباق روشن ہوتے ہیں جو مہندی کے جلوس میں ایک خاص شان اور آن بان پیدا کر دیتے ہیں ص ۳۵۴ نیز Observations etc. P. 200

بھی ہوتا تھا جو خرموں کو کوٹ کر بنایا جاتا تھا[۱]

رقص و سرود حنابندی کی حالت میں باہر دولہا والوں کے سامنے مردانہ مجلس میں ڈومنیاں سرود بدھائی گاتی تھیں۔ اس موقع پر اور شادی کے دوسرے موقعوں ستھنیاں بھی گائی جاتی تھیں اس رات کو اس مجمع کی ہر عورت حسب خواہش دولہا کو فحش باتیں سناتی تھی۔ کوئی شخص اس کی اس حرکت پر مزاحم نہیں ہوتا تھا[۲]۔ ضروری مراسم کے بعد اسی طرح شربت پلایا جاتا تھا جس طرح دولہا والوں کی طرف سے سسرال والوں کو شربت پلایا جاتا تھا اور تھالی میں روپے لے کر سمدھن کو

---

۱ گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۳۵۴

۲ ان گیتوں میں اکثر گالیاں موزوں کی جاتی تھیں۔ اکثر ذومعنی فقرے ہوتے تھے یعنی ان کے دو پہلو ہوتے تھے۔ ایک پہلو سے بدتہذیبی اور دوسرے سے تہذیب ظاہر ہوتی تھی۔ مرزا قتیل نے ان گیتوں کی تفصیل ان الفاظ میں لکھی ہے:-

"ستھنی ہندی کے چند الفاظ ہیں جن کا مجموعہ خاص وزن اور قافیہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بول بہت فحش ہوتے ہیں اور مردوں کے لئے مخصوص ہیں۔ گانے کے وقت عورتیں جس شخص کا نام چاہتی ہیں، اس میں شامل کر لیتی ہیں بعض کا کہنا ہے کہ یہ امیر خسروؒ کی ایجاد ہے ... لیکن امیر خسروؒ کے بعد دوسرے لوگوں نے ستھنیاں اختراع کی ہیں اور اب بھی موزوں کرتے ہیں، یہ مردوں پر موقوف نہیں۔ عورتیں بھی فحش الفاظ جمع کر کے ستھنیاں موزوں کر لیتی ہیں اور اس میں برادری اور محلہ کے وضیع و شریف مردوں، اور عورتوں، نیز نوکروں، غلاموں، اور لونڈیوں کے نام بھی شامل کر لیتی ہیں اور باواز بلند بے دھڑک گاتی ہیں، اگر اس زمانے میں یہ عورتیں کسی ضرورت سے لڑکی کے گھر یا کسی دوسری جگہ جاتی ہیں تو سر برہنہ اور بے پردہ ہو جاتی ہیں اور کوچہ و بازار میں ہر دس قدم پر بیٹھ بیٹھ کر ایک فحش ستھنی گاتی ہیں اور آگے بڑھ جاتی ہیں"

برائے تفصیل ملاحظہ ہو ہفت تماشا ص ۱۱۶-۱۱۷ اسودانے بدھاوا بدھائی۔ مبارکبادی اور شہانے

(باقی برصفحہ ۶۶ پر)

دے دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ واپس آجاتے تھے۔

شاہ عالمؒ ثانی نے خاندان مغلیہ میں شادی کی دیگر رسموں میں 'بیاہ کی مہندی' کے عنوان سے اس رسم کے لوازمات کو اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے۔

آرائش کا ساتھ ہونا

باجت نوبت دوارے موت کہو جن، دیکھے چاؤ سو بھا حضرت پیر دستگیر کی
نیکے جواہر کے خوانن میں بنائے دھری روشن بھی کیا ایسی زندہ پیر کی
تکما کی جھالریں لگی ہیں خوان پوش میں تیسی بنی ہے بہار زرن کے چیر کی
کیسی ہی پیاری آج شاہ عالم نے مہندی بنائی کیا اچھی تدبیر کی

سمدھنوں کا راستہ روک کر کھڑا ہونا

دیکھن نکسیں مہندی اکبر شاہ کی سب نار بنی پہ یاں
سب سمدھن مل دوار روک کھڑیں لے ہاتھوں چھریاں

گانا بجانا اور مبارکباد دینا

آج مہندی مرزا اکبر شاہ پیارے بنے کی دیکھ کیسی نیکی بن آئی
اچھی جگمگات، روشنائی رنگا رنگ کی سب گنی گائے بجائے دیت بدھائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نامی گیتوں کا ذکر کیا ہے۔ کلیات سودا۔ جلد دوم ص ۱۶۱، ۲۰۸، ۲۰۰، ۵۳۔ ہفت تماشا ص ۱۱۶، ۱۱۷

۵۴ برائے تفصیل ملاحظہ ہو ہفت تماشا۔ ص ۱۴۳۔ چہار گلزار شجاعی ص ۲۱۱، ۲۰۵۔ کلیات سودا جلد دوم ص ۲۰۰، ۲۶۰، ۲۶۲، ۲۱۹، ۱۸۳، ۱۶۵، ۱۶۱، ۱۶۰۔ مثنوی میر عبد الجلیل بلگرامی ص ۹ ب

Olservatonsetc P. 202 -

(حاشیہ صفحہ ہذا)

۱؎ نادرات شاہی۔ ص ۱۲۳، ۱۱۹، ۱۲۲۔

۲؎ ایضاً ص ۱۱۳، کلیات سودا۔ ج ۲۔ ص ۲۲۰، ۲۲۹۔

۳؎ ایضاً ص ۱۱۹۔

نوشہ کے مہندی رچانا اور رقص و سرود ہونا

اے ری مائی، گائے بجسائے آنند سوں رجھاؤ
اکبر شاہ کی مہندی اینک، جتن سوں رچاؤ[1]

اس موقع پر غربا میں خیرات (دان) بھی ہوتی تھی۔

اے ری سکھی۔ چلو مہندی دیکھنے پیارے بنے کی انوٹھی
سب گئی مل دیبو مبارک، دان پا بھر موٹھ دان پا بھر موٹھی[2]

برات

دولہا کی تیاری اور برات کی روانگی سے قبل بہت سی رسمیں عمل میں آتی تھیں۔ سودا نے ان رسموں کا حضرت قاسم کے بیاہ کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ مثلاً

بندھوار | دولہا دولہن کے گھروں کے دروازوں پر آم کے پتوں کی مالائیں بنا کر شگون کے لئے آویزاں کرتے تھے۔[3]

"یہ بندھوار شادی کی بندھی دولہا دلہن کے گھر"[4]

منڈوا[5] | لڑکے کو عروسی لباس پہنانے اور دولھا بنانے سے پہلے منڈوا کے نیچے بٹھاکر نہلایا جاتا تھا، اور اس کام کو نائی کرتا تھا جو میراثی کہلاتا تھا۔

"منڈھے کے نیچے نوشہ کو نہانے کی نہ دی فرصت"[6]

---

[1] نادرات شاہی ص ۱۰۸ [2] نادرات شاہی ص ۱۱۵

[3] ہفت تماشا۔ ص ۱۱۶ - ۱۱۷ [4] کلیات سودا ج ۲ ص ۱۶۲

[5] ۔ لکڑی کے چار کھمبے گاڑ کر اور اس کے اوپر پتوں یا کپڑے سے چھپایہ کر دیتے تھے۔ ہندوؤں میں اب تک یہ رسم جاری ہے اور دیہات کے مسلمان بھی منڈوا کے نیچے دولہا کو نہلاتے ہیں۔

[6] کلیات سودا۔ جلد دوم۔ ص ۲۰۸، ۳۴۳، ۲۱۹، ۲۲۹۔

نہانے سے قبل جو لباس نوشہ کے بدن پر ہوتا تھا وہ نائی کو دے دیا جاتا تھا۔[۵۱]

تیل چڑھانا | غسل سے پہلے نائن نوشہ کے جسم پر تیل ملتی تھی اور یہ رسم "تیل چڑھانے" کے نام سے موسوم ہے۔[۵۲]

نائن کہے کہ شرم سے دولہا ہے سرنگوں
اب کیوں کر تیل روئے مقدس کو میں ملوں[۵۲]

بعد ازیں گرم پانی سے نوشہ کو نہلایا دھلایا جاتا تھا۔[۵۳]

کنگن[۵۴] باندھنا | نوشہ اور دلہن کی بائیں کلائی میں کنگن باندھا جاتا تھا۔ اس کو "شادی کا ڈورا" بھی کہتے تھے۔ باندھا کنگن تیرے سکھ کرنے کو ہاتھ[۵۵]

سہرا[۵۶] | بری کے دستور کے مطابق جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ نوشہ کا شادی کا جوڑا دلہن کے گھر سے

---

[۵۱] ہفت تماشا۔ ص ۱۱۵ [۵۲] کلیات سودا۔ جلد دوم ص ۱۶۲، ۱۴۳، ۱۶۵، Tribes and Castes, P. 814 نیز ملاحظہ ہو۔

[۵۳] کلیات سودا۔ جلد دوم۔ ص ۲۰۸

[۵۴] ہفت تماشا۔ "یہ بھی ایک رسم تھی کہ ایک انگشتری ریشم میں باندھ کر لڑکی اور لڑکے کو پہناتے تھے اسے کنگنا کہتے تھے۔ ص ۱۱۶ - یہ رسم مایوں بٹھلانے کے دن ادا ہوتی تھی۔ ہفت تماشا ص ۱۱۶۔

[۵۵] کلیات سودا۔ جلد دوم ص ۱۹۰ - ۱۹۲، ۲۱۶ ہفت تماشا ص ۱۱۶۔ Tribes & Castes, P. 814.

[۵۶] آنند رام مخلص نے سہرے کی بناوٹ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

"عبارت است از چیزی که از مروارید یا از مقیش یا از گلہائی سازند و ہنگام عروسی داماد ... بر سر می بندد این رسم ہندوستانی است" مرأۃ الاصطلاح ص ۲۰۵ ب نیز ملاحظہ ہو ہفت تماشا ص ۱۲۶ Observations etc. P. 204

بادشاہوں اور امیروں کے سہرے بڑے قیمتی ہوتے تھے۔ امیر الامرا حسین علی خاں کی شادی کے موقعہ پر اس کے سہرے کی تیاری میں پچیس ہزار روپے صرف ہوئے تھے۔ تذکرہ آرزو (قلمی) ص ۱۱۷۰۔

آتا تھا۔ اور اب بھی آتا ہے اور یہی جوڑا پہن کر وہ شادی کے لئے جاتا تھا۔[۱] اُس زمانے میں یہ جوڑا زرد رنگ کا ہوتا تھا۔[۲] اِس زمانے میں تعلیم یافتہ طبقے میں شیروانی دی جاتی ہے اور رنگ کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا ہے مگر اس زمانے میں بجومی سہرا باندھنے کا وقت بھی مقرر کرتا تھا۔[۳] سہرا باندھنے کے بعد نوشہ کے گلے میں پھولوں کے ہار اور گجرے ڈالے جاتے تھے۔[۴] دیگر کپڑوں کے علاوہ اس کے کندھوں پر ایک قیمتی شال بھی ڈالی جاتی تھی۔[۵] سر پر پگڑی باندھی جاتی تھی۔

زیورات | صاحب جاہ وحشمت گھرانوں میں نوشہ کو زیورات بھی پہنائے جاتے تھے۔ بادشاہو اور امیروں کے ہاں اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اپنی شادی کے موقع پر فرخ سیر بادشاہ نے قسم قسم کے جواہرات، پکھراج اور ہیرے، بھجبند، گلوبند اور انگوٹھیاں پہنی تھیں۔ نچلے اور متوسط طبقے اور دیگر پیشہ وروں کے ہاں بالعموم نوشہ کے گلے میں طوق یا ہنسلی اور ہاتھوں میں کڑے ڈالے جاتے تھے اور ہاتھ میں لوہے کا کوئی ہتھیار یا کٹار ہوتی تھی۔[۶]

---

[۱] مرآۃ المسرفین ص ۷۴، گزشتہ لکھنؤ ص ۳۵۴ کلیات سودا ج ۲۔ ص ۲۲۹ برائے لباس ملاحظہ ہو۔

observation etc P. 204

[۲] ہفت تماشا۔ ص ۱۱۵، ۱۴۶، دیوان مصحفی ج ۲ ص ۱۲۹ الف و ب

[۳]۔ کلیات سودا جلد دوم

"کس ساعت میں باندھا سہرا جن نے تیرا سر کٹوایا" ص ۱۹۰

کپڑے ہوتے جو پہننے کے لئے بیاہ کی رات

کیا گھڑی تھی وہ کہ نوشہ کی ہوئی قطعہ جات ص ۱۹۸

[۴] کلیات سودا جلد دوم ۱۸۴، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۸، ۲۶۰، ۲۶۳ [۵] کلیات سودا۔ جلد دوم ۱۸۴، ۱۹۷، [۶] مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی ص ۱۲ ب، ۱۳ الف۔ نیز ملاحظہ ہو۔

(باقی ص ۷ پر)

مختصر یہ کہ جب دولھا شادی کا جوڑا پہن لیتا اور دوسری رسمیں ادا ہو جاتیں تو اسے مسند پر بٹھا دیا جاتا اور وہ عورتوں کے رقص کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ جب ناچنے والیوں میں سے ایک عورت ناچتے ناچتے تھک جاتی تھی تو اس مجمع کا منتظم جسے بھڑوا کہتے تھے، مجلس کے کسی معمر آدمی کے اشارے پر اسے بیٹھنے کا حکم دیتا تھا، عطر، پان اور دھنیا جو چاندی کے برتنوں میں ہوتی تھی۔ پیش کرے اور دولھا کے سوار ہونے کے وقت تک یہ ہنگامہ اسی طرح جاری رہتا تھا۔ [۵۱]

جب برات کا ساز و سامان تیار ہو جاتا تو خاندانی رسم کے آئین کے مطابق گھوڑے یا ہاتھی بالعموم گھوڑے پر، مع شہ بالا[۵۳] کے سوار کر کے بڑے تجمل کے ساتھ یعنی کاغذ کے بنے پھولوں، جھاڑوں اور تختوں کی آرائش روشنی، آتشبازی اور ساز و نوبت خانہ کی قسم کی دوسری چیزوں کے ساتھ دولہن کے گھر کے لئے روانہ ہو جاتے تھے، عام طور پر آدھی رات کے بعد ہی برات روانہ ہوتی تھی۔[۵۴] یہ بات دھیان میں رکھنی چاہئے کہ ہندوؤں کے ہاں عام طور پر پھیرے صبح کے وقت پھرتے تھے اور اسی لحاظ سے مسلمانوں کے ہاں بھی نکاح صبح کو ہوتا تھا۔ دیہاتوں میں ایسا بھی یہی رسم ہے :-

(باقی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹)

Mamoirs of Delhi and Faizabad, III, P. 238

۵۰ کلیات ہدایت (قلمی) ص ۳۲۴

(حاشیہ صفحہ ہذا)

۵۱ ہفت تماشا۔ ص ۱۴۶

۵۲ دولھا کو گھوڑے پر سوار کرنے کی رسم خالص ہندوستانی تھی۔ عبدالرزاق بانسوی کا بیان ہے "مناکح را موافق رسم ہندوستان بر اسپ سوار کردند" ملفوظ رزاقی ص ۸۵ ۔ ۵۳ ہفت تماشا۔ دولھا سے کم عمر کے کسی لڑکے کو بھی اس کے پیچھے گھوڑے پر بٹھاتے ہیں۔ اس لڑکے کو ترکی میں ساقدوش اور ہندی میں شہ بالا کہتے ہیں ہفت تماشا ص ۱۱۱ ۵۴ گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۳۵۲ نیز Tribes & Castes, I, P. 816.

ادبیات

غزل

(جناب الم مظفر نگری)

دل تو ہے جرأتِ نظارہ بڑھانے کے لئے
آپ تیار تو ہوں جلوہ دکھانے کیلئے

یہ نہ سننے کے لئے ہے نہ سنانے کیلئے
داستاں عشق کی ہے دل میں چھپانے کیلئے

منزلِ عشق میں ایسا بھی مقام آتا ہے
کھوئے جاتے ہیں جہاں ہم انھیں پانے کیلئے

ہو نہ جائے کہیں برہم یہ نظامِ ہستی
وہ سنورتے ہیں الٰہی کہیں جانے کیلئے

برقِ خاطف سے چمن اب نہ رہیگا محفوظ
خونِ ناحق نہ تھا پھولوں میں سجانے کیلئے

جس کو بھی دیکھئے ہستی میں ہے پابندِ سفر
کوئی جانے کے لئے اور کوئی آنے کے لئے

شعلۂ غم کو بجھائیں گے یہ آنسو کیونکر
یہ تو کم بخت ہیں اور آگ لگانے کیلئے

نغمہ چھیڑوں کوئی یا اذنِ فغاں دوں دلکو
کوئی تقریب تو ہو ان کو بلانے کے لئے

یہ تو آساں ہے کہ گرتوں کو گرادے کوئی
حوصلہ چاہیے، گرتوں کو اٹھانے کیلئے

سُن کے آوازِ درا قافلۂ ہستی میں
جاگ جاتا ہوں میں سوتوں کو جگانے کیلئے

نہ سہی ذکرِ وفا تذکرۂ دل ہی سہی
کوئی عنوان تو ہو میرے فسانے کیلئے

اس حقیقت سے الم اہلِ نظر ہیں واقف
حسنِ تدبیر ہے تقدیر بنانے کے لئے

از جناب افتخار الحسن صاحب عنوان چشتی لیکچرار معتمد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

وحشی ہوں، آبدیدہ ہوں، دامن دریدہ ہوں!
کوئی تو بات ہے کہ میں آفت رسیدہ ہوں

یارو! میں دشمنوں سے بھی اب خوش عقیدہ ہوں
ہاں خود سے بھاگتا ہوں کہ میں خود گزیدہ ہوں

میری شکستگی مرا انعام بن گئی!!
میں اپنی ذات ہی پہ قبائے دریدہ ہوں

مجکو جو دیکھنا ہے تو ہر زاویے سے دیکھ
گل پیرہن ہوں پھر بھی خزاں آفریدہ ہوں

تو ہی نہیں ہے نکہتِ برباد زندگی!
میں بھی رُخِ حیات کا رنگِ پریدہ ہوں

Registerd No. D. 183

JULY 1969

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

حلیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد ٦٣ | جمادی الاول ١٣٨٩ھ مطابق اگست ١٩٦٩ء | شمارہ ٢

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

۲۱ر جولائی ۶۹ء کا دن دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ کیونکہ یہی وہ عظیم دن ہے جس کی اول ساعتوں میں بنی نوع انسان کے دو افراد نے فضا اور خلا میں ڈھائی لاکھ میل کی مسافت طے کر کے کرۂ قمر کی سطح پر پہلی بار قدم رکھا۔ اس سفر کا آغاز اور انجام اور سکنڈ سکنڈ کے حساب سے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق انتہائی کامیابی کے ساتھ اس پورے منصوبہ کی تکمیل اور گھر گھر ٹیلی وژن کے ذریعہ اس مہم کی ایک ایک بات کا مشاہدہ اور معائنہ یہ سب کچھ بے شبہ انسان کی قوتِ اکتشاف و تحقیق کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس کو اس قبائے عظمت و افتخار کا تکمۂ زریں کہا جا سکتا ہے۔ یہ کارنامہ اگرچہ ایک خاص ملک اور قوم کا ہے لیکن انسانیت کے رشتہ سے تمام دنیا میں اس پر قلبی مسرت کا اظہار کیا جا رہا ہے لیکن ہمیں کہنے دیجئے کہ اس پر سب سے زیادہ مسرت کا حق مسلمانانِ عالم کا ہے کیونکہ دنیا میں قرآن ہی وہ سب سے پہلی کتاب الٰہی ہے جس نے انسان کو خلیفۃ اللہ کہکر اسے سب مخلوقات سے اعلیٰ و اشرف قرار دیا اور جس نے بار بار اعلان کیا کہ پوری کائنات ارض و سما انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے اور اس کو تمام اسماء یعنی حقائق اشیا کا علم عطا فرما کر اس لائق بنایا گیا ہے کہ وہ ان سے انتفاع کرے اور اپنی خدمت کا کام لے۔ اس بنا پر نوامیس فطرت کی پردہ کشائی کی راہ میں ترقی کا ہر قدم قرآن کے اس اعلان کی صداقت کا بین ثبوت ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ چاند پر انسان کی پہنچ انسان کی علمی اور عقلی ترقی کی آخری منزل نہیں ہے اور اس سے بھی آگے جانا ہے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ایک ترجمانِ حقیقت نے جب کہا تھا کہ

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

تو اس نے فقط شاعری کی تھی۔

لیکن یہی ترقی انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی بھی ہو سکتی ہے اگر انسان نے عالم بالا میں اپنی ان

فتوحات کے باوجود خود اپنی زندگی کی شب تاریک کو سحر اور اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علم وعقل میں غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کے باوجود اگر انسان کا ضمیر بیدار نہ ہوا اور اسے عرفان ویقینِ روحانی وباطنی میسر نہ آیا تو اس کی یہ سب ترقیاں اس کی خودکشی کا سب سے زیادہ موثر حربہ ثابت ہوں گی۔ فھل من مدکر۔

آج کل یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبا کے لئے تعلیمی مقاطعہ، انتظامیہ کے خلاف جلسے جلوس اور مظاہرے اور توڑ پھوڑ یہ سب روزمرہ کے مشاغل ہیں جن کا تذکرہ آئے دن اخبارات میں آتا رہتا ہے۔ لیکن سخت افسوس اور تشویش کی بات ہے کہ اب یہ وبا مدارس عربیہ کے حرم تک بھی پہونچ گئی ہے۔ چنانچہ گذشتہ مہینہ دار العلوم دیوبند میں جو کچھ ہوا اور جس کی وجہ سے پولس کو مداخلت کرنی پڑی اور مدرسہ غیر معین مدت تک کے لئے بند کر دیا گیا وہ انتہائی افسوسناک اور قابل مذمت ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس سے صرف نظر کر لیجئے کہ علوم جدیدہ کی درسگاہوں اور علوم اسلامیہ و دینیہ کی تعلیم گاہوں دونوں میں نصاب تعلیم، مقصد و منہاج، ماحول اور سوسائٹی کے اعتبار سے کیا فرق ہے۔ اور صرف یہ دیکھئے کہ ایک معمولی ضابطہ اخلاق کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ معاملہ مزدوروں اور ملازمین کا ہو یا طلبا کا۔ ان لوگوں کو شکایات ہوتی ہیں تو وہ انھیں محضرنامہ کی شکل میں انتظامیہ کے سامنے پیش کرتے ہیں، اس پر گفتگو کرتے ہیں اور اگر یہ گفتگو ناکام ہوتی ہے تو چند روز کا نوٹس دے کر اسٹرائک وغیرہ شروع کرتے ہیں۔ لیکن اس عام ضابطہ کے برخلاف دیوبند میں جو کچھ ہوا بالکل اچانک اور دفعۃً وبغتۃً ہوا اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ الاماں و الحفیظ، طلبا نے مدرسہ کی عمارتوں اور درسگاہوں پر قبضہ کر کے اساتذہ اور عملہ کو بے دخل کر دیا، مدرسہ کے دروازوں پر پہرہ بٹھا دیا کہ کوئی شخص ان کی اجازت کے بغیر نہ اندر داخل ہو سکتا تھا اور نہ باہر جا سکتا تھا۔ جو طالب علم ان لوگوں کی مجلس عمل کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے ان کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ اور اس طرح گویا طلبا نے اپنی ایک متوازی حکومت مدرسہ کے اندر قائم کر لی تھی۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ جب انتظامیہ کی طرف سے

افہام و تفہیم کی تمام کوششیں ناکام رہیں تو آخر مجبور ہو کر پولیس کی امداد طلب کرنی پڑی اور پھر جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ طلبا کا کوئی مطالبہ نہ تھا۔ نہیں! تھا! اور ان کے مطالبات اور شکایات میں سے بعض بجا بھی ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مطالبات منوانے اور شکایات کے دور کرانے کا یہ کونسا طریقہ تھا جو انھوں نے اختیار کیا۔ شکایات کا پانی جب سر سے اونچا ہوجائے اور ان کے تدارک کی کوئی آئینی تدبیر کارگر نہ ہو تو اس حالت میں محض تعلیمی مقاطعہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن اس نوع کی بغاوت کے لئے کبھی کسی حالت میں کوئی وجہ جواز پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس بنا پر پولس سے استمداد ناگزیر تھی اور مجلس شوریٰ کی تجویز کے نفاذ کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔

جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی!

بہرحال جو شدنی تھا وہ ہوکر رہا۔ اب اس پر ماتم یا آہ و فغاں عبث ہے۔ آئندہ کے لئے دارالعلوم دیوبند کے مفاد اور اس کی اصلاح و بقا کے نقطۂ نظر سے کمالِ خلوص اور دیانت داری کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ ایشیا کی یہ عظیم دینی درسگاہ جلد از جلد معمول کے مطابق کام کرنے لگے۔ اس سلسلے میں یہ دیکھکر سخت افسوس ہوتا ہے کہ بعض حضرات نے اس واقعہ کو دارالعلوم یا اس کے بعض ذمہ دار اربابِ اہتمام و انتظام کے خلاف اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنالیا ہے اور انھوں نے اپنے بیانات میں اس حادثہ کی پوری ذمہ داری اہتمام یا شوریٰ کے سر ڈالدی ہے۔ یہ طریقہ ہرگز دارالعلوم کے مفاد میں نہیں ہے اور اس لئے ہم اس قسم کے بے سروپا اور مضرت انگیز بیانات پر اپنے رنج اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

ان سطور کی تحریر کے بعد دفترِ اہتمام سے اطلاع آئی ہے کہ "احاطۂ دارالعلوم سے پولیس ہٹالی گئی ہے دفاتر دارالعلوم میں معمول کے مطابق کام شروع ہوگیا ہے اور تعلیم کی ابتدائی کلاسیں بھی کھول دی گئی ہیں"۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ امید ہے جلد ہی دورے کے اسباق بھی شروع ہوجائیں گے اور پھر رفتہ رفتہ باقی سبق بھی۔ اس وقت کہ آخری سطریں لکھی جارہی ہیں تازہ اطلاع آئی ہے کہ ۱۱ اگست سے دورے کے سبق بھی شروع ہوگئے ہیں۔

سراج الدین ابن الملقن

از جناب ڈاکٹر حافظ عبد العلیم خاں صاحب لیکچرر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۲)

فقہ :

۱۔ عمدۃ المحتاج فی شرح المنہاج[1]: امام نووی (م ۶۷۶ھ) کی کتاب منہاج الطالبین فقہ شافعی کی بنیادی اور اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ چونکہ یہ کتاب بہت مختصر ہے اس لیے مختلف علماء و فقہاء نے اس کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں۔ مثال کے طور پر علی بن عبد الکافی تقی الدین السبکی (م ۷۵۶ھ) نے اس کی ایک مبسوط شرح لکھنی شروع کی تھی لیکن اتفاق سے وہ مکمل نہ ہوسکی اور اس کو ان کے لڑکے بہار الدین السبکی (م ۷۷۳ھ) نے مکمل کیا۔ اُن کے علاوہ کمال الدین محمد بن عیسی الدمیری (م ۸۰۸ھ)، نجم الدین محمد بن عبد اللہ المعروف بابن قاضی عجلون (م ۸۲۶ھ) محمد بن احمد المحلی (م ۸۶۴ھ) القاضی زکریا الأنصاری (م ۹۲۶ھ) اور ابن خطیب الدھشتر (م ۸۳۴ھ) نے بھی اس کی شرحیں لکھی ہیں۔

ابن الملقن نے بھی اس کی ایک شرح لکھی اور اس کا نام عمدۃ المحتاج فی شرح المنہاج رکھا۔

۱۔ الضور ۶/۱۰۲، ابن قاضی شہبہ: طبقات الشافعیہ نمبر ۷۳۹؛ لحظ الالحاظ ص ۲۰۰، البدر الطالع ۱/۵۰۸ (اس میں اس کا نام تحفۃ المنہاج الی ادلۃ المنہاج لکھا ہے)

ان کی یہ شرح آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور ان کی بہترین تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔ اس میں شرح و بسط کے ساتھ مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ شرح ان کے زمانہ ہی میں اتنی مقبول ہو چکی تھی کہ ان کے معاصر شہاب الدین الاذرعی (م ۷۸۳ھ) نے منہاج کی شرح لکھتے وقت اس سے استفادہ کیا تھا۔

افسوس ہے کہ اس کا کوئی مکمل نسخہ میرے علم کے مطابق دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اس کی مختلف جلدیں مختلف کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

اس کی پہلی جلد کتب خانہ چسٹر بیٹی ڈبلن میں محفوظ ہے جس میں ۲۴۱ اوراق ہیں اور اس کی کتابت محمد بن یعقوب بن محمد نے بحیات مصنف ۷۹۵ھ میں عمدہ خط نسخ میں کی ہے[1]۔ اس کی پہلی جلد کا ایک اور مخطوطہ چسٹر بیٹی لائبریری میں محفوظ ہے جو بقول مرتب فہرست نویں صدی ہجری کا نوشتہ ہے۔ اس میں ۲۳۰ اوراق ہیں[2]۔

اس کی چوتھی جلد کا ایک نسخہ بھی چسٹر بیٹی لائبریری میں موجود ہے جس میں ۲۲۷ اوراق ہیں۔ صاف عالمانہ خط نسخ میں، احمد بن محمد بن احمد الشربی نے ۱۷ رمضان ۸۵۶ھ میں اس کی کتابت کی ہے[3]۔

اس کی ساتویں جلد کا ایک مخطوطہ بھی وہیں محفوظ ہے۔ جس میں تاریخ کتابت درج نہیں ہے بقول مرتب فہرست نویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے[4]۔

اس کی ایک جلد کتب خانہ ملی پیرس میں محفوظ ہے جو ۸۵۵ ہجری میں لکھی گئی تھی اور

۱۔ نمبر مخطوطہ (۳۹۴۶) A. J. Arberry: A. Handlist of Arabic Mss at chester Betty Library Dublin. Vol. 4: 68

۲۔ نمبر مخطوطہ (۳۳۶۱) فہرست کتب خانہ چسٹر بیٹی ڈبلن ۴۸/۲

۳۔ نمبر مخطوطہ (۴۶۸۷) فہرست کتب خانہ چسٹر بیٹی ۵۷/۶

۴۔ نمبر مخطوطہ (۳۳۶۶) فہرست چسٹر بیٹی ۵۰/۲

۲۲۶ اوراق پر مشتمل ہے[1]۔

اس کی تین جلدیں زیر رقم ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳ مدرسۃ الملا زکریا موصل میں محفوظ ہیں[2]۔

۲۔ عجالۃ المحتاج الی توجیہ المنہاج[3]: یہ منہاج الطالبین کی مختصر شرح ہے۔ اس شرح کا سال تصنیف ۷۶۳ھ ہے۔ اس کے دو نسخے رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہیں جو راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں۔ پہلا نسخہ زیر رقم (۲۴۷۷ فقہ شافعی) ۵۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۳۱ سطریں ہیں۔ محمود العراقی التُستری نے اس کی کتابت عمدہ اور خوشخط نسخ میں کی ہے۔ اس کے متعدد صفحات پر حواشی ہیں کچھ صفحات پر کرم خوردگی کی وجہ سے کاغذ چسپاں کیا گیا ہے۔ ترقیمہ میں یکشنبہ ۲۵ شوال کے بعد سن نہیں پڑھا گیا جس سے اندازہ ہوتا کہ یہ نسخہ کب لکھا گیا۔ اس کا دوسرا مخطوطہ جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسی لائبریری میں زیر رقم (۳۱۷ - ۳۱۸) محفوظ ہے۔ علی بن محمد البصروی الشافعی نے عمدہ خط نسخ میں ۸۷۵ھ میں مدرسہ امینیہ میں اس کی کتابت کی اور مصنف کے اصل مسودے سے اس کا مقابلہ کیا۔ اس کی دوسری جلد میں ۱۹۵ اوراق ہیں۔ اس کی کتابت عمر بن محمد بن عمر بن ابی بکر الشافعی الخلیلی نے ۱۲ صفر ۸۵۴ھ میں کی تھی[4]۔

اس کا تیسرا نسخہ دو جلدوں میں (۹۶ - ۹۷) کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ ہے[5] جو ۹۱۴ھ کا نوشتہ ہے۔ اس کا چوتھا نسخہ پرنسٹن لائبریری کے گیرٹ کلکشن میں محفوظ ہے جو

۱۔ نمبر مخطوطہ (۱۰۰۹) فہرست کتب خانہ ملی پیرس

۲۔ داؤد چلبی: فہرس المخطوطات الموصل ص ۱۹۸ - ۱۹۹

۳۔ الضوء ۶/۱۰۲، لحظ الالحاظ ص ۲۰۰ البدر الطالع ۱/۵۰۸ طبقات ابن شہبہ نمبر ۷۳۹

۴۔ فہرست کتب خانہ رام پور ۱/۲۱۴؛ ۲/۳۶۰ - ۳۶۲

۵۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد ۲/۱۱۶۰ - ۱۱۶۱

۲۷۲ اوراق پر مشتمل ہے اور آخر سے ناقص ہے[1]۔ اس کا پانچواں مکمل نسخہ دو جلدوں میں کتب خانہ چسٹر بٹی ڈبلن میں محفوظ ہے۔ اس کی پہلی جلد ۲۵۴ اوراق پر مشتمل ہے اور اس کی کتابت ابراہیم بن احمد الزرعی نے ۲۷ رجمادی الاولی ۸۵۲ھ میں کی تھی[2]۔ اس کی دوسری جلد ۱۷۶ اوراق پر مشتمل ہے اور اس کی کتابت احمد بن حسن بن زید العقبی نے ۵ رذو الحجہ ۸۷۲ھ میں کی تھی[3]۔ اس کا چھٹا ناقص نسخہ جو ۱۷ اوراق پر مشتمل ہے چسٹر بٹی لائبریری میں موجود ہے۔ جو ۲۳ رشعبان ۸۵۲ھ کا نوشتہ ہے۔ اس کا ساتواں نسخہ جو ۲۳۵ اوراق پر مشتمل ہے۔ برلن (جرمنی) کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ ابتدائی کتاب سے کتاب الجعالۃ تک پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت ۸۶۵ ہجری میں کی گئی[4]۔ اس کا آٹھواں اور نواں نسخہ دار الکتب المصریۃ میں زیر رقم (۱۴۹ و ۱۷۵) محفوظ ہے[5]۔ اس کا دسواں مخطوطہ زیر رقم (۱۸۱) مدرسہ حجیات موصل میں اور گیارہواں نسخہ بھی زیر رقم (۱۸۱) مدرسۃ الملا زکر موصل میں محفوظ ہے[6]۔

۱۔ نمبر مخطوطہ (۱۷۹۱) Hitti P.K: Descriptive Catalogue of the Garrett Collection of Arabic Mss in the Princetoin Library (1938) P 533

۲۔ نمبر مخطوطہ (۳۴۲۳) فہرست چسٹر بٹی ۲/ ۷۷

۳۔ نمبر مخطوطہ (۳۴۸۱) فہرست چسٹر بٹی ۲/ ۹۸

۴۔ نمبر مخطوطہ (۴۵۳۱) Ahlwardt: Verzeichniss Der Arabichen. Handschriften Der Koniglichen Bibliothik Zu Berlin (1897) Vol. 3/531.

۵۔ فہرس دار الکتب المصریۃ ۱/ ۵۲۵

۶۔ فہرس مخطوطات الموصل ص ۱۱۲ — و ۱۹۹

۳۔ البُلغة علی ترتیب المنہاج[1]: اس میں نووی کی منہاج الطالبین کے ابواب کی ترتیب علیحدہ سے کی گئی ہے۔

۴۔ الاعتراضات علی المنہاج[2]: ابن الملقن نے منہاج الطالبین للنووی پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کو یکجا کر دیا ہے۔

۵۔ الاشارات الی ما وقع فی المنہاج من الاسماء والأماکن واللغات[3]: منہاج الطالبین للنووی میں جو اسمار، اماکن اور مشکل لغات آئی ہیں۔ ابن الملقن نے اس کتاب میں انھی کی تشریح کی ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں خالص عربی الفاظ، دخیل الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اعلام پر تعلیقات لکھی گئی ہیں اور تیسرے حصے میں اماکن کو ضبط کیا گیا ہے اور ان پر پوری بحث کی گئی ہے۔ مصنف اس کتاب کی تصنیف سے ۷۴۳ھ میں فارغ ہوچکا تھا لیکن ۷۵۸ھ تک اس میں اضافے کرتا رہا[4]۔

اب تک اس کتاب کے تین مخطوطات کا پتا چل سکا ہے۔ جن میں سے پہلا نسخہ چسٹر بٹی لائبریری ڈبلن میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ عمدہ اور روشن خط نسخ میں لکھا گیا ہے اس میں ۹۷ اوراق ہیں اور اس کی کتابت ۹ شوال بروز جمعہ ۸۴۹ھ میں کی گئی۔ یہ نسخہ اس نسخے سے نقل کیا گیا ہے جس پر مصنف نے اپنے دستخط ثبت کیے ہیں[5]۔ اس کا دوسرا نسخہ مکتبہ طلعت میں موجود ہے۔ اس کا

۱۔ الضوء ۶/۱۰۱، البدر ۱/۵۰۸

۲۔ الضوء ۶/۱۰۱، البدر ۱/۵۰۸

۳۔ البستانی: دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۴/۷۴۔ کشف الظنون ۱۸۷۲
الأعلام ۵/۲۱۸، معجم المؤلفین ۷/۲۹۷

۴۔ لطفی عبد البدیع: فہرس المخطوطات المصورۃ ۲/۱۷

۵۔ نمبر مخطوطہ (۴۵۴۷) فہرس کتب خانہ چسٹر بٹی ڈبلن ۶/۱۵

سن کتابت ۸۸۰ھ ہے یہ نسخہ بھی اس نسخے سے منقول ہے جس پر مصنف نے اپنے قلم سے اضافے کیے ہیں[1]۔ اس کا تیسرا نسخہ اسکندریہ کے کتاب خانے میں محفوظ ہے اور اس کا عکس جامعۃ الدول العربیۃ قاہرہ میں موجود ہے۔ اس میں ۱۸۰ اوراق ہیں لیکن آخر سے ناقص ہے۔ یہ نسخہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کی کتابت سلیمان بن صالح بن عادل الحنبلی نے بحیات مصنف ۷۴۹ھ میں مدرسہ ظاہریہ میں کی تھی[2]۔

۶۔ ایضاح الارتیاب فی معرفۃ ما یتشبّہ ویتصحّف من الاسماء والانساب والکنی والالقاب الواقعۃ فی تحفۃ المحتاج[3]: ابن الملقن نے منہاج الطالبین کی مبسوط شرح لکھنے کے بعد اس کی مختصر شرح تحفۃ المحتاج لکھی اس میں جو اسماء، کنیتیں اور القاب آئے ہیں ان کی تشریح اس رسالہ میں کی ہے۔

اب تک اس کے صرف دو نسخوں کا علم ہو سکا ہے اس کا سب سے اہم نسخہ چسٹر بٹی لائبریری ڈبلن میں محفوظ ہے جس کی کتابت بحیات مصنف ۱۲ رمضان ۷۴۹ھ کو کی گئی۔ یہ رسالہ ۶ اوراق پر مشتمل ہے[4]۔ اس کا دوسرا نسخہ دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے اور اس کا عکس جامعۃ الدول العربیۃ قاہرہ میں موجود ہے[5]۔

۷۔ خلاصۃ الفتاوی فی تسهیل اسرار الحاوی[6]: الحاوی نام سے کئی کتابیں مختلف

۱۔ صلاح الدین المنجد: مجلۃ المعهد المخطوطات العربیۃ (مئی ۱۹۵۷ء) ۳/۲۲۱

۲۔ لطفی عبد البدیع: فهرس المخطوطات المصورۃ ۲/۱۷

۳۔ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ ۴/۷۴ ۔ الاعلام ۵/۲۱۸ ، ایضاح المکنون للبغدادی ۱/۱۵۳

۴۔ نمبر (۳۳۸۲) فہرس کتب خانہ چسٹر بٹی ۲/۵۸

۵۔ لطفی عبد البدیع: فهرس المخطوطات المصورۃ ۲/۳۹

۶۔ حاجی خلیفہ: کشف الظنون ۶۲۵ ۔ الضوء ۶/۱۰۲ ، البدر الطالع ۱/۵۰۸ ، بروکلمان ۲/۹۳ و ذیل ۱/۶۷۹

فنون میں لکھی گئی ہیں۔ نجم الدین عبد الغفار بن عبد الکریم القزوینی (م ۶۶۵ھ) نے فروع فقہ شافعی پر ایک کتاب مرتب کی جس کا نام "الحاوی الصغیر" رکھا۔ یہ کتاب فقہ شافعی کی اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ چونکہ یہ کتاب مختصر ہے اس لیے فقہاء و علماء نے اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں اور کچھ لوگوں نے اسے نظم بھی کیا ہے۔ ان میں سب سے عمدہ ابن الملقن کی یہ شرح ہے۔ اس کے بارے میں حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ حاوی کی خلاصۃ الفتاوی جیسی کوئی شرح نہیں لکھی گئی[1]۔ یہ شرح دو جلدوں میں لکھی گئی تھی۔

اس کی دوسری جلد کا ایک مخطوطہ بخط مصنف خزائن کتب الاوقاف بغداد میں موجود ہے۔ یہ جلد کتاب الوصایا سے شروع ہوتی ہے[2]۔

اس کا دوسرا اہم نسخہ دو جلدوں میں مکتبہ احمد الثالث میں زیر رقم (۸۰۹) محفوظ ہے جس کی کتابت بحیات مصنف ۷۹۲ھ میں کی گئی۔ پہلے حصے کے کاتب کا نام معلوم نہیں دوسرے حصے کی کتابت محمد بن یوسف بن شعیب البعلبکی ابن الاکرومی نے کی ہے۔ اس نسخہ کا عکس جامعۃ الدول العربیہ قاہرہ میں محفوظ ہے[3]۔ اس کتاب کا تیسرا مکمل مخطوطہ دو جلدوں میں مدرسۃ النبی شیث موصل میں زیر رقم ۱۲۸ - ۱۲۹ محفوظ ہے[4]۔ اس کتاب کی جلد اول و ثانی کے کچھ نامکمل نسخے دار الکتب المصریۃ میں زیر رقم (فقہ شافعی ۱۵، ۹۵، ۱۵۳، ۱۱۱۰، اور ۱۹م) محفوظ ہیں[5]۔

۸۔ تصحیح الحاوی[6]: ابن الملقن نے القزوینی (م ۶۶۵ھ) کی الحاوی الصغیر

۱۔ کشف الظنون ۶۲۵

۲۔ اسعد طلس: الکشاف عن مخطوطات خزائن کتب الاوقاف (بغداد ۱۹۵۳) ص ۲۶

۳۔ فؤاد سید: فہرس المخطوطات المصورۃ ۱/۳۰۳

۴۔ داؤد چلپی: فہرس المخطوطات الموصل ص ۲۱۹

۵۔ فہرس دار الکتب المصریۃ ۱/۵۱۳

۶۔ الضوء ۶/۱۰۲؛ البدر الطالع ۱/۵۰۸

میں جو غلطیاں تھیں ان کی تصحیح علیحدہ سے اس کتاب میں کی ہے۔

۹۔ شرح المختصر فی الفروع للتبریزی[1]: مشہور شافعی فقیہ مظفر بن ابی الخیر بن اسمٰعیل امین الدین التبریزی (م ۶۲۱ھ) نے امام غزالی (م ۵۰۵) کی کتاب الوجیز کو سامنے رکھ کر "الفروع" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ ابن الملقن نے اسی کی شرح لکھی ہے۔ اس شرح کے صرف ایک نسخے کا علم ہوسکا ہے جو دار الکتب المصریۃ میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کے کاتب اور سن کتابت کا پتا نہیں[2]۔

۱۰۔ شرح التنبیہ للشیرازی[3]: ابواسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف بن عبداللہ الشیرازی (م ۴۷۶ھ) مشہور شافعی فقہار میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے فقہ شافعی پر کئی مبسوط کتابیں لکھی ہیں انھی میں ایک کتاب "التنبیہ" بھی ہے۔ یہ کتاب ۱۳۲۹ھ میں مصر سے شائع ہوچکی ہے۔ چونکہ یہ کتاب فقہ کی بنیادی اور متداول کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اس لیے مختلف ادوار میں علمار وفقہار نے اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں۔ ابن الملقن نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی کہ اس کی ایک طویل اور مبسوط شرح لکھی جائے۔ چنانچہ انھوں نے چار جلدوں میں اس کی ایک شرح تیار کی جس کا نام بقول حاجی خلیفہ "الکفایۃ" ہے[4]۔ اس کے صرف ایک نسخے کا علم ہوسکا ہے جو دار الکتب المصریۃ میں محفوظ ہے۔ اور ابتدار و انتہا سے پاریدہ ہے[5]۔

۱۔ الضوء ۶/۱۰۲؛ کشف ۱۸۷۹

۲۔ فہرس دار الکتب المصریۃ ۱/ ۵۲۲

۳۔ الضوء ۶/۱۰۱؛ السیوطی: حسن المحاضرۃ ۱/۲۴۹۔ لحظ الالحاظ ص ۲۰۰، البدر الطالع ۱/۵۰۸، کشف ۴۹۱، بروکلمن ۲/۹۲

۴۔ کشف ۴۹۱

۵۔ نمبر (۷۴۴ فقہ شافعی) فہرس دار الکتب المصریۃ ۱/۵۲۱

۱۱۔ غنیۃ الفقیہ[1] : ابن الملقن نے حسب عادت ، ابو اسحاق الشیرازی (م ۴۷۶ھ) کی کتاب التنبیہ کی مبسوط و مفصل شرح لکھنے کے بعد ، اس سے مختصر یہ شرح لکھی ۔ اس کے کسی نسخے کا علم نہیں ہو سکا ۔

۱۲۔ ھادی النبیہ الی تدریس التنبیہ[2] : یہ ابن الملقن کی کتاب التنبیہ للشیرازی کی تیسری شرح ہے جو مذکورہ بالا دونوں شرحوں سے مختصر ہے ۔

۱۳۔ ارشاد النبیہ الی تصحیح التنبیہ[3] : ابن الملقن کی کتاب التنبیہ للشیرازی کی سب سے مختصر شرح ہے ۔ اس کے بھی کسی نسخے کا علم نہیں ہے ۔

۱۴۔ امنیۃ النبیہ فیما یرد النووی فی التصحیح والتنبیہ[4] : ابن قاضی شہبہ نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب کمال الدین النشائی (م ۷۳۵ھ) کی "نکت التنبیہ" کے انداز پر لکھی گئی ہے[5] ۔

۱۵۔ التذکرۃ فی الفروع[6] : ابن الملقن نے یہ کتاب اپنے لڑکے کے لیے مرتب کی تھی اس میں فقہ شافعی کے فروعی مسائل ہیں ۔ اس کے کسی نسخے کا علم نہیں ہے ۔

۱۶۔ جمع الجوامع فی الفروع[7] : ابن الملقن نے فروع فقہ شافعیہ پر یہ مبسوط کتاب

۱۔ الضوء ۶/۱۰۱ ۔ کشف ۴۹۱

۲۔ الضوء ۶/۱۰۱ ۔ کشف ۴۹۱ ۔ البدر الطالع ۱/۵۰۸

۳۔ الضوء ۶/۱۰۱ ۔ کشف ۴۹۱

۴۔ الضوء ۶/۱۰۲ ۔ البدر ۱/۵۰۸ ۔ طبقات قاضی شہبہ رقم ۷۳۹

۵۔ طبقات ابن قاضی شہبہ رقم ۷۳۹

۶۔ کشف ۳۹۲

۷۔ الضوء ۶/۱۰۲ ، البدر الطالع ۱/۵۰۸ ۔ کشف الظنون ۵۹۸

تقریباً ستو جلدوں میں مرتب کی تھی لیکن اس کے کسی نسخے کا پتا نہیں ہے[1]۔

۱۷۔ شرح العمدة فی فروع الشافعیة[2]: امام ابوبکر محمد بن احمد الشاشی (م ۵۰۷ھ) نے فروع فقہ شافعیہ پر "العمدة فی فروع الشافعیة" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ ابن الملقن نے اُسی کی یہ شرح لکھی ہے۔

۱۸۔ الأشباہ والنظائر[3]:

۱۹۔ الکافی[4]: ابن قاضی شہبہ (م ۸۵۱) نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں فقہی مسائل جمع کیے گئے ہیں اور انھوں نے اس میں عجیب وغریب باتیں لکھی ہیں[5]۔

اصول فقہ:

۲۰۔ عمدة المفید وتذکرة المستفید: ابن الملقن کے سوانح نگاروں نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ اصول فقہ پر ایک جامع کتاب ہے۔ اس کا واحد نسخہ چسٹر بٹی لائبریری ڈبلن میں محفوظ ہے جو ۱۶۴ اوراق پر مشتمل ہے اور صاف روشن خط نسخ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے کاتب محمد بن احمد بن العماد الاقفہی الشافعی (م ۸۶۷ھ) ہیں۔ انھوں نے اس کی کتابت ۱۹ جمادی الاولیٰ ۸۲۳ھ میں کی تھی۔ بقول مرتب فہرست A. J. Arberry اس کا کوئی دوسرا

۱۔ میرے خیال میں التذکرہ فی الفروع اور جمع الجوامع دونوں ایک ہی کتاب ہیں۔ کشف الظنون میں غلطی سے علیحدہ علیحدہ ناموں سے لکھ دیا ہے۔

۲۔ ذیل تذکرة الحفاظ للسیوطی ص ۳۶۹، کشف الظنون ۱۱۷۰

۳۔ کشف الظنون ۱۰۰

۴۔ لحظ الالحاظ ص ۱۹۹۔ طبقات ابن قاضی شہبہ رقم ۷۳۹

۵۔ طبقات ابن قاضی شہبہ رقم ۷۳۹

نسخہ دنیا میں موجود نہیں ہے[1]۔

۲۱۔ شرح المختصر لابن الحاجب[2]: ابن حاجب المالکی (م ۶۴۶ھ) نے اصول فقہ پر ایک کتاب مختصر منتہی السؤل والأمل فی علمی الأصول و الجدل کے نام سے لکھی تھی۔ ابن الملقن نے اسی کی شرح لکھی ہے۔

۲۲۔ شرح منہاج الوصول الی علم الاصول[3]: مشہور مفسر قرآن پاک ناصر الدین البیضاوی (م ۶۸۵ھ) نے اصول فقہ پر منہاج الوصول لکھی تھی۔ یہ اسی کی شرح ہے اس کے کسی نسخے کے بارے میں علم نہیں ہے۔

عِلم الحدیث:

۲۳۔ الإعلام بفوائد عمدۃ الأحکام[4]: عبد الغنی بن عبد الواحد بن علی بن سرور المقدسی الجماعیلی (م ۶۰۰ھ) نے عبادات اور معاملات سے متعلق صحیحین میں جو حدیثیں آئی ہیں ان کو اپنی کتاب "عمدۃ الاحکام من کلام خیر الانام" میں جمع کیا تھا۔ یہ کتاب دہلی سے ۱۸۹۵ء میں چھپ چکی ہے۔ ابن الملقن نے اس کی مبسوط اور مفصل شرح لکھی ہے۔ جس سے فن حدیث سے ان کے شغف اور وسعت نظر کا پتا چلتا ہے۔ اس کے جو نسخے اب تک معلوم ہو سکے ہیں ان میں سے کتب خانہ رضا رام پور کا نسخہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ اس کے ترقیمہ سے پتا

۱۔ نمبر ۳۳۳۵ فہرست کتب خانہ چسٹر بٹی ۲/۳۹

۲۔ الضوء ۶/۱۰۲۔ کشف ۱۸۵۶

۳۔ الضوء اللامع ۶/۱۰۲؛ لحظ الالحاظ ص ۲۰۰۔ کشف ۱۸۷۹

۴۔ الضوء ۶/۱۰۲؛ لحظ الالحاظ ۱۹۹؛ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۳/۴۲۲ طبقات ابن قاضی شہبہ نمبر ۷۳۹۔ البدر الطالع ۱/۵۰۸

چلتا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب ۲۲ محرم بروز شنبہ ۷۶۶ھ میں مکمل کی تھی۔ یہ مخطوطہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ابتدا سے ناقص ہے۔ اس کی ابتدار "عنہ مسلمۃ" سے ہوتی ہے۔ اس میں ۲۱۱ اوراق ہیں اور یہ جلد کتاب الجنائز پر ختم ہوجاتی ہے۔ متن کی کتابت عمدہ خط نسخ میں کی گئی ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ تاریخ کتابت ۲ ربیع الثانی ۸۳۸ھ ہے۔ کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ اس کی دوسری جلد کے بھی ابتدائی اوراق غائب ہیں۔ لیکن یہ مخطوطہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کی کتابت بحیات مصنف ۸ ارجمادی الاولیٰ ۷۹۰ھ میں کی گئی اور اس کا مقابلہ مصنف کے اصل نسخے سے کیا گیا[1]۔

اس کتاب کی دوسری جلد کا ایک مخطوطہ چسٹر بٹی لائبریری میں محفوظ ہے جس کو ابراہیم بن محمد بن علی امام الکاملیہ نے بحیات مصنف ۶ر شعبان ۷۹۰ھ میں مصنف کے اصل مسودہ سے نقل کیا تھا۔ اس میں ۲۳۲ اوراق ہیں اور عمدہ خط نسخ میں لکھا گیا ہے[2]۔ اس کا تیسرا نامکمل نسخہ دارالکتب المصریۃ میں زیر رقم (۸۰۵) محفوظ ہے[3]۔

۲۴۔ البدر المنیر فی تخریج الاحادیث والآثار فی الشرح الکبیر[4]:

عبدالکریم بن محمد بن عبدالکریم، ابوالقاسم القزوینی الرافعی (م ۶۲۳) نے امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی مشہور اور متداول کتاب "الوجیز" کی مبسوط شرح "فتح العزیز" کے نام سے کئی جلدوں میں لکھی تھی۔ یہ کتاب "الشرح الکبیر" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ابن الملقن نے "الوجیز" اور "الشرح الکبیر" میں جو احادیث آئی ہیں ان کی تخریج اس کتاب میں کی ہے اور

۱۔ نمبر ۹۴۳-۹۴۴۔ فہرست کتب خانہ رام پور

۲۔ نمبر ۳۲۴۹ فہرست کتب خانہ چسٹر بٹی ڈبلن ۱/ ۱۰۵

۳۔ فہرس الدار ۱/ ۹۰

۴۔ السخاوی ۶/ ۱۰۱؛ لحظ الالحاظ ص ۱۹۹، البدر الطالع ۱/ ۵۰۸

جابجا تشریح بھی کرتے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب سات جلدوں میں مرتب کی تھی۔ افسوس ہے کہ اس کا کوئی مکمل نسخہ میرے علم کے مطابق اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اس کی صرف دوسری جلد برلن (جرمنی) کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ جلد "باب سجود تلاوت الشکر" سے شروع ہوکر "باب صدقۃ التطوع" پر ختم ہوجاتی ہے۔ یہ مخطوطہ ربیع الاول ۸۲۹ھ میں لکھا گیا[1]۔

۲۵۔ **خلاصۃ البدر المنیر[2]:** چونکہ "البدر المنیر" کافی ضخیم ہوگئی تھی اس لیے مصنف نے خود اس کی تلخیص کی تاکہ عوام کو مراجعت کرنے میں آسانی ہو۔

اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے[3]۔ یہ مخطوطہ "کتاب المبادلہ" سے شروع ہوکر "کتاب الصید والذبائح" پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے ترقیمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن الملقن نے اس خلاصہ کو شوال ۷۴۹ھ میں مکمل کرلیا تھا۔ مرتب فہرست کتب خانہ آصفیہ کی رائے میں یہ مخطوطہ تصنیفِ کتاب کے دس بارہ سال کے اندر اندر لکھا گیا ہوگا۔

اس کے دو مکمل نسخے دار الکتب المصریۃ میں زیر رقم (۶۹۹۔ و ۱۴۳ م) محفوظ ہیں جن میں سے ایک نسخہ (رقم ۶۹۹) بحیات مصنف لکھا گیا ہے اور اس کے حاشیہ پر بخط مؤلف بہت سے اضافے درج ہیں۔ کتاب کی پہلی جلد کا ایک اور مخطوطہ بھی وہیں محفوظ ہے[4]۔

۲۶۔ **المنتقی فی مختصر الخلاصۃ[5]:** ابن الملقن نے خلاصۃ البدر المنیر کا یہ ملتقی بھی تیار کیا تھا۔

۱۔ نمبر ۱۳۴۵ فہرست کتب خانہ برلن (جرمنی) ۲/۱۵۱

۲۔ الضوء ۶/۱۰۲ ۔ البدر الطالع ۱/۵۰۸ ۔ کشف ۲۰۰۳

۳۔ فہرست مشروح بعض کتب نفیسہ قلمیہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ۲/۲۰۵

۴۔ فہرس دار الکتب المصریۃ ۱/۱۱۴

۵۔ الضوء ۶/۱۰۱ ۔ البدر الطالع ۱/۵۰۸ ۔ طبقات ابن قاضی شہبہ نمبر ۷۳۹

۲۷۔ التوضیح لشرح الجامع الصحیح[1]: امام بخاری (م ۲۵۶ھ) کی مشہور کتاب "الجامع الصحیح" کی شرح ہے۔ السخاوی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ابن الملقن نے اپنے اساتذہ مغلطای اور قطب الدین الحلبی کی شروح بخاری کو سامنے رکھ کر یہ شرح تیار کی تھی۔ اور جابجا بعض نئی باتیں بھی درج کی ہیں[2]۔ ابن الملقن کے شاگرد ابن قاضی شہبہ (م ۸۵۱) اپنی کتاب طبقات الشافعیۃ میں اس شرح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا نصف اول نصف آخر سے بہتر ہے اور اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ ابن الملقن نے نصف اول کی شرح لکھنے کے بیس سال بعد نصف آخر کی شرح لکھی تھی[3]۔ ابن الملقن نے اس شرح کو بیس جلدوں میں مکمل کیا تھا۔

اس شرح کا کوئی مکمل مخطوطہ میرے علم کے مطابق اس وقت کہیں نہیں ہے اس کی مختلف جلدیں پائی جاتی ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

اس کی پانچ جلدیں دار الکتب المصریۃ میں موجود ہیں[4]۔ اس کی ایک جلد برلن (جرمنی) کے کتب خانے میں محفوظ ہے[5]۔ جرمنی کا مخطوطہ مندرجہ ذیل عبارت سے شروع ہوتا ہے "باب الوضوء من التور" اور "وانما خالف عادتہ فی التباعد"۔ اس شرح کی تین جلدیں "شواہد التوضیح" کے نام سے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ ہیں[6]۔

۱۔ الضوء ۶/۱۰۲، طبقات ابن قاضی شہبہ نمبر ۷۳۹ لحظ الالحاظ ۱۹۹۔ ذیل تذکرۃ الحفاظ للسیوطی ص ۳۶۹۔ کشف ۵۴۷۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۴/۴۷۔ حسن المحاضرۃ للسیوطی ۱/۲۴۹

۲۔ الضوء ۶/۱۰۲

۳۔ طبقات ابن قاضی شہبہ رقم ۷۳۹

۴۔ نمبر (۱۴، ۱۶، ۱۸، ۸۱۴، ۱۳۴۸ حدیث) فہرس الدار ۱/۹۹

۵۔ نمبر (۱۱۹۹) فہرست کتب خانہ برلن (جرمنی) ۸/۳۸

۶۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد ۱/۶۴۰

۲۸۔ انجاز الوعد الوفی فی شرح الجامع للترمذی : یہ جامع الترمذی کی شرح ہے۔ ابن الملقن کے سوانح نگاروں نے اس شرح کا ذکر ان کی تصانیف میں نہیں کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ بخط مصنف چیسٹر بٹی لائبریری میں موجود ہے جو ۱۵۳ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں جامع ترمذی کے پہلے آٹھ ابواب کی شرح ہے[1]۔

۲۹۔ الکلام علی سنۃ الجمعۃ قبلها وبعدها[2]: نماز جمعہ سے پہلے اور بعد کی سنتوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا دو رکعتیں پڑھنی چاہییے یا چار۔ ابن الملقن نے اس مختصر رسالے میں اس سے متعلق تمام احادیث کو جمع کر کے مسلک شافعی کے مطابق بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ امام شافعی (م ۲۰۴ھ) بھی نماز جمعہ سے پہلے اور بعد میں دو رکعت پڑھا کرتے تھے۔ مصنف نے اس رسالے کو ربیع الاول ۷۵۴ھ میں بروز جمعہ ظہر اور عصر کے مابین تصنیف کیا۔ مصنف کی صرف یہی مختصر تصنیف ۱۳۴۱ھ میں ہندوستان سے شائع ہوئی ہے۔

۳۰۔ مختصر شعب الایمان للبیہقی[3]: امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) نے شعب الایمان میں ۷۷ اہم اسلامی عقائد کے سلسلے میں احادیث جمع کی ہیں اور ان پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ابن الملقن نے اس کا ایک عمدہ اختصار تیار کیا ہے۔ اس کا بہت صاف نسخہ مکتبہ خدا بخش پٹنہ میں محفوظ ہے[4]۔ اس کا ایک دوسرا نسخہ بھی وہیں موجود ہے جو ۱۲۳۱ ہجری ہے کا نوشتہ ہے اور

۱۔ نمبر مخطوط ۵۱۸۷ فہرست کتب خانہ چیسٹر بٹی ۶۰/۷

۲۔ البستانی : دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۴/ ۴۴

۳۔ بروکلمن ذیل ۶۱۹/۱

۴۔ Nadvi Moinuddin: Catalogue of Arabic And Persian Mss. in the Oriental Public Library Patna Vol 5/114

غالباً نسخہ اولی سے منقول ہے۔

۳۱۔ النکت اللطاف فی بیان الاحادیث الضعاف المخرجۃ فی مستدرک الحاکم[1]: حاکم النیسابوری (م ۴۰۵ھ) کی کتاب المستدرک میں جو ضعیف احادیث وارد ہوئی ہیں، ابن الملقن نے ان پر بحث کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ مدرسہ یحیی پاشا موصل میں زیر رقم (۱۱۲) محفوظ ہے جو آخر سے ناقص ہے[2]۔

۳۲۔ ماتمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجۃ[3]: حدیث کی مشہور کتاب سنن ابن ماجہ کی شرح ہے۔ مصنف نے اس کی تصنیف ذو القعدہ ۸۰۰ھ میں شروع کی اور شوال ۸۰۱ھ میں اس کو مکمل کر دیا تھا[4]۔ اس شرح کے کسی مکمل مخطوطے کا پتا نہیں چل سکا ہے اس کا ایک حصہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مولانا عبدالحی کلکشن میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ نامکمل ہے اور "باب رد السلام علی الامام" سے شروع ہوکر "باب من امّ قوماً وہم لہ کارہون" کے نامکمل "وہو متقض" پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس مخطوطے کے کل ۱۸ اوراق ہیں۔ نسخہ سیاہ روشنائی سے عمدہ خط نسخ میں لکھا گیا ہے ہر صفحہ میں ۲۱ سطریں ہیں۔

اس مخطوطے میں مندرجہ ذیل ابواب کے احادیث کی شرح ہے:

(۱) باب رد السلام علی الامام (۲) باب لایخص الامام نفسہ بالدعاء (۳) باب مایقال بعد التسلیم (۴) باب الانصراف من الصلاۃ (۵) باب اذا حضرت الصلاۃ ووضع العشاء (۶) باب الجماعۃ فی اللیلۃ المطیرۃ (۷) باب مایستر المصلی (۸) باب المرور بین یدی المصلی (۹) باب مایقطع الصلاۃ

۱۔ طبقات الشافعیہ لابن قاضی شہبہ رقم ۷۳۹۔ بروکلمن ۱۰۹/۲

۲۔ داؤد چلپی: فہرس المخطوطات الموصل ص ۲۳۳

۳۔ الضوء ۱۰۲/۶

۴۔ الضوء ۱۰۲/۶

(۱۰) باب من یصلی وبینہ وبین القبلۃ (۱۱) باب من أمّ قومٌ وھم لہ کارھون .... راقم الحروف نے اس مختصر مخطوطے کا مطالعہ، از ابتدا تا انتہا کیا ہے۔ مصنف نے بہت ہی تفصیل سے احادیث کی شرح کی ہے احادیث کی اسناد پر جرح اور رواۃ پر خاص بحث کی ہے۔ حدیث کے الفاظ مشکلہ کی تشریح کی ہے اور اگر کوئی لفظ کئی معنوں میں مستعمل ہوتا ہے تو اس کے تمام معنی لکھے ہیں اور ہر معنی کے سلسلے میں قرآن، حدیث یا متداول کتب عربیہ سے شواہد پیش کیے ہیں۔ بعض احادیث سے جو مسائل مستنبط ہوتے ہیں ان کو اور اس سلسلے میں اختلاف ائمہ بھی درج کیا ہے۔ اور مختلف مسائل کے سلسلے میں اپنی ذاتی رائے بھی ہے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ) کی نظر سے یہ شرح گزری ہے اور انھوں نے اس کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے:

"شرح جامع حاوٍ لکشف المعضلات"[۱]

نسخہ ناقص ہونے کی وجہ سے سن کتابت اور کاتب کا نام بھی اس پر درج نہیں ہے۔ سرورق پر "قطعۃ از شرح سنن ابن ماجہ لابن الملقن" من ملک ابی الحسنات محمد عبدالحی اللکھنوی بن مولانا عبدالحلیم المرحوم" مرقوم ہے۔

۲۳۔ تذکرۃ المحتاج الی أحادیث المنهاج للبیضاوی[۲]: اس کتاب میں ابن الملقن نے قاضی بیضاوی (م ۶۸۵ھ) کی کتاب منہاج الوصول الی علم الاصول میں جو احادیث آئی ہیں ان میں سے ۸۷ احادیث کی شرح کی ہے۔ میرے علم کے مطابق اس کا واحد نسخہ چسٹر بٹی لائبریری ڈبلن میں محفوظ ہے[۳]۔ یہ نسخہ ۱۲ اوراق پر مشتمل ہے اور اس کی کتابت بحیات مصنف ۲۶ شوال

۱۔ عبدالحی فرنگی محلی: فرحۃ المدرسین بذکر المؤلفات والمؤلفین (مسودہ بخط مصنف) (ع ۵۴۹/۱) فرنگی محل کلکشن مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ)

۲۔ الضوء ۶/۱۰۲؛ البدر ۱/۵۰۸

۳۔ نمبر مخطوطہ (۳۳۸۲) فہرست کتب خانہ چسٹر بٹی ڈبلن ۲/۵۸

۷۵۵ھ میں کی گئی۔ مخطوطہ کے آخری ورق پر بخط مصنف بعض تعلیقات مندرج ہیں۔

۳۴۔ تخریج احادیث المنہاج للبیضاوی[1]: بیضاوی (م ۶۸۵ھ) کی منہاج الوصول الی علم الاصول میں جو احادیث آئی ہیں ان کی تخریج علیحدہ سے اس کتاب میں کی گئی ہے۔

۳۵۔ تحفۃ المحتاج الی ادلۃ المنہاج[2]: نووی (م ۶۷۶ھ) کی منہاج الطالبین میں احکامات کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کو مصنف نے بلحاظ ابواب مرتب ان کی تشریح کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ دار الکتب المصریۃ میں زیر رقم (۱۷۴۶ حدیث) محفوظ ہے جو ۱۵ اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ ۷۵۸ھ میں مصنف کو پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کا عکس جامعۃ الدول العربیۃ قاہرہ میں محفوظ ہے[3]۔ اس کا دوسرا نسخہ چیسٹربٹی لائبریری ڈبلن میں محفوظ ہے جو ۴ رمضان ۷۵۵ھ کا نوشتہ ہے۔ اس میں ۱۳۳ اوراق ہیں اس مخطوطے کے ورق ۱ (الف) اور ۱۳۳ (الف) پر ابن الملقن نے اپنے قلم سے بعض باتیں لکھی ہیں[4]۔ اس کا تیسرا مخطوطہ بھی چیسٹربٹی لائبریری میں موجود ہے۔ بقول مرتب فہرست نویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے[5]۔

۳۶۔ الخلاصۃ فی الحدیث[6]: ابو اسحاق الشیرازی (م ۴۷۶ھ) کی کتاب التنبیہ میں جو احادیث آئی ہیں، اس میں اُن کی تخریج کی گئی ہے۔

۳۷۔ شرح الاربعین للنووی[7]: امام نووی (م ۶۷۶ھ) کی کتاب الاربعین

۱۔ الضوء ۶/۱۰۱؛ البدر الطالع ۱/۵۰۸

۲۔ الضوء ۶/۱۰۱؛ لحظ الالحاظ ص ۲۰۰، البدر الطالع ۱/۵۰۸ بروکلمن ذیل ۱/۶۸۰

۳۔ لطفی عبد البدیع: فہرس المخطوطات المصورہ ۱/۶۶

۴۔ نمبر (۳۳۸۲) فہرست کتب خانہ چیسٹربٹی ڈبلن ۲/۵۸

۵۔ نمبر (۳۷۲۹)۔ فہرس کتب خانہ چیسٹربٹی ۳/۹۸

۶۔ الضوء ۶/۱۰۱، البدر الطالع ۱/۵۰۸

۷۔ الضوء ۶/۱۰۲، لحظ الالحاظ ص ۱۹۹؛ کشف ص ۶۰

فی الحدیث کی شرح ہے۔

۳۸۔ اختصار دلائل النبوۃ للبیہقی[1]: امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) کی دلائل النبوۃ کا عمدہ اختصار تیار کیا گیا ہے۔

۳۹۔ اختصار صحیح ابن حبان[2]: ابن حبان (م ۳۵۴ھ) نے حدیث میں ایک کتاب "المسند الصحیح" کے نام سے مرتب کی تھی۔ ابن الملقن نے اسی کا اختصار تیار کیا ہے۔

۴۰۔ اختصار مسند الامام احمد بن حنبل[3]: اس میں امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کی مسند کی تلخیص کی گئی ہے۔

۴۱۔ تخریج احادیث منتھی السوول والأمل[4]: ابن حاجب مالکی (م ۶۴۶ھ) کی کتاب منتھی السوول والأمل میں جو احادیث آئی ہیں۔ اس کتاب میں ابن الملقن نے انھی کی تخریج کی ہے۔

۴۲۔ المحرر (فی) تخریج احادیث المھذب فی الفروع[5]: ابو اسحاق الشیرازی (م ۴۷۶ھ) کی مشہور اور متداول کتاب "المھذب فی الفروع" میں جو احادیث آئی ہیں ابن الملقن نے دو جلدوں میں ان کی تخریج کی ہے۔

۴۳۔ تذکرۃ الاخیار بما فی الوسیط من الاخبار[6]: امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی

۱۔ کشف ص ۷۶۰

۲۔ طبقات ابن قاضی شھبہ رقم ۷۳۹؛ کشف ۱۰۷۵

۳۔ طبقات ابن قاضی شھبہ رقم ۷۳۹۔ کشف ۱۶۸۰

۴۔ الضوء ۶/۱۰۱۔ البدر الطالع ۱/۵۰۸

۵۔ الضوء ۶/۱۰۱۔ البدر الطالع ۱/۵۰۸۔ کشف ۱۹۱۳

۶۔ کشف ۲۰۰۹؛ الضوء ۶/۱۰۱، البدر ۱/۵۰۸

کتاب الوسیط میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں اس کتاب میں ان کی تخریج کی گئی۔

۴۴۔ شرح المنتقی فی الأحکام[1] : مجد الدین ابن تیمیۃ (م ۶۵۲ھ) نے "المنتقی فی احادیث الأحکام" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی جو مطبع فاروقیہ دہلی سے ۱۲۹۶ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ ابن الملقن نے یہ اسی کی شرح لکھی ہے۔ اس کے کسی نسخے کا اب تک علم نہیں ہو سکا ہے۔

۴۵۔ شرح زوائد مسلم علی البخاری[2] : ابن الملقن نے چار جلدوں میں یہ کتاب مرتب کی تھی۔

۴۶۔ شرح زوائد ابی داؤد علی الصحیحین[3] : یہ شرح دو جلدوں میں لکھی تھی۔

۴۷۔ شرح زوائد النسائی[4] :

اصول حدیث :

۴۸۔ المقنع[5] : یہ کتاب ابن الملقن کی اہم تصانیف میں شمار کی جاتی ہے انھوں

۱۔ کشف ۱۸۵۱ ؛ الضوء ۶/۱۰۱ ؛ البدر الطالع ۱/۵۰۸

۲۔ الضوء ۶/۱۰۲ ، طبقات ابن قاضی شہبہ رقم ۷۳۹

۳۔ الضوء ۶/۱۰۲ ، طبقات ابن قاضی شہبہ رقم ۷۳۹

۴۔ ایضاً .... نمبر ۴۵ ، ۴۶ اور ۴۷ کی کتابوں کے بارے میں ابن قاضی شہبہ نے لکھا ہے کہ "میں نے ان کتابوں کا مسودہ ابن الملقن کے پاس دیکھا تھا لیکن ان کتابوں کے مسودات ان کی زندگی میں جل گئے تھے۔" دیکھیے طبقات ابن قاضی شہبہ رقم ۷۳۹

۵۔ الضوء ۶/۱۰۲ ، لحظ الالحاظ ۱۹۹ ۔ البدر الطالع ۱/۵۰۸ ۔ ذیل تذکرۃ الحفاظ للسیوطی ص ۳۶۹

نے یہ کتاب مقدمہ ابن الصلاح اور دوسری اصول حدیث کی کتابوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی تھی۔ انہوں نے اس کتاب کو ۶۵ اقسام پر منقسم کر دیا ہے اور اصطلاحات پر کافی مبسوط بحث کی ہے۔ مصنف اس کی ترتیب و تبویب میں مسلسل دس سال تک (۷۴۹ھ سے ۷۵۹ھ تک) مصروف رہے۔

اس کا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ مصنف کے زمانہ حیات میں ۲۸ صفر ۷۹۱ھ میں لکھا گیا[1]۔ اس کا دوسرا نسخہ چسٹربٹی لائبریری میں محفوظ ہے وہ بھی ۷۹۱ھ کا نوشتہ ہے اور اس کے کاتب ابراہیم خلیل المقدسی الشافعی ہیں[2]۔

۴۹۔ التذکرۃ فی علوم الحدیث[3] : یہ رسالہ مصنف کی کتاب المقنع کا اختصار ہے۔ مصنف کا یہ انداز ہے کہ پہلے وہ کسی فن پر مفصل و مبسوط کتاب لکھتے ہیں پھر عوام کے حفظ کرنے کے خیال سے خود ہی اس کا اختصار تیار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ رسالہ بھی اسی نظریہ کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اس کا ایک نسخہ جو کتب خانہ رضا رام پور میں محفوظ ہے[4] راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ رسالہ کی عبارت بہت جامع اور مختصر ہے۔ مصنف نے یہ رسالہ ۲۷ جمادی الاولی ۷۶۳ھ بروز جمعہ صرف دو گھنٹے میں تصنیف کیا تھا[5]۔ اس مختصر رسالے کے کئی نسخے مشرق و مغرب کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس کا سب سے اہم نسخہ جو مصنف کے زمانہ حیات میں ۱۱ جمادی الآخرۃ ۷۶۵ھ میں نقل کیا گیا اور اس کے آخر میں بخط مصنف کچھ اضافے بھی ہیں، چسٹربٹی لائبریری

۱۔ فہرس دار الکتب المصریۃ ۱/۳۰۴

۲۔ نمبر ۳۵۰۲ فہرست کتب خانہ چسٹربٹی ڈبلن ۴/۵۳

۳۔ الضوء ۶/۱۰۳، کشف ۳۹۲

۴۔ فہرست کتب خانہ رضا رام پور ۲/۲۴۷

۵۔ ایضاً

ڈبلن میں محفوظ ہے[1]۔ اس کے آٹھ نسخے دار الکتب المصریۃ میں موجود ہیں جن میں سے تین نسخوں پر سن کتابت ۸۲۷ھ، ۱۰۱۴ھ، اور ۱۳۰۲ ہجری مرقوم ہے۔ بقیہ مخطوطات پر سن کتابت درج نہیں ہے[2]۔ اس کا ایک نسخہ مکتبۃ عمومیہ (۷۶۷) استانبول میں بھی پایا جاتا ہے جس کی کتابت بدر الدین القرافی المالکی نے ۸۹۷ھ میں کی ہے۔ اس کی مائکروفلم جامعۃ الدول العربیۃ میں موجود ہے[3]۔ اس کا ایک اور نسخہ مکتبہ عامہ اسکندریہ میں زیر رقم (۵۲۲۷/۳۴۳ ج) محفوظ ہے جو ۱۱۱۸ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس کا بھی عکس جامعۃ الدول العربیۃ قاہرہ میں موجود ہے[4]۔

رجال، تراجم وسیر

۵۰۔ درر الجواهر فی مناقب الشیخ عبد القادر الجیلی (الجیلانی)[5]:

ابن الملقن نے اس کتاب میں سلسلہ قادریہ کے بانی شیخ عبد القادر الجیلانی م ۵۶۱ھ کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ اس کا صرف ایک نسخہ دار الکتب الظاہریہ میں محفوظ ہے جو پانچ اوراق پر مشتمل ہے اور ۱۱۰۴ھ کے قریب کا لکھا ہوا ہے[6]۔

۵۱۔ نزهة النُظّار فی قضاة الأمصار[7]: اس میں مصنف نے ۷۸۰ ہجری تک کے

۱۔ نمبر (۳۳۸۲) فہرست کتب خانہ چسٹر بٹی ۲/۵۸

۲۔ فہرس الدار ۱/۱۷۵ـــ۱۷۶

۳۔ فواد سید: فہرس المخطوطات المصورہ ۱/۶۷

۴۔ ایضاً

۵۔ کشف الظنون ص ۷۴۷

۶۔ یوسف العش: فہرس مخطوطات الکتب الظاہریہ ص ۲۸۷

۷۔ بروکلمن ذیل ۲/۱۰۹

مصر کے قضاۃ کے حالات لکھے ہیں اور اس کو کئی طبقات میں مرتب کیا ہے آخر میں مصنف نے ایک نظم میں تمام قضاۃ کے ناموں کو منظوم کر دیا ہے۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون ص ۲۹ میں اس کا نام "اخبار قضاۃ مصر" لکھا ہے۔

اس کا ایک نسخہ مکتبہ طلعت میں زیر رقم (۲۲۵۶ تاریخ) محفوظ ہے اور اس کا عکس جامعۃ الدول العربیہ قاہرہ میں محفوظ کیا گیا ہے۔ اس مخطوطے میں ۴۷ اوراق ہیں[1]۔

۵۲۔ اکمال تہذیب الکمال فی اسماء الرجال[2]: ابن الملقن نے جمال الدین یوسف بن الزکی المزی (م ۷۴۲) کی تہذیب الکمال کا اختصار تیار کیا ہے۔ حاجی خلیفہ نے اس اختصار کے بارے میں لکھا ہے کہ اب تک تہذیب الکمال کا ایسا خلاصہ نہیں تیار کیا گیا[3]۔

اس کے کسی مکمل نسخے کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ اس کا کچھ حصہ دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے[4]۔ اس کا ایک اور نامکمل نسخہ مکتبہ قلیج علی میں زیر رقم (۱۹۱) محفوظ ہے یہ مخطوطہ ۳۳۱ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا داؤد بن سابور کے ترجمہ سے ہوتی ہے اور عبد اللہ بن مغفل کے ترجمہ پر یہ مخطوطہ ختم ہو جاتا ہے۔ غالباً نویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔ جامعۃ الدول العربیۃ قاہرہ میں اس کی مائکروفلم محفوظ ہے[5]۔

۵۳۔ طبقات الاولیاء ومناقب الاصفیاء[6] (طبقات الصوفیۃ): یہ کتاب اولیاء اللہ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ حروف معجم کے لحاظ سے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ اور

۱۔ لطفی عبد البدیع: فہرس المخطوطات المصورہ ۲/ ۲۷۶

۲۔ الضوء ۶/۱۰۲؛ لحظ الالحاظ ص ۱۹۹۔ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ ۴/۴۷۔ کشف ص ۱۵۱۰

۳۔ کشف ص ۱۵۱۰ ۴۔ فہرس الدار الکتب المصریہ ۱/ ۶۹

۵۔ لطفی عبد البدیع: فہرس المخطوطات المصورۃ ۲/ ۲۹

۶۔ البستانی: دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۴/ ۷۴۔ الاعلام ۵/ ۲۱۸۔ کشف ۱۰۹۶

ہر ولی کے حالات زندگی کے خاتمہ پر اس کے مریدین اور متبعین کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں۔
اب تک اس کے تین نسخوں کے بارے میں معلومات بہم پہونچ سکی ہیں۔

اس کا ایک نسخہ خزائن کتب الاوقاف بغداد میں محفوظ ہے جو ۹۰۳ ہجری کا نوشتہ ہے لیکن آخر سے ناقص معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ابتدار ابراہیم بن ادہم کے حالات زندگی سے ہوتی ہے اور عثمان بن مرزوق القرشی الحنبلی (م ۵۶۴ھ) کے حالات پر یہ مخطوطہ ختم ہوجاتا ہے[1]۔

اس کا دوسرا نسخہ کتب خانہ ظاہریہ میں ہے[2] جو ۳۲۹ اوراق پر مشتمل ہے اس مخطوطہ کی کتابت ۱۱۰۴ ہجری میں کی گئی۔ اس کا تیسرا نسخہ مکتبۃ الجامع الکبیر صنعار (یمن) میں زیر رقم (۹۰۔ علم الباطن) موجود ہے اس کے سرورق پر اس کا نام "حدائق الاولیار تالیف ابن الملقن" لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ ۲۹۸ اوراق پر مشتمل ہے اور ۱۰۴۵ھ کا نوشتہ ہے[3]۔

۵۴۔ العقد المذہب فی طبقات حملۃ المذہب[4]: یہ شافعی فقہا و علماء کا تذکرہ ہے۔ ابن الملقن نے خاص طور پر تاج الدین السبکی (م ۷۷۱ھ) اور ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) کی طبقات الشافعیۃ اور دیگر کتب تاریخ کو سامنے رکھ کر اس کو مرتب کیا تھا۔ مصنف نے امام شافعی (م ۲۰۴ھ) کے زمانے سے لے کر ۷۷۰ ہجری تک کے (۱۷۰۰) فقہای شافعیہ کے مختصر حالات حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دئے ہیں۔ لیکن تبرکاً "احمد" اور "محمد" کے نام کے اشخاص کے حالات پہلے لکھے ہیں۔ اور ان کو تین بڑے طبقات میں منقسم کیا ہے پھر ہر طبقے کو کئی چھوٹے طبقات

۱۔ اسعد طلس: الکشاف عن خزائن کتب الاوقاف ص ۲۲۸

۲۔ یوسف العش: فہرس المخطوطات الظاہریۃ ص ۲۸۶

۳۔ المنجد، صلاح الدین: مجلۃ معہد المخطوطات العربیۃ (مئی ۱۹۵۵ء) ۱/۲۰۹

۴۔ الضوء اللامع ۶/۱۰۱؛ لحظ الالحاظ ص ۲۰۰، البدر الطالع ۱/۵۰۸
طبقات ابن قاضی شہبہ رقم ۷۳۹

میں تقسیم کر دیا ہے۔ آخری طبقے میں اپنے معاصرین کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ ابن الملقن نے ۷۵۲ھ میں اس کتاب کی تصنیف کا کام شروع کیا اور ۱۳ ذوالقعدہ ۷۷۲ھ میں اس کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا اس کے بعد بھی اس میں اضافے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں اگرچہ حالاتِ زندگی مختصر ہیں لیکن سبھی ضروری باتیں آگئی ہیں۔ مصنف نے اکثر مقامات پر ماخذ کے ذکر کے بغیر بہت سی باتیں درج کر دی ہیں[1]۔

اس کے متعدد نسخے دیار شرق و غرب کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

اس کا ایک نسخہ جو ۷۷۵ھ میں مصنف کے زمانہ حیات میں لکھا گیا مکتبہ مولانا خلیل اللہ المدراسی حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ اس میں ۲۰۵ اوراق ہیں۔ کاتب عبداللہ بن محمد النشائی ہیں۔ مخطوطے کے مختلف اوراق کے حاشیے پر بخط مصنف بہت سے اضافے ہیں[2]۔ اس کا دوسرا نسخہ جس کی کتابت بحیات مصنف ۷۹۴ھ میں کی گئی ہے اور اس میں ۱۲۴ اوراق ہیں اس کا عکس جامعۃ الدول العربیۃ قاہرہ میں محفوظ ہے[3]۔ اس کا تیسرا نسخہ دار الکتب المصریہ میں محفوظ ہے (نمبر ۷۹ ۵ تاریخ) جو مدینہ منورہ کے نسخے سے نقل کیا گیا ہے[4]۔ اس کا چوتھا نسخہ مکتبہ خدابخش پٹنہ میں زیر رقم (۷۷۴) محفوظ ہے اس میں ۱۸۶ اوراق ہیں۔ یہ نسخہ میری نظر سے گزرا ہے۔ اس نسخے کو ۱۳۱۳ ہجری میں

۱۔ جناب عبدالرشید صاحب ریسرچ اسکالر پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ اس کتاب کے پہلے طبقہ کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ایڈٹ کر رہے ہیں۔

۲۔ تذکرۃ النوادر من المخطوطات العربیۃ مطبوعہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد ۱۳۵۰ھ ص ۱۰۳

۳۔ لطفی عبدالبدیع : فہرس المخطوطات المصورۃ ۲/ ۱۸۵

۴۔ فہرس دار الکتب المصریۃ ۵/ ۲۷۰

سید محمد الرفاعی نے اس نسخے سے نقل کیا ہے جو ۷۷۵ھ میں لکھا گیا تھا اور کاتب نے وہ تمام اضافے بھی نقل کیے ہیں جو مصنف نے مذکورہ بالا نسخے کے حاشیے پر کیے تھے[1]۔ اس کا پانچواں نسخہ برلن (جرمنی) کے کتاب خانے میں محفوظ ہے جو ۱۱۰۰ھ کا نوشتہ ہے[2]۔

۵۵۔ غایۃ السئول فی خصائص الرسول[3] : اس کتاب کے نام میں اختلاف ہے۔ بروکلمن میں "خصائص افضل المخلوقین" اور بعض کتابوں میں "الخصائص النبویۃ" اور "خصائص النبویۃ" بھی ہے۔ لیکن مکتبہ خدابخش پٹنہ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ اور دار الکتب المصریہ میں جو نسخے محفوظ ہیں ان پر اس کتاب کا نام "غایۃ السوؤل فی خصائص الرسول" ہی ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و اخلاق کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب چار انواع پر تقسیم کی گئی ہے۔ اور پھر ہر نوع کو دو قسموں میں بانٹا گیا ہے پھر ہر قسم میں بے شمار مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے آخر میں ایک خاتمہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ معجزات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف اس کتاب کی تصنیف سے ربیع الثانی ۷۶۷ھ میں فارغ ہوا۔

دنیا کے مختلف کتب خانوں میں اس کتاب کے متعدد نسخے محفوظ ہیں: اس کا ایک اہم نسخہ دار الکتب المصریۃ میں محفوظ ہے۔ جس کو محمد بن محمد بن منصور بن علی بن ہاشم الموسوی الحسینی نے بحیات مصنف ۷۸۶ھ میں اس نسخے سے نقل کیا ہے جو مصنف کے اصل مسودے سے نقل کیا گیا تھا[4]۔ اس کا دوسرا اہم نسخہ بھی دار الکتب المصریۃ میں محفوظ ہے[5]۔ جو ۷۹۱ھ میں

۱۔ فہرست مکتبہ خدابخش بانکی پور پٹنہ ۱۲/۱۰۹

۲۔ نمبر ۱۰۰۳۹ فہرس کتب خانہ برلن ۹/۴۴۸

۳۔ الضوء ۶/۱۰۲، لحظ الالحاظ ص ۱۹۹، کشف ۷۰۶، بروکلمن ۲/۹۲

۴۔ فہرس الدار ۵/۱۶۷ ۵۔ فہرس الدار ۸/۱۲۷

بحیات مصنف لکھا گیا۔ اس کا تیسرا اہم مخطوطہ جو بحیات مصنف ۷۹۱ھ ہی میں نقل کیا گیا، چسٹر بٹی لائبریری ڈبلن میں محفوظ ہے۔ اس کے کاتب ابراہیم بن خلیل المقدسی الشافعی ہیں اور یہ نسخہ ۳۸ اوراق پر مشتمل ہے[1]۔ اس کا چوتھا نسخہ پیرس کے کتب خانہ میں زیر رقم (۱۶۶۷) محفوظ ہے جو ۸۲۴ھ کا نوشتہ ہے اور اس میں ۲۵ اوراق ہیں[2]۔ اس کا پانچواں نسخہ مکتبہ خدابخش پٹنہ میں محفوظ ہے۔ عیسیٰ بن منصور الدلحمونی المالکی نے ۹ر ذوالقعدہ ۱۰۸۵ھ میں اس کی کتابت کی تھی[3]۔ اس کا چھٹا نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں زیر رقم (D/42) محفوظ ہے[4]۔

۵۶۔ طبقات المحدثین[5]: ابن الملقن نے اس کتاب میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے سے لے کر اپنے زمانے تک کے محدثین... کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ اس کے کسی نسخے کا علم نہیں۔

۵۷۔ طبقات القرّاء[6]: اس میں ابن الملقن نے قرّاء کے حالات زندگی لکھے ہیں۔

۵۸۔ التاریخ فی الدولۃ الترکیۃ[7]: یہ سلطنت ترکیہ کی تاریخ ہے اس کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں مل سکی ہیں۔

۱۔ نمبر ۳۹۰۲ فہرس کتب خانہ چسٹر بٹی ۴/۵۳

۲۔ فہرست کتب خانہ پیرس ۱/۳۱۱

۳۔ نمبر ۱۰۱۳ فہرست مکتبہ خدابخش انگریزی پٹنہ ۱۵/۴۲

۴۔ فہرست رائل ایشیاٹک آف بنگال ص ۵۶

۵۔ الضوء ۶/۱۰۱، لحظ الالحاظ ص ۲۰۰۔ البدر الطالع ۱/۵۰۸

۶۔ الضوء ۶/۱۰۱۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۴/۷۴

۷۔ کشف ۲۸۰

۵۹۔ العدۃ فی اسماء رجال العدۃ[1] : جماعیلی (م ۶۰۰ ھ) کی کتاب "عمدۃ الاحکام" میں جو اسماء آئے ہیں ان کے حالات علیحدہ سے اس کتاب میں لکھے گئے ہیں۔

علم النحو :

۶۰۔ شرح الالفیۃ لابن مالک[2] : مشہور نحوی محمد بن عبد اللہ المعروف بابن مالک (م ۶۷۲ ھ) کی "الالفیۃ" کی شرح ہے۔

متفرقات :

مندرجہ ذیل کتب کے بارے میں تحقیق نہیں ہوسکی۔ کتابوں میں صرف اُن کے نام ملتے ہیں اس لیے یہاں بھی صرف ان کے نام ہی لکھے جاتے ہیں :

۶۱۔ الاشراف علی اطراف الکتب الستۃ[3]

۶۲۔ تلخیص الوقوف علی الموقوف[4]

۶۳۔ المغنی فی تلخیص کتاب ابن بدار[5]

۶۴۔ عقود الکمام فی متعلقات الحمام[6]

۶۵۔ الناسک لأم المناسک[7]

۶۶ عداد الفرق[8]

۱۔ الضور ۶/ ۱۰۱ ۔ البدر ۱/ ۵۰۸
۲۔ الضور ۶/ ۱۰۲ ۔ کشف ۱۵۳
۳۔ کشف ۱۰۳
۴۔ الضور ۶/ ۱۰۲ ۔ کشف ۴۷۹
۵۔ الضور ۶/ ۱۰۲
۶۔ کشف ۱۱۵۶
۷۔ الضور ۶/ ۱۰۲ کشف ۱۹۲۱
۸۔ الضور ۶/ ۱۰۲

قرآن کا منہاج فکر ونظر

تالیف : ڈاکٹر سید عبداللطیف
ترجمہ : محمد قطب الدین احمد بختیار

اعتراف وتسلیم :

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی   کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

آزردہ (مفتی صدرالدین)

ڈاکٹر سید عبداللطیف کا ترجمۂ قرآن اپنے موضوع کے لحاظ سے انگریزی زبان میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ جب خالقِ کائنات کسی سے کچھ کام لینا چاہتا ہے تو علت ومعلول کے سارے رشتے توڑ دیئے جاتے ہیں اور ہر عمل خارق عادت اور معجزانہ شان کا حامل نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہ کسی دینی درسگاہ کے فارغ التحصیل ہیں، اور نہ کسی عربی جامعہ سے سند فراغ حاصل کی ہے۔ ادبیات انگریزی میں (Kings College) لندن سے درجۂ استناد (Doctorate) عطا ہوا، آنکھوں کا سرمہ خاکِ مدینہ ونجف تھا، جلوۂ دانش فرنگ نگاہوں کو خیرہ نہ کرسکا۔ انھیں اس خصوص میں جو کچھ سینے اور سینے سے حاصل ہوا، وہ ان کا خانہ زاد ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ سید جلال الدین بخاری، مخدوم جہانیاں، جہاں گشت، فیروز شاہ تغلق کے مرشد، اور خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی کے معاصر تھے، یہ سادات نجیب الطرفین سے ہیں، جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی نقی علیہ السلام پر منتہی

ہوتا ہے۔

یہ ترجمۂ قرآن متداول تراجم میں نہ صرف ممتاز اور بے مثال خوبی کا حامل ہے، بلکہ ادب وانشا، زبان وبیان کی لطافتوں اور شیوہ طرازیوں کو اپنے جلو میں لیے، حلّ اشکال وشرح معانی میں اپنی طرفگی کو جاذب نظر بنائے، اپنے قلمِ بوقلموں سے چمن چمن لالہ ونسترن کھلائے، اپنی تمکین سے کوشش دہقان کو شرمائے، منفردانہ شان کے ساتھ [illegible] پر دعوت فکر دے رہا ہے، جہاں نظر پڑتی ہے، شہید نظارہ ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس کا اندازہ شناس وہی ہوسکتا ہے۔ جو ژرف نگاہی سے اس کے مطالعہ کے ساتھ دیگر تراجم سے اس کا موازنہ بھی کرتا جائے، مگر کون ہے جو اس دیدہ ودل کی قربانیوں کے لئے تیار ہے؟

اجتماع ضدین محال سمجھا جاتا ہے، مگر قدرت کی تماشہ گاہ اسی کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کی جلوہ گاہ معلوم ہوتی ہے، یہاں ناسازگاریوں ہی کی گود میں سازگاریاں پرورش پاتی رہی ہیں۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ایک عارف تام المعرفت کی چیخ زمزمۂ صداقت بن کر گونج اٹھی، عرفت ربی بجمع الاضداد، ــــ صنمکدے سے ابراہیمؑ کو کھڑا کرنا، یوسفؑ کو تخت مصر پر براجمان کرنے کے لئے اندھے کنویں میں جھونک دینا، موسیٰؑ کو فرعون کی سرکوبی کے لئے اس کی آغوش پرورش میں پروان چڑھانا، بلالؓ کو حبش، صہیبؓ کو روم، حسنؓ کو بصرہ سے کشاں کشاں لے آنا، کوفہ میں نوآباد شدہ جاٹ قبیلہ زوط سے بوحنیفہؒ کو، الفقہاء کلھم عیال ابی حنیفہ، کی شان عطا کرنا، موبدان مجوس سے بخاریؒ کو امام المحدثین واصح الکتب بعد کتاب اللہ کی سند قبول سے نوازنا، مغ زادگان و ترسا بچگان سے بایزید بسطامیؒ کو سرخیل اولیاء وسلطان العارفین کی سربلندی بخشنا، شبلیؒ کو راجپوتانہ کے ریگزاروں میں نسیم حجاز کی شمیم انگیزیوں سے گل بیرہن بناکر ایک بلندپایہ سیرۃ نگار اور بے نظیر مورخ اسلام کے درجہ پہ فائز کرنا، اقبالؒ کو باوجود

برہمن زادگی کے رمز آشنائے روم و تبریز کرنا، عبید اللہ سندھیؒ کو ایک سکھ گھرانے میں جنم دے کر ولی اللٰہی حکمت کا فقیہ المثال شارح قرار دینا ـــ اگر اس مبدار فیاض کی کرم گستری کسی سید زادے کے سینہ کو علوم و معارف کا گنجینہ بنا دے، تو وجہ حیرانی کیوں ہو، بلکہ باعث صد شادمانی ہے کہ حق بہ حقدار رسید۔ اسی قانون کے تحت ڈاکٹر صاحب کا یہ ترجمہ رشک صد ازہرؔ اور رو کش صد ہزار دانشگاہ علوم ہے ؎

میکدہ تہی سبو حلقہ، خود فراموشاں مدرسۂ بلند بانگ بزم فسردہ آتشاں

'اقبال'

ڈاکٹر صاحب کا یہ کارنامہ کسی اکاڈیمی کے کام کو درس خجلت دے رہا ہے، جس کو انھوں نے یکہ و تنہا سرانجام دیا ہے۔ جو کچھ بھی انھیں اپنے رفقائے کار سے اس معاملہ میں مدد ملی ہے۔ وہ بہ استثنائے چند مزدکارانہ نوعیت کی حامل ہے، علمی نہیں۔ سن، صحت، اور بینائی کو دیکھتے ہوئے یہ مہتم بالشان خدمت کرشمۂ قدرت نظر آتی ہے۔ اس عالم آب و گل میں کسی کا پندارِ تقدس خرقہ و عمامہ اور گنبد دستار کی عمارت گری میں مصروف خود بینی ہے، تو کوئی ناگفتہ بہ اور ناسازگار حالات میں اپنی ساری نیازمندیوں کے ساتھ 'دل بیار و دست بکار' کی خوش آئینوں کو نباہتے ہوئے گوہر مراد کے حصول میں فائز المرام ہو رہا ہے اور عرفی، اقبال، حافظ کی زبان میں زمزمہ سنج، پائے کوب و دست افشاں، ساغر شکرانہ چھلکا رہا ہے ؎

گر دیر بر آئیم ز گرداب میندیش کاندر طلب گوہر نایاب نشستیم

ترا با خرقہ و عمامہ کارے من از خود یافتم بوئے نگارے

زاہد غرور داشت، سلامت نبرد راہ رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

ڈاکٹر صاحب نے اس ترجمۂ کتاب میں مطالعہ قرآن کی بابت جو گرانقدر تشریحات بہ عنوان، قرآن کا انداز فکر، پیش کی ہیں اور قرآن کے نظریۂ حیات کو جس بدیع الاسلوبی

سے مائلؔ و دلؔ انداز میں سپرد قرطاس کیا ہے، وہ بجائے خود ایک مستقل تصنیف میں داخل ہے۔ اگر اس شہ کار کو اردو میں منتقل نہ کیا جاتا تو ایک بڑی علمی کوتاہی کے مرادف ہوتا۔ میں نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ طرز و اسلوب کی ساری خوش ادائیوں کو نباہتے ہوئے اردو پیرایہ میں اسے سنوارا جائے ؎

بہ طراز زندگی قامتِ موزوں نازم

یک لقانیست کہ شائستہ اندام تو نیست 'نظیری'

اگر اس پر بھی کہیں کوئی خامی رہ گئی ہو تو اسے نگاہ صورت پرست کی نارسائی و کوتاہی پر محمول کریں ؎

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ

جرمِ نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست 'نظیری'

بادی النظر میں یہ امر وجہ استعجاب ہے کہ ڈاکٹر باوجود، رومی وغزالی، ابن عربی و شاہ ولی اللہ اور دیگر افادات علمیہ سے راست استفادہ نہ کرنے کے کس طرح ان کے خیالات و تصورات ان بزرگان دین سے متوارد ہو رہے ہیں؟ بہ ادنیٰ تامل اس صداقت کا انکشاف ہوتا ہے، تمام حقائق کا سرچشمہ ذات واحد ہے اور اسی حقیقت الحقائق سے جملہ علوم و معارف کا صدور ہو رہا ہے، یہ ایک موہبت الٰہی ہے، کسی کی اجارہ داری نہیں ؎

تا دیدۂ ما راند ہد حسنِ تو نورے

در باغ جمالِ تو تماشہ نتواں کرد 'رومی'

میں نے ان متواردات کو، جہاں تک میری یادداشت نے دستگیری کی، سلفِ صالحین کے ارشاداتِ عالیہ سے متوافق اور موثق کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ اقتباسات متن میں مثل شیر و شکر باہم آمیز ہو کر نورٌ علیٰ نور، غیر انفکاک پذیر، اور گوشت و ناخن کے حکم میں داخل ہو گئے ہیں ؎

آنچناں با تو یکے گشت وجودم اے دوست
کہ ترا بے تو تواں دیدن و بے من نتواں
'حکیم اکنائے کاشی'

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس خدمت کو اہل اللہ کی نظر میں پسندیدہ . اور اپنی بارگاہ سے اس محنت کو سرمایۂ قبول عطا فرما کر مالا مال فرمائے ؎

اکسیرِ حسن در نظرِ پارسا شناس
اقبال اہل دل ز قبولِ خدا شناس
'نظیری'

قرآن کا منہاج فکر و نظر

اسلوب مطالعہ:

جو کوئی صحت مندانہ انداز میں قرآن کی اساسی تعلیمات پر غور و فکر کا آرزو مند ہوگا، قرآن خود اس منہاج تحقیق کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ج وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ م وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ آل عمران ، "(اے پیغمبر) وہی (حی وقیوم ذات) ہے جس نے تم پر الکتاب نازل فرمائی۔ اس میں ایک قسم محکم آیتوں کی ہے اور وہ کتاب کی اصل و اساس ہیں۔ دوسری قسم متشابہات کی ہے (یعنی تشبیہ، مجاز و استعارہ کی حامل) سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو متشابہ ہیں، اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت معلوم کرلیں، حالانکہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ مگر جو لوگ علم میں پکے ہیں، وہ کہتے ہیں، ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ (تعلیم حق سے)

دانائی حاصل کرتے مگر وہی لوگ جو صاحب عقل وبصیرت ہیں۔"

یہاں پورا زور اس امر پر ہے، جسے قرآن محکمات سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ایسی آیات ہیں جو اپنے معانی ومطالب میں روشن اور جو بالجملہ قرآن میں ام الکتاب و اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جہاں معانی ومطالب کے اظہار میں رمز وکنایہ اور تشبیہ واستعارہ استعمال ہوا ہے، انھیں متشابہات کا نام دے کر پہلے جز سے امتیاز بخشا گیا ہے۔ قرآن کے نظریات اور طرزِ فکر کا سراغ اولاً محکمات ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے کہ ہمارے ذہن وفکر پر یہ بات واضح ہو جائے کہ قرآن کا وہ کون سا جز ہے جسے متشابہات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، تب ہی ہم اس موقف میں ہوتے ہیں کہ کامل یکسوئی کے ساتھ محکمات کو اپنا مطمح نظر بنائیں اور اس کے نظامِ فکر کی ساری وسعتوں کو اپنے دامان نگاہ میں سمیٹ لیں۔ افسوس ہے کہ تاریخِ اسلام میں اس کی اہمیت کو درخور اعتنا نہ جان کر اس جانب کم توجہ کی گئی کہ ایسی تمام آیات جو بہمہ وجوہ اور ہر گونہ محکمات کہلائی جاسکتی ہیں قابل فہم انداز میں یکجا کی جاتیں۔ یہ تقاضہ اپنی پوری شدت کے ساتھ اس وقت بھی موجود ہے۔

جب تک تمثیلی پیرایۂ بیان اختیار نہ کیا جائے، تو اصل شئے کا ادراک جسے نہ دیکھا گیا ہو، جاننا اور تصور کرنا دشوار ہو جائے۔ اس قبیل میں قرآن کے وہ جملہ اظہارات، جہاں استعارات، امثال، اور مجازات کا استعمال ہوا ہے۔ اگر اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو دوزخ، جنت، حشر، اور عالمِ غیب کے تعلق سے جملہ بیانات جو سارے قرآن میں گوناگوں طریقِ ادا کے ساتھ بکھرے ہوئے ہیں، متشابہات کے تحت لائے جاسکتے ہیں۔ ایسی تشریحات ان آیات میں بکثرت پائی جاتی ہیں جو مکہ میں نازل ہوئیں، مدنی آیات میں بھی ان کی کچھ کمی نہیں۔ آغاز بعثت کی سورتیں، جن کا تعلق مکی دور سے ہے، اہل مکہ کی ذہنی نشوونما اس درجہ پر نہیں تھی کہ صحیح انداز پر اس روحانی زندگی کے قدر شناس ہو سکیں، جو قرآن کے پیش نظر تھی، اس لیے نتائجِ اعمال کے بارے میں خیر وشر کے تعلق سے ایسا اسلوب بیان اختیار کیا گیا جو آسانی کے ساتھ ان کے دل ودماغ میں اتر جائے۔ دوزخ، جنت اور حشرِ اجساد ایسے مصطلحات تھے جو ان کی زبان پر رواں اور جن سے وہ بخوبی آشنا تھے۔ ذات رسالتؐ، ہر دو حیثیتوں،

بشیر و نذیر کی حامل تھی۔ جس طرح آپؐ بداعمالیوں کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، ویسے ہی نیکو کاروں کو مژدۂ کامیابی سنانے والے تھے۔ لہذا لذت والم جو نیکی اور بدی کے قدرتی نتائج ہیں، اس روحانی کیفیت کو قابل فہم بنانے کی خاطر مادی صورت میں روپ دھارنا اور اس کے لیے زبان آب وگل اختیار کرنی پڑی ہے

در زبانِ آب وگل گفتار جاں　　در قفس پرواز می آید گراں　　اقبال

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

قرآن میں عذاب وثواب کے جو جابجا تصریحات ہیں، امام غزالی جواہر القرآن میں ان کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں۔ کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ "ہرگز نہیں، اگر تم کو یقین ہوتا تو تم دوزخ کو یہیں دیکھ لیتے۔" امام غزالی اس آیت کی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں، ای ان الجحیم فی باطنکم یعنی دوزخ خود تمہارے اندر موجود ہے۔ قرآن میں ایک اور مقام پر ہے، وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ "کفار کہتے ہیں کہ عذاب جلد آجائے، حالانکہ دوزخ نے کافروں کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔" اس کی تفسیر امام صاحب اس طرح کرتے ہیں، خدا نے یہ نہیں کہا کہ دوزخ آئندہ محیط ہوگی بلکہ یہ کہا کہ ابھی اسی وقت محیط ہے۔ امام صاحب ان آیتوں کی تفسیر لکھ کر کہتے ہیں، اگر تم مطالب کو اس طرح نہیں سمجھتے تو تم کو قرآن سے صرف اس کا چھلکا ہاتھ آیا، جس طرح بہائم کو گیہوں میں صرف بھوسی ہاتھ آتی ہے

من ز قرآں مغز را برداشتم　　استخواں پیش سگاں انداختم　　رومیؒ

بہشت و دوزخت باتست، در باطن نگر خود را

سقرہا در جگر، جنانہا در جناں بینی　　حکیم الٰہی سنائیؒ

امام غزالی، شیخ الاشراق اور شاہ ولی اللہ میں قدر مشترک یہ ہے کہ جو امور ماوراء محسوسات اور عقل ہیں انھیں مجاز و استعارہ اور روحانیات کو جسمانیات کے پیرائے میں بیان کیا جاتا۔ مثلاً موت کے بعد جو رنج وراحت ہوگی، اس کو بجز اس کے کہ باغ و انہار اور کژدم و مار سے تعبیر کیا جائے اور کیا طریقہ ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس کا قول ہے، لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء، دنیا اور آخرت کی چیزوں میں نام کے سوا اور کسی بات میں مشارکت نہیں۔ شاہ ولی اللہ اس کو عالم مثال، شیخ الاشراق عالم اشباح، اور امام غزالی اس کو تمثل خیالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم ان ہی باتوں کو سمجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اس مادی دنیا میں گذرتی رہتی ہیں۔ وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کے بارے میں سمجھانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستان بقا یعنی آخرت کا ہر نقشہ سمجھایا جائے اور یہی حضورؐ کی تعلیم نے سرانجام دیا۔

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دور پیمانہ   فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ   اقبالؔ

لذت و الم اپنی روحانی اور غیر مادی صورت کن لطافتوں اور کثافتوں سے ہم آغوش ہیں، ان کی کلاہ فگن پستیاں و بلندیاں اہل مکہ کے فہم و ادراک سے ماوراء تھیں۔ روحانیات کے اصل حقائق کی نقاب کشائی بتدریج مابعد دور مدینہ میں کی گئی۔ جہاں معاشرہ اپنی تہذیب و شائستگی کے باعث ایک بلند سطح پر فائز تھا۔ یہاں یہودی، عیسائی، مہاجر و انصار صحابہ، جن کے ذہن و دماغ صحبت رسالت سے جلا پا کر فیضان نبوت اور کتاب و حکمت کے اخذ و اکتساب کے قابل ہو چکے تھے۔ ان مواقع پر بھی جنت و دوزخ کا تذکرہ آتا رہا اور اسی انداز میں حور و قصور، گلزار و انہار، نشاط افزا سبزیاں اور شادابیاں پیش کی گئیں، لیکن اس امر کے انتباہ کے ساتھ کہ یہ سارے بیانات محض تمثیلی حیثیت کے حامل ہیں، ان کے ظاہر الفاظ کو گورکھ دھندا بنا کر نہ کھیلا جائے۔

نسبتِ رویت اگر باماہ و پروین کردہ اند
صورتِ نادیدہ تشبیہے بہ تخمین کردہ اند   حافظ

امثال کے ذریعہ جو منظر آرائی کی گئی ہے، وہ ارباب دانش و بصیرت کے لئے بھی اتنی ہی تشفی بخش ہے، جتنی کہ کم استعداد رکھنے والے عامی کے لئے۔ نیکوکار سکون کی زندگی سے شاد کام اور خطاکار اضطراب و بے چینی سے تلخ کام رہیں گے۔ امثال کی غرض و غایت اس تاثر کو ذہن و دماغ میں پیدا کرنا ہے۔ جو تمثیلات پیش کی گئی ہیں وہ لازماً اس دنیا کی معلومہ آسائشوں سے ماخوذ ہیں، اس لیے جن

عیش سامانیوں کا نقشہ فردوس نظر بنایا گیا ہے، وہ باغ وچمن، شہد ولبن کی نہروں اور خوش آئند صحبتوں وغیرہ پر مشتمل ہے مگر ہر محل پر اس امر سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ کہیں اس کو مادی دنیا کی عشرت کوشیوں کی طرح نہ سمجھ لیا جائے، جنت کے باغات کو اس حیاتِ دروزہ کے باغوں سے کوئی مماثلت نہیں۔ وہاں کے ثمرات اور پھل موسمی اثرات سے بے نیاز، جس کے چشموں کا پانی سڑاند اور گندگی سے پاک، جن کی خوش ذائقگی لذتوں میں ایک دوسرے سے ممتاز، اس کے نازنینان صحبت مادی وجسمانی آلائشوں سے منزہ، وہ جن کا خمیر لطافتوں سے گوندھا گیا ہو، جن کا حسن وجمال عنفوان شباب کی رعنائیوں کو ہمہ وقت نت نئی آرزومندیوں کے ساتھ اپنے آغوش میں کھلاتا رہتا ہو، جہاں کی باہمی صحبتوں میں کسی لغو ژاژ خائی کا گذر نہ ہو سکے۔ جنت کے اس تصور کو معہ اس کی ساری خصوصیات کے ایک حدیث قدسی میں بصد حسن کاری سمیٹ لیا گیا ہے، اور اس امر کی تاکید ہے کہ یہ سارے امثال اس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھلانے سے بھی قاصر وتہی دامن ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ، اعدت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر (بخاری) میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ عیش وراحت کے سروسامان مہیا کئے ہیں، جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی دل میں اس کا خیال گزرا، یعنی ان نادیدہ، ناشنیدہ، اور در دل ناخلیدہ مفاہیم کے لیے زبان آب وگل یکسر بے مایہ ہے ؎

صد شیوہ یافتیم زمعشوق روز وصل — وز بہر نیم شیوہ بیانے نداشتیم — عرفیؔ

اسی طرح وہ امثال جو دوزخ کے لیے اختیار کئے گئے ہیں وہ بھی اس مادی دنیا کی تکالیف و آلام سے لئے گئے ہیں اور رمز وکنائے میں غیر صالح زندگیوں کی اس کوفت اور لکد کوبیوں کو پیش کیا گیا ہے جن سے اس نظام نو میں ان کی روح گھری ہوئی ہوگی۔ قرآن خود اس کیفیت کو اس طرح واشگاف کرتا ہے:

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي ۝ تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ

اور تم کیا سمجھے کہ حطمہ کیا چیز ہے، یہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جس کے شعلے قلب کے اندرونی گوشوں سے لپک رہے ہوں گے ؎

رزق یک ناسور شد چوں شمع سرتا پائے من — تا کف پا سوخت از داغے کہ سر برداشتم — علیؔ

اس آیت میں ایک ایسے ذہن کو جہنم کے مماثل قرار دیا گیا ہے جو روحانی کوفت کے صدمہ ہائے جانگداز سے بدحواس خود اپنے ہی دامان حیات کے تار و پود بکھیر رہا ہو۔

جب معاشرہ نے فہم و ادراک حقائق میں اپنی صلاحیتوں اور استعداد کے لحاظ سے مزید برتری حاصل کی اور فہم کتاب کے ساتھ اس کی حکمت سے بھی بہرہ ور ہونے لگا تو قرآن نے بھی حیات مابعد کے تعلق سے انکشاف حقائق کا ایک بلند تر اسلوب اختیار کیا چنانچہ اس آیت میں فردوس کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، اس میں اس کے چہرے سے مادی نقاب کے سارے بندھنوں کو ایک ایک کر کے توڑ دیا گیا ہے۔

وَسَارِعُوٓا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَٰوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ

(آل عمران ۱۳۳) اپنے پروردگار کی بخشائش کی طرف تیز گام ہو جاؤ، نیز اس جنت کی طرف لپکو جس کی پہنائیاں آسمانوں اور زمین کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئی ہیں، جو نیکوکاروں کے لئے کشادہ آغوش ہے۔

یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے   تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں   'اقبال'

روایات و آثار میں یہ واقعہ محفوظ ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت بازنطینی سلطنت کے حکمران، ہرقل کا قاصد دربار نبوی میں باریاب تھا۔ عرض پرداز ہوا، جیسا کہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ بہشت آسمانوں اور زمین کی وسعتوں کو گھیرے ہوئے ہے، تو پھر دوزخ کہاں ہوگی۔ حضورؐ نے باوقار اور پرسکون لہجے میں ارشاد فرمایا: سبحان اللہ! جب صبح اپنی افق تابیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے تو رات کی تاریکیاں کس چادر میں اپنا منہ چھپا لیتی ہیں۔ حضورؐ نے یہ کہہ کر سکوت فرمایا، اور سائل نے بلا کسی مزید استفسار کے خاموشی اختیار کی اور اپنے قلب کو دلجمعیوں اور سکون آفرینیوں سے معمور پایا۔ خواجہ نصیر الدینؒ چراغ دہلی کا یہ ملفوظ کس قدر اس حدیث کی روح کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے:

"الٰہی! نہ خواہانِ بہشتم نہ دلدادۂ عیش و نشاطم، مرا از فضل خود دیدۂ بہ بخش کہ از ہر نفس در

ہر نظر صد ہزار فردوس آراستہ کنم" ع "بہر جانب کہ رو می آورم گلزار می بینم"۔

آغاز تبلیغ میں آنحضرتؐ اس حقیقت سے کماحقہ آگاہ تھے کہ اہل مکہ کے جس طبقے سے آپ کو سروکار رہے گا، وہ فسق و فجور میں رچا ہوا، مشرکانہ اعمال میں ڈوبا ہوا، اور ریت رسم کے بندھنوں میں جکڑا ہوا اور ان کا حد درجہ گرویدہ ہے۔ اس خصوص میں قرآن کا حکیمانہ کمال یہ تھا کہ وہ ان بلا انجامیوں سے خبردار کرے جو ان سے ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ یہ انتباہ کسی سخت طرز و روش کا متقاضی تھا، لہٰذا دوزخ کا نقشہ دل دہلا دینے والے انداز میں پیش کیا گیا۔ یہ ان جسمانی المناک تجربات پر مبنی تھا، جن کی دہشت خیزیوں کے تصور سے انسانی فطرت چلا اٹھتی ہے۔ قرآن کا اولین مقصد، کہنہ راڈ یکن و بازیہ تعمیر خرام، کے اصول پر قبل اس کے کہ انھیں قرآنی دعوت اور پیغام سے سنوارا جائے، ان کو زندگی کے مکروہ پہلوؤں سے روشناس کرنا اور زندگی کے برتر و اعلیٰ درجات پر فائز کرنا تھا تاکہ وہ دوسری اقوام کے لئے، امتاً وسطاً، نمونۂ کلام و مثال ثابت ہوں۔

جہاں روشن، چو صبح از فیض احساں میتواں کردن چراغے گر بکف باشد، چراغاں می تواں کردن
علیؔ

اُمّی بود کہ ما از اثرِ صحبتِ او واقف سر نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصل ما یک شرر باختہ رنگے بود است نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم اقبالؔ

قرآن کا نظریہ حیات | قرآن اپنی دعوت و پیغام کی احاطت کو اس اساسی ہدایت نامہ، 'امنوا وعملو الصالحات'، میں پیش کرتا ہے، یہ وہ دوگونہ مرکزی حکم ہے، جس کے گرد پورا قرآن اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ جو راہ عمل تجویز کی گئی ہے وہ زندگی کے چند بنیادی حقائق سے وقوف و آگہی حاصل کرنا ہے، جن کا استحضار اتنا قوی ہو کہ ہمارے فکر و عمل کی ہر کیفیت ان ہی کی مطابقت پذیری میں جلوہ گر ہوتی رہے۔

توحید الوہیت | اولاً ایمان باللہ اور خدا کی یگانگت کو یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ساری کائنات، غیب و شہود، اپنے وجود میں اس ذات واجب الوجود، برتر و اعلیٰ کی محتاج، اور سر و سامان حیات سے فیضیاب ہو رہی ہے۔ یہ وہ اساسی تصور ہے، جس کا قرآن ذہن انسانی کو روشناس کرانے کا آرزو مند ہے تاکہ

وہ اس احساس یگانگت کو بیدار کرے کہ وہ جزو کائنات ہے اور ہر موجود دیگر مخلوقات کے ساتھ گتھا ہوا، ہم رشتہ، اور وابستہ ہے۔ اس تصور پر قرآن اتنا زور دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا قرآن بجز اس کے مضمرات کی توضیح کے اور کچھ نہیں۔ جیسا کہ (Emerson) نے کہا ہے کہ پوری کائنات ایک قطرۂ شبنم میں سمٹ آئی ہے:

The Universe globes itself into a drop of dew.

یا کارلائل کے الفاظ میں کل موجودات ایک پرکاہ کی نشوونما میں باہمدگر سرگرم اور تعاون عمل کر رہی ہے:

The whole Universe co-operates to make a blade of grass to grow

یکیست حسن بصد جلوہ از نقاب چکید   رگ چراغ زدم، خون آفتاب چکید   "قاسم دیوانہ"

دل ہر قطرہ را گر واشگافی   بروں آید از و صد بحر صافی   "صاحب گلشن راز"

ع لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں   اقبال

توحید الوہیت سے بطور ضمنی نتائج، ایمان بالملائکہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، اور ایمان بالآخرۃ پیدا ہوتے ہیں۔ فعل و انفعال، علت و معلول اور نتیجۂ اعمال کے اس قانون کو قرآن یوم الآخرہ، یوم الحساب پر ایمان سے تعبیر کرتا ہے۔ جہاں ہر ایک کو اپنی مابعد زندگی میں اس کا حساب دینا پڑے گا، جس نوع سے اس نے اس حیات ارضی میں اپنی زندگی گزاری ہے ؎

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب   خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا   غالب

التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی عیال اللہ، احکام الٰہی کا احترام اور خانوادۂ خداوندی پر لطف و احسان، یہ دین اسلام کے بازو کے دو شہپر ہیں، جن سے وہ فضائے کائنات میں وقف پرواز رہتا ہے ؎

کہ بر شیخ و برہمن دارد احسانے کہ من دارم   چراغ کعبہ و دیر است ایمانے کہ من دارم   "علی"

عالم گیر اخوت کو فروغ دینے کے لئے، قرآن اولاً بے تعصبی اور احساسِ رواداری کو زندگی کے ہر شعبہ میں

فروغ دینا چاہتا ہے، یہ رواداری اتنی وسیع الاطراف ہے کہ قرآن اس رجحان طبع کو انسان میں پوری وسعت قلبی کے ساتھ اُبھارنا چاہتا ہے کہ بخشائش ونجات نہ صرف حاملین قرآن تک محدود رہے بلکہ خدا کی رحمت کی حدود نا آشنا پہنائیاں ان اہل کتاب کو بھی اپنی آغوش میں لے لیں جو اسلام سے قبل پیغام خداوندی سے نوازے گئے، اور ساتھ ہی ایسے افراد کو بھی ان میں شامل کرتا ہے جو وحدت انسانیت میں توحید الوہیت کے جلوے دیکھتے ہیں، اپنے اعمال کے احتساب اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ نیکوکارانہ زندگی بسر کرتے ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (البقرہ ۶۲)

جو لوگ پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لاچکے ہیں یا وہ لوگ ہوں (کوئی بھی ہو، کسی گروہ بندی سے ہو) لیکن جو کوئی بھی خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوں تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا، اس کو کسی طرح کھٹکا اور غمگینی نہ ہوگی۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ تصور جو پیش کیا گیا ہے وہ محض عالم خیال کی خوش فہمیاں نہیں جن پر پیروان قرآن سر دھنتے رہیں بلکہ ایمان کے رسوخ اور پختگی کے لئے اسے لازمی گردانا گیا ہے۔ روح ومعنی کے لحاظ سے اس پر عمل آوری میں ادنیٰ کوتاہی دائرۂ ایمان سے خارج کر دیتی ہے:

به کعبه سجدهٔ عارف نمی کنند قبول   اگر به دیر نهد پا بر آستان گستاخ   نظیری

امام غزالیؒ رسالہ تفرقہ بین الاسلام والزندقہ میں تعلیمات اسلامی سے مستنیر ہو کر کس وانشگاف انداز میں اس امر کا اظہار کر رہے ہیں، بل اقول اکثر نصاری الروم والترك فی هذا الزمان تشملهم الرحمة انشاء الله تعالى الخ بلکہ میں کہتا ہوں کہ اکثر نصارائے روم وترک جو ہمارے زمانے میں ہیں ان کے رحمت الٰہی انشاء اللہ شامل حال ہوگی ؎

سخت گیری و تعصب خامی است
تا جنینی، کار خوں آشامی است   رومیؒ

روح عبادت | قرآن اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ عبادت بجائے خود کوئی تقدس کا عمل نہیں، اگر وہ عبادت گزار کے قلب میں اپنے ابنائے جنس کے ساتھ جذبۂ خدمت گزاری کو نہ ابھارے۔خلوت صرف مسجد کی چار دیواری میں نہیں، اس کے مشرقستان تجلی کے زاوئے شور شہر اور فتنۂ بازار ہیں۔ صداقت شعارانہ انداز پر روزمرہ کے کاروبار اور باہمی معاملات کی دادوستد ہیں اس کے جلوے اور بلوے ہیں۔ صفت رحمت اللعالمین کی جلوہ گاہیں مکہ کی وادیاں اور مدینہ کی گلیاں ہیں، غارحرا کی خلوت نشینیاں نہیں، ع نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

خلقے ترا ز خلوت و عزلت طلب کنند تو شور شہر و فتنۂ بازار بودہٗ 'نظری'

لاف مردی می زنی در انجمن با دوست باش

خویشتن را چوں زناں در گوشۂ خلوت مکش 'عرفی'

حضرت خواجہ بہار الدین نقشبندؒ کا بیان ہے کہ میں دو مرتبہ سخت حیران رہا۔ ایک شخص کو کعبہ کا طواف کرتے دیکھا، وہ سخت غافل تھا، میں حیران رہا کہ اللہ کے گھر میں اللہ کی یاد سے یہ غفلت۔ دوسری دفعہ ایک کپڑے کے تاجر کو بخارا میں دیکھا، تمام دن خرید و فروخت میں مشغول، مگر ایک لمحہ کے لئے یاد خدا سے ذہول و نسیان نہ تھا ؎

از بروں درمیان بازارم وز دروں خلوتے ست با یارم

اسلام مذہب کو کسی کا شخصی معاملہ تصور نہیں کرتا۔ وہ انسانی ذہن کو اس انداز پر فروغ دینا چاہتا ہے کہ اس کی ساری سرگرمیاں امتیاز دینی و دنیوی سے بے نیاز، روحانی رنگ میں رنگ جائیں تاکہ وہ اپنی توانائی اور حرکت فی الحیات کو فکر و عمل کے ہر میدان میں وحدت فی الحیات کے لئے وقف کردے اور ایک دیرپا تمدن کے قیام و تکمیل پذیری میں ممد و معاون ثابت ہو۔ علامہ اقبال اجتماع و عمران کی اس کیفیت کو روحانی جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس کے قیام کو اسلام کا آخری نصب العین قرار دیتے ہیں۔ خطبات مدراس کا چھٹا خطبہ ان جملوں پر اختتام پذیر ہو رہا ہے:

Let the Muslim of today appreciate his

Position, reconstruct his social life in the light of ultimate Principles, and wolve, out of the hither to Partially revealed Purpose of Islam, that Spiritual Demo-cracy which is the ultimate aim of Islam.

"عصر حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنے مقام کا اندازہ شناس ہو، اصول اساس کی روشنی میں اپنی حیات عمران کا احیا کرے اور الی الآن جزءً منکشف شدہ مقصد اسلام سے یہ استنباط کرے کہ "روحانی جمہوریت ہی اسلام کا آخری نصب العین ہے۔"

نیرنگیٔ گلشن نہ شود ہم سفرِ گل — آئینہ زخود می رود و جلوہ مقیم است — 'بیدل'

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے — 'اقبال'

معمارِ حرم ! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز !

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ج (انعام ۱۱۵)

ختم کا ہے کو ہوا کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

"تاریخ قطبی"

تصحیح ڈاکٹر سید مجاہد حسین زیدی پر ایک نظر

از جناب ڈاکٹر محمد خالد صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

تاریخ قطبی مولفہ خورشاہ، تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر سید مجاہد حسین زیدی صاحب نے اس کی تصحیح کی ذمہ داری اپنے سر لی، اسی مطبوعہ کتاب کی تصحیح کے سلسلے میں سطور ذیل میں ایک تفصیلی یادداشت پیش کی جاتی ہے۔

فارسی زبان کے مخصوص رسم خط کی وجہ سے اس زبان کے بعض مسائل میں اہم دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ مثلاً اس کے املائی مسائل پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ بعض اوقات لفظ معیاری تلفظ سے گر گئے ہیں، لیکن سب سے مشکل مسئلہ متون کی صحت کا ہے۔ چونکہ اس زبان کے حروف تہجی میں بآسانی تحریف ہوسکتی ہے، اس لئے سرمایۂ زبان کی حفاظت میں دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ فارسی زبان کے الفاظ میں تحریف کی جتنی گنجائش ہے اتنی دوسری زبان میں نہیں، اس لئے کہ اس کے حروف مشابہ شکلوں کے ہیں۔ نقطے اور شوشے سے مزید حروف کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس بنا پر فارسی کتابوں میں جس حد تک تحریف ہوئی، اس کا اندازہ مشکل ہے۔ چونکہ اس سلسلے کے مسائل نہایت مشکل ہیں جو بغیر معلومات کافی کے حل نہیں ہوسکتے، اسی بنا پر تصحیح متن اعلیٰ درجہ کی تحقیق شمار ہوتی ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بہت سے علمی اور ادبی امور کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اور اگر ان امور کو

پیش نظر نہیں رکھا جاتا تو متن انتہائی ناقص بلکہ گمراہ کن ثابت ہوتا ہے اور مصحح متن یا مرتب کتاب کی بے مائگی پر دلالت کرتا ہے۔ اس بنا پر تصحیح متن کے سلسلے میں صرف ایسے حضرات کو اقدام کرنا چاہیے جن کو ان مسائل سے نہ صرف دلچسپی ہو بلکہ ان میں گہری بصیرت رکھتے ہوں۔ میرے پیش نظر اس وقت ایک اہم کتاب "تاریخ قطبی" ہے جو ڈاکٹر سید مجاہد حسین زیدی کی مرتب کی ہوئی ہے۔ اس ضخیم کتاب کا متن سات سو صفحات کو حاوی ہے اور تقریباً سو صفحات کا ایک تفصیلی مقدمہ ہے۔ یہ مقالہ Bonn یونیورسٹی کے دو پروفیسر W. Honerbach اور Dr. Otto Spies کی رہنمائی میں مرتب ہوا ہے۔ کتاب ہذا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی کثیر زر امداد سے شائع ہوئی ہے، پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ نے ایک مختصر سا پیش لفظ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں مرتب کی تصحیح متن کی صلاحیت جو کتاب ہذا کی ترتیب میں صرف ہوئی اس کا ذکر بھی اس طرح پر کیا ہے، کہ مرتب نے بطور انکسار اپنی وہ تمام صلاحیتیں شمار نہیں کیں جو انھیں ناقص اور بعض اوقات ناخوانا مخطوطات کی تصحیح میں صرف کرنا پڑیں۔ لیکن اتنی ضمانت کے باوجود اس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ جس اہمیت کی یہ کتاب حامل تھی، اس کے اعتبار سے اس کے متن کی تصحیح میں دقت نظر عمل میں نہیں آئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرتب نے کوشش اور محنت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، لیکن کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اُن میں بعض بنیادی خامیاں تھیں جن کی وجہ سے متن بھروسے کے قابل نہیں تیار ہو سکا اور یورپین محققین بھی رہنمائی کی ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ بر آ نہیں ہو سکے۔

مرتب نے تصحیح متن کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں ایک نسخے کو اصل قرار دیا ہے اور دوسرے مخطوطوں کے مقابلے سے جو اختلاف نسخ نظر آیا اس کو حاشیہ میں درج کر دیا۔ مرتب کی تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے نسخہ حاجی محمد لغوانی کو اصل قرار دیا ہے۔ یہ MS ۹۷۰ھ کا ہے اور بقیہ دونوں Mss سے بقول مرتب کے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ کسی نسخہ کو بعینہٖ اصل قرار دینا صرف اس صورت میں مناسب ہوتا ہے، جبکہ وہ ہر طرح کے ظاہری سقم سے پاک ہو۔

مثلاً وہ مصنف کے ہاتھ کا نسخہ ہو، یا مصنف کی نظر سے گذر چکا ہو، بقیہ اور صورتوں میں اس امر کی کوشش ہونا چاہیے کہ صحیح متن پیش کیا جائے۔ کسی نسخہ کا جو پوری طرح بھروسے کے قابل نہ ہو، بعینہٖ متن قرار دینے میں مرتب کی ذاتی صلاحیت کا کوئی دخل نہیں ہوتا، صرف زیادہ سے زیادہ پڑھنے تک اس کے عمل کا دائرہ محدود رہتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں تحقیقی مقالے کے لئے ضروری ہے کہ محقق تمام اختلافات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسا متن تیار کرے جو مصنف کی اپنی تحریر ہو۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ کسی نسخے کو بعینہٖ اصل قرار دینا تحقیق کی حدود میں شامل ہے، پھر بھی صحیح متن کے پیش کرنے کی ذمہ داری مرتب پر سے ختم نہیں ہوتی۔ کسی مہمل لفظ کو یا بے معنی جملے کو بعینہٖ داخل متن کرنا محض اس بنیاد پر کہ وہ نسخہ اصل میں پائے جاتے ہوں، لغو بات ہے، اس لئے کہ اس سے کتاب کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ جو بات بادی النظر میں غلط معلوم ہو، اس کو مصنف کی طرف منسوب کرنا، خصوصاً ایسی حالت میں کہ خود مرتب بھی اس کو غلط قرار دیتا ہو، لایعنی ہے۔ ایسا متن جو مصنف کی تحریر کا آئینہ دار نہ ہو، بلکہ کاتب کی فکر انگیزی کا نتیجہ سمجھا جائے، یقیناً تحقیق کی حدود میں نہیں آتا۔ پیش نظر کتاب کے متن میں اکثر خامیاں ایسی نظر آتی ہیں جو نسخہ اصل میں شامل نہیں ہو سکتیں، اس لئے کہ بقول مرتب وہ نسخہ قابل اعتماد تھا۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ مرتب متن نسخے کے پڑھنے میں پوری طرح ناکام رہے ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کا نسخۂ اصل بعض جگہ ناقص تھا اور عبارت نقل ہونے سے رہ گئی یا مسخ ہو چکی ہے، اس کو مرتب نے متن میں خالی جگہ چھوڑ کر حاشیے میں یہ عبارت دوسرے نسخے کی مدد سے درج کر دی ہے، مثلاً ص ۵۶ سطر ۱۶ مصرعہ اولیٰ، اصل نسخے میں ناقص تھا، اس جگہ پر نقطے ڈال دئے ہیں، اور حاشیہ میں محذوف لکھدیئے ہیں، یہی عمل سطر ۱۷ دوسرے مصرعہ میں ہوا۔ اس سے واضح ہے کہ مرتب کا مقصد ایک ناقص نسخہ کا چربہ اتارنا ہے۔

اس اہم خامی کے علاوہ یہ کتاب بعض اور اعتبار سے ناقص نظر آتی ہے۔ تحقیق متن کا ایک اصول یہ ہے کہ متن میں مندرج بعض امور کی تخریج ہونا چاہیے۔ مثلاً اشعار کا مصنف متعین

ہونا چاہیے اور اس کے اصل مجموعہ کلام سے مندرجہ متن اشعار کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اسی طرح کسی کتاب کے حوالے سے جو عبارت درج ہو، اس کا اصل کتاب سے مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض اسمار علم اور اسمار غیر علم کی تصحیح دوسرے مأخذوں سے کی جانی چاہیے۔ لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ پیش نظر کتاب کے مرتب نے اس میں سے کسی امر کا لحاظ نہیں رکھا۔ نہ اشعار کی تخریج کی اور نہ احادیث و قرآن کے متن کا تعین کیا، جس کی وجہ سے غلطیوں میں اضافہ ہوگیا۔ تخریج کے اصول پیش نظر رکھنا متن کی صحت کا جس حد تک ضامن ہے وہ چند مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔

ص ۱۱۳ سطر ۱۰ پر گرگین میلاد' جو شاہنامہ کا ایک مشہور Character ہے، اس کا نام کرکین میلاد لکھا ہے۔ اگر شاہنامہ کے متن سے اس کا مقابلہ ہوجاتا تو یہ غلطی نہ ہوتی۔ ص ۱۲۸ سطر ۱۸ پر ایک شعر لکھا ہوا ہے:

ای سپاہت راظفر لشکر کش و نصرت نزک
نہ یقین بر طول و عرضِ لشکرت واقف نہ شک

یہ شعر انوری کے ایک مشہور قصیدے کا مطلع ہے۔ اگر مرتب انوری کے دیوان کی طرف رجوع کرتے تو نزک جو یزک کے بجائے غلط طور پر درج ہوگیا ہے، درج نہ ہوتا۔

ص ۱۷۶۔ ۱۷۵ پر پانچ اشعار مثنوی کے ہیں جن کا مصنف درج نہیں ہے۔ یہ دراصل بوستان سعدی کے باب اول کے اشعار ہیں۔ اگر بوستان سے ان کا مقابلہ ہوتا ایک طرف تو اُن کی صحت ہوجاتی اور دوسری طرف متن زیادہ تنقیدی قرار پاتا۔ پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ وزن سے خارج ہے۔ مطبوعہ مصرعہ یہ ہے:

ہنر بر آن نیاورد شیران فرست

'ہنر بر آن' کی جگہ 'ہژبران' اور 'نیاورد' کی جگہ 'ناورد' ہونا چاہئے۔ ناورد بمعنی جنگ۔ مرتب نے 'ہژبران' کو ایک اور جگہ 'ہنر بر آن' لکھ کر مصرعہ کو وزن سے خارج کر دیا ہے مگر اس کا انھیں احساس نہیں ہوا۔ ص ۱۱۱ سطر ۱۸: شدند آن ہنر بران، رزم آزمای۔ صحیح مصرعہ اس طرح

ہونا چاہیے: شدند آن شہر بران، رزم آزمای

اسی طرح ص ۲۱۲ سطر ۱۴ پر مصرعہ اول: شدند آن ہنر بر آن مشاغل فروز۔ وزن سے خارج ہے، اگر شہر بران' پڑھ لیا جائے تو درست ہو جائے۔

اسی طرح چوتھے شعر کا دوسرا مصرعہ: کہ روز وغا سر نباید چو زن۔ اس میں سرنباید کی جگہ سرنتابد ہونا چاہیے۔

ایران کے تاریخی متن کی ترتیب میں جغرافیہ کی کتابوں کی مدد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کتابوں سے کم از کم ناموں کی مکمل طور پر تصحیح ہو جاتی ہے۔ مثلاً ص ۱۱۲ سطر ۱۴ میں 'شُشتر' نام درج ہے۔ اس شہر کا صحیح نام 'شُشتر یا شوشتر' ہے۔ ص ۱۱۳ سطر ۱۰ پر 'لار' شہر کا نام 'لارکہ' درج ہے اور یہی Index کے ص ۶۹۹ پر موجود ہے۔ مرتب کو یہ بات نہیں معلوم کہ ایران میں ایک مشہور شہر گنجہ ہے۔ اس کو دوبار ص ۱۰۰ اور ص ۳۱۲ پر 'کنجہ' لکھا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ شہر گنجہ، گنجینہ کی رعایت سے ص ۱۰۰ پر دوبار آیا ہے مگر مرتب کا ذہن گنجینہ سے گنجہ کی طرف نہ گیا اور انہوں نے اس کی Reading کنجہ ہی رکھی۔ بلخ کے اطراف میں دو شہروں کا نام 'بلخاب' (ص ۴۹۱) و 'بلخات' (ص ۵۲۳) ہے۔ ان میں سے بظاہر 'بلخات' درست ہے، اس لئے کہ پھر ص ۴۹۲ پر کوہستان 'بلخات' آیا ہے ('بلخات'[1] جمع بلخ)۔ ص ۳۷۵ پر خراسان کے ایک شہر کا نام 'یاخرز' لکھا ہے اور Index میں بھی ایسا ہی ملتا ہے، حالانکہ واضح طور پر اس شہر کا نام 'باخرز' ہے۔ ص ۲۸۱ اور ۳۹۳ پر ہمدان کے شہر 'درگزین' کا نام 'درکزین' لکھا ہے۔ ص ۱۱۹ پر ملوک سربدال سطر ۵، سطر ۱۳، اور سطر ۱۶ میں آیا ہے۔ اس کی بنیاد پر سربدال کو ایران کا شہر سمجھا ہے، حالانکہ یہ ملوک 'سربدار' خاندان کا نام تھا۔ جغرافی نام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سربدال کے بجائے سربدار ہونا چاہیے۔ ص ۵۴ پر 'سغیداز' ایک شہر کا نام ہے اور شاہنامہ کا حوالہ ہے۔

---

[1] اسی قبیل کا ہے: گیلان سے گیلانات۔

یہ سفیددز، ہونا چاہیئے۔ ص ۳۲۰ پر طہرستان، عراق، فارس اور کردستان کے ساتھ آیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ طبرستان ہے۔ مرتب کی غلطی یوں معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے طہرستان کو Index میں ص ۶۹۴ پر درج کیا ہے۔ ایرانی تاریخ کا مرتب اور ہمارے زمانے کا مورخ طبرستان کے قدیم مورخ محمد بن جریر طبری کے وطن سے جس درجہ ناواقف ہے، اُس کی مثال کم ملے گی۔

اس متن میں بعض جگہ قدیم کتابوں کے حوالے کے ساتھ مطالب درج ہیں۔ مرتب کا فرض تھا کہ مندرجہ مطالب کا مقابلہ اصل کتاب کے مطالب سے کرتے اور ایسی صورت میں جبکہ ان میں سے اکثر کتابیں چھپ چکی ہوں۔ بظاہر اس بے اعتنائی کا کوئی جواب نہیں۔ تفصیلی مقابلے کا اگر موقع نہ تھا تو اس کی نشاندہی تو بآسانی ہو سکتی تھی، اس سے متن نہ صرف زیادہ ناقدانہ ہو جاتا بلکہ بسا اوقات غلطی سے بھی محفوظ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ کتاب ہذا میں تین بار تذکرۃ الشعراء کا ذکر ہے (۳۶۲، ۴۰۹، ۴۵۴)۔ مرتب اس کو دولت شاہ کا تذکرہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ میر علی شیر نوائی کا تذکرہ ہے اور حسن اتفاق یہ کہ ص ۳۶۲ اور ص ۴۰۹ پر مصنف تذکرہ کا نام بھی درج ہے۔ یہ تذکرہ جس کا نام مجالس النفائس ہے۔ ترکی زبان میں ہے، اس کے دو فارسی ترجمے علی اصغر حکمت کے اعتنا سے تہران ۱۳۲۳ شمسی میں چھپ چکے ہیں اور بآسانی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تاریخ قطبی کے ص ۳۶۲ پر میرزا ابو القاسم کے ذیل میں یہ مطالب ہیں:

لہ انگریزی مقدمہ کے ص ۵۴ پر دوسرے مقالے کے ماخذ میں تین کتابوں کا ذکر ہے۔ لب التواریخ مولفہ میر یحییٰ، تذکرۃ الشعراء تالیف دولت شاہ اور تاریخ خواجہ جمال الدین محمود شیرازی۔ دوسرا مقالہ مطبوعہ نسخے کے ۲۶۰ تا ۵۲۹ صفحات کو حاوی ہے۔ اس میں تذکرہ دولت شاہ کے بجائے تذکرۃ الشعراء میر علی شیر نوائی کا ذکر ص ۳۶۲، ۴۰۹ اور ۴۵۴ پر ہے، جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے۔ ص ۳۶۲ پر مولف کا نام واضح طور پر موجود ہے۔ مرتب تاریخ ہذا کو صریح دھوکا ہوا۔

"نقل است کہ روزی در مجلس ذکر حاتم طای (کذا) می گذشت کہ خانہ داشتہ چہل در۔ اگر سائلی از جمیع ابواب درآمدی از انعام او بہرہ ورگشتی۔ میرزا ابوالقاسم بابر فرمود کہ چرا از یک درچنداں چیزی ندادی کہ بدر دیگرش احتیاج نشدی۔ در تذکرۃ الشعراء امیر علی شیر مذکور است کہ آنجناب راطبع شریف موزون بود و بسخنان ارباب صوفیہ میل تمام داشت و ایں رباعی از نتائج طبع اوست، بیت:

چوں بادہ و جام را بہم پیوستی الخ"

اگرچہ اس اقتباس کے آخری چند جملے امیر علی شیر کے تذکرہ کے حوالے سے نقل ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ پوری عبارت تذکرہ ہذا ہی سے مقتبس ہے، اس تذکرہ کے فارسی ترجمہ سے جو فخری ہروی کے توسط سے تیار ہوا تھا، پوری عبارت نقل کی جاتی ہے:

گویند پیش او ذکر حاتم چنیں گذشتہ کہ خانۂ حاتم چہل در داشت، اگر سائلی بتمام آمدی او انعام کردی۔ او جواب گفتہ کہ از یک درچنداں چیزی ندادی کہ بدر دیگر احتیاجش نشدی۔ طبعش بنظم نیز ملایمت داشت از وست ایں رباعی:

چوں بادہ و جام را بہم پیوستی الخ

تاریخ قطبی کے ص ۴۰۹ پر سلطان محمود میرزا اور اس کے بیٹے سلطان مسعود کے متعلق جو مندرجات ہیں وہ سب کے سب تذکرہ مجالس النفائس ہی سے مستفاد ہیں گو مؤلف تاریخ مذکور نے صرف چند عبارتیں اس تذکرہ کے حوالے سے لکھی ہیں۔ پہلے تاریخ قطبی کی عبارت درج کروں گا، پھر تذکرہ کی ضروری عبارت درج ہوگی جس سے تاریخ قطبی کے مؤلف کے استفادہ کی نوعیت ٹھیک معلوم ہوسکے گی:

در تذکرۃ الشعرای میر علی شیر نوائی مذکور است کہ سلطان محمود میرزا بصفت شعر کہ میزان طبع ہنرپروران است اشتغال می نمود در فصاحت (ص ۴۰۸ ب) و بلاغت الفاظ و دقت معانی جایش مسند کمال بود۔ ایں مطلع از نتائج طبع اوست:

گنبد گردوں کہ خشتی نقرہ وخشتی زراست الخ

بعد از فوت پدرش سلطان مسعود تائم مقام او گشت و بر مملکت ماورالنہر فرمان روا گشت ۔ مادر او از سادات ترمد بود ۔ آنجناب ہم طبع لطیف داشت شعر ترکی وفارسی را بغایت خوب می گفت ۔ در وقتی کہ امیر خسرو شاہ گرفتار شدہ بود نیشتر بر چشم او زدہ بودند ، از الم نابینائی این رباعی را گفتہ ، بیت :

نوری کہ عیار دیدۂ روشن بود الخ (تاریخ قطبی)

(سلطان محمود میرزا ولد سلطان ابوسعید میرزا) او بطراز صفت شعر کہ میزان طبع ہنرپروران است اشتغال تمام میفرمود ، و در فصاحت وبلاغت الفاظ و دقت معانی جالیش مسند کمال بودہ ۔ این مطلع از اشعار گوہر آثار اوست : مطلع

گنبد گردون کہ خشتی نقرہ وخشتی زراست الخ

سلطان مسعود میرزا فرزند ارجمند سلطان محمود میرزای مذکور بودہ ، و از والدہ از جانب سادات ترمد است ، بعد از پدر سعادت اثر جمیع ممالک محروسہ کہ در تحت تصرف پدرش انتظام داشت بید اقتدار او انتقال نمود ، و طبع سخن طراز و فکر سحر پردازش ..... بضایع شعر میل تمام داشت ، چنانچہ صیرفی طبع لطیفش دیوان ترکی وفارسی ترتیب کردہ بود ..... این رباعی را بعد از آنکہ امیر خسرو شاہ نیشتر بچشم او زد گفت : رباعی

نوری کہ عیار دیدۂ روشن بود (مجالس النفائس)

ان مثالوں سے اندازہ ہوسکے گا کہ اگر مرتب تاریخ قطبی کم از کم ماخذ کی سہل الحصول کتابوں سے تاریخ قطبی کے مندرجات کا مقابلہ کسی سطح پر کر لیتے تو ان کے ناقدانہ اڈیشن کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ۔

مرتب فارسی املا کے مسائل سے پوری طرح واقف نہیں، مثلاً ذ اور ز کا فرق نہیں کرتے، گزارش کو ذ سے لکھتے ہیں اور گذشت کو ز سے۔ فارسی کے دو مصدر ہیں، ایک گزاردن بمعنی پیش کرنا، دوسرا گذاشتن بمعنی چھوڑنا یا ڈالنا، اور دونوں سے مضارع گزارد اور گذارد بنتا ہے۔ ان کے استعمال میں انتہائی احتیاط درکار ہے۔ تیغ گذار 'ذ' سے ہونا چاہیے اور نماز گزار 'ز' سے۔ لیکن مرتب نے اس پر مطلق عمل نہیں کیا۔ مثلاً ملاحظہ ہو ص ۱۳۱ سطر ۱۷، ص ۱۳۲ سطر ۱۳، ص ۱۳۳ سطر ۱۶، ص ۱۳۴ سطر ۱۰، ص ۱۳۵ سطر ۸۔ ی کا ذکر کیا کیا جائے، اس کے املا میں تو اکثر لوگوں سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، لیکن ہمارے مرتب نے جو لفظ کہ ی پر ختم ہوا اور اس میں یای نسبت یا یای مصدر کا اضافہ ہوا، وہاں تمام حالتوں میں وہ ی کو حذف کر گئے ہیں مثلاً روائی کو روای، تائی کو تای، بینائی کو بینای لکھ گئے ہیں۔

ان عام اصول سے بے اعتنائی کے باوجود اگر متن صحیح پیش ہوتا، تو بھی غنیمت تھا، لیکن مرتب نے نسخے پڑھنے اور متن کے مرتب کرنے میں فاحش غلطیاں کی ہیں، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کو زبان کے بعض مبادیات سے واقفیت نہیں۔ (باقی)

(قسط نمبر ۱۶)

ہندو تہذیب اور مسلمان

جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

میر حسن دہلوی نے ایک شاہ زادہ کی برات کا بہت ہی دل چسپ اور دلفریب منظر پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:-

کروں اس تجمّل کا کیوں کر بیاں | کہ باہر ہے تقریر سے وہ سماں
وہ دولھا کے اٹھتے ہی اک غل پڑا | لگا دیکھنے اُٹھ کے چھوٹا بڑا
کوئی دوڑ گھوڑے کو لانے لگا | کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
لگا کہنے کوئی اِدھر آئیو! | ارے رتھ شتابی مری لائیو
کسی نے کسی کو پکارا کہیں | نہ لانے پہ میانے کے مارا کہیں
کوئی پالکی میں چلا ہو سوار | پیادوں کی رکھ اپنے آگے قطار
جو کثرت میں دیکھا کہ گاڑی نہیں | کوئی مانگے تانگے میں بیٹھا کہیں
سپر اور قبضے کھڑکنے لگے | سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے
ٹکورے وہ نوبت کے اور ان کے بعد | گرجنا وہ دھونسوں کا مانند رعد
وہ شہنائیوں کی سہانی دھنیں | جنھیں گوش زہرہ مفصل سنیں
ہزاروں تمامی کے تختِ رواں[1] | اور اہلِ نشاط ان پہ جلوہ کناں

---

[1] یعنی ناچنے والی عورتوں کے تخت جن کو زربفت سے سجا کر بالک۔ ان طوائفوں کو ہر ایک تخت پر بیٹھاتے تھے۔
ہفت تماشا ص ۱۴۷۔

وہ طبلوں کا بجنا اور ان کی صدا ۔۔۔ وہ گانا کہ اچھا بنا لاڈلا!
ٹھہر کر وہ گھوڑوں کا چلنا سنبھل ۔۔۔ ہُما کے وہ دونوں طرف مورچھل

وہ فانوسیں آگے زمرد نگار ۔۔۔ کہ ہو سبز مینا جھفوں پہ نثار
دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے ۔۔۔ پتنگے خوشی سے غزلخواں ہوئے

چراغوں کے ترپولیہ[1] جا بجا ۔۔۔ اور ان میں وہ بازاریوں کی صدا
کوئی پان بیچے، کھلونے کوئی ۔۔۔ کوئی دال موٹھ اور سلونے کوئی

براتی اِدھر اور اُدھر خُوق خُوق ۔۔۔ وہ آوازِ قرنا اور آوازِ بوق
وہ کالے پیادے وہ ان کی نفیر ۔۔۔ کہ تا چرخ پہونچے صدا ان کی چیر

وہ آرائش اور گل کئی رنگ کے ۔۔۔ وہ ہاتھی کے دو دیو تھے جنگ کے
وہ ابرک کی ٹٹی وہ بینے کے جھاڑ ۔۔۔ کہے تو کہ تنکے کی اوجھل پہاڑ

دو رستہ برابر برابر وہ تخت ۔۔۔ کسی پر کنول اور کسی پر درخت
وہ رنگیں کنول اور وہ شمع و چراغ ۔۔۔ کھلے جس طرح لالۂ نور باغ

اناروں کا دغنا وہ بھچپے کا زور ۔۔۔ ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور
اُڑایا ستاروں کو جو آگ نے ۔۔۔ تو ہاتھی لگے بن کو پھر بھاگنے

وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار ۔۔۔ ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار
سراسر وہ ہر طرف مشعل کے جھاڑ
کہ جوں نور کے مشتعل ہوں پہاڑ[2]

---

[1] ترپولیا۔ تین در کے بنائے ہوئے دروازے۔

[2] مجموعۂ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۳۔ ۱۲۲۔ چند براتوں کے مناظر کے لئے ملاحظہ ہو صحیفۂ اقبال ص ۳۲ الف و ب مثنوی عبدالجلیل بلگرامی، ہفت تماشا ص ۱۴۶ - ۱۴۸، کلیات سودا۔ جلد دوم ص ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۸۴ - ۱۹۷ Observations etc, N. 204 - گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۵ - ۳۵۶۔

دوسرے سازوں کے علاوہ روشن چوکی[1] کا ہونا لازمی تھا۔

دولہن کے گھر کا نقشہ بھی برات کی رونق سے کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ وہاں بھی بڑی سجاوٹ ہوتی تھی اور رقص و سرود کا انتظام ہوتا تھا، برات کے پہونچنے کے پہلے دولہن کو نہلا دھلا کر تیار کر لیتے تھے، اور اس کے غسل کا پانی باہر لاکر دولہا کی سواری کے گھوڑے یا ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈال دیا جاتا تھا۔ دولہن کو یہ غسل سات دن کے باسی ٹھنڈے پانی سے دیا جاتا تھا جو کلس کا پانی کہلاتا تھا، چوکی پر پان بچھا کر وہ نہلائی جاتی تھی اور یہی پان اس اکیس پانوں والے بیڑے میں شامل ہوتے تھے جو سب سے پہلے سسرال میں کھلایا جاتا تھا[2] اس موقع پر دولہن کو شادی کا سرخ جوڑا پہنایا جاتا تھا۔ زیورات[3]، مہندی، اور پھولوں کے ہاروں سے اُسے سجایا جاتا تھا۔

عروسی وہ گہنا وہ سوہا لباس
وہ مہندی سہانی وہ پھولوں کی باس
مَلا سُرخ جوڑے پہ عطرِ سہاگ
کھلے مل کے آپس میں دونوں کے بھاگ[4]

---

[1] روشن چوکی سے مراد مٹی کے دو چھوٹے نقارہ ہیں جن کو لکڑی سے نہیں ہاتھ سے بجاتے ہیں اور اس کی آواز بانسری کی آواز سے رنگین تر کرتے ہیں۔ ہفت تماشا۔ ص ۱۴۷۔

[2] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۵۶

[3] شادی کے موقعہ پر دولہن کو نتھ پہننا لازمی سمجھا جاتا اور یہ رسم اب بھی جاری ہے اور یہ نتھ "سہاگ نتھ" کہلاتی تھی علاوہ ازیں ماتھے پر بتیا (بندیا) بھی چسپاں کی جاتی تھی۔ کلیات سودا ج ۲ ص ۱۶۵، ۱۴۴، ۱۴۵

۴ دولہن کے لباس کا ذکر کرتے ہوئے اہلیہ میر حسن نے لکھا ہے کہ اس کا لباس عام ہندوستانی لباس کی طرح ہوتا تھا صرف کپڑے کی قسم کا فرق ہوتا تھا۔ مثلاً جھرا دار ایک کرتا۔ یا اسی قسم کا کوئی بہت ہی قیمتی لباس۔ یہ کرتا سامنے سے کھلا ہوتا تھا اور بیس گز کپڑے سے تیار ہوتا تھا۔ کرتا چست اور لمبی باہیں ہوتی تھیں۔ اس لباس میں سونے چاندی کا کام ہوتا تھا۔ یہ ہندو طرز کا لباس تھا اور مغلیہ دربار میں استعمال ہوتا تھا اور جامہ کہلاتا تھا۔ Observations etc. P. 190

[4] شادی کے دن دولہن کے لباس اور زیورات وغیرہ کے لئے ملاحظہ ہو۔ Observations etc P. 203,

میر حسن دہلوی نے ایک شاہزادی کی شادی کے موقع پر اس کے گھر کا منظر یوں پیش کیا ہے

جب آئی وہ دولہن کے گھر پر برات — کہوں وانکے عالم کی کیا تم سے بات

ہوا واں کی صحبت کی رشکِ بہشت — دھرے لخلخے گرد عنبر سرشت

کھڑے بادلوں کے وہ خیمے بلند — کریں عالم نور جس کو پسند

عجب مسند اک جگمگی اور فرش — تمامی کے عالم کا چوکور فرش

بلوریں دھرے شمعدان بے شمار — چڑھیں موم کی بتیاں چار چار

نئے رنگ کے اور نئے طور کے — دھرے ہر طرف جھاڑ بلور کے

رقص و سرود کی محفل

دو زانو زری پوش بیٹھے تمام — شرابِ خوشی کے کئے نوش جام

وہ دولھا کا مسند پہ جا بیٹھنا — برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا

طوائف کا اٹھنا اک انداز سے — دکھانا وہ آ صورتیں ناز سے

کروں راگ اور ناچ کا کیا بیان — قدیمی کسی وقت کا سا سماں

وہ اربابِ عشرت کا آپس میں مل — جمانا گھرک راگ کا دیکھے دل

اور اس صف سے اک چھوکری کا نکل — جتانا ہنر اپنا پہلے پہل

الٹنا وہ پٹے کا دیدے کے تال — وہ یوٹا ساقد اور کھرے کی چال

کبھی پر ملو میں دکھاتی ادا — کہ جوں ٹوٹ کر بجلی ہووے ہوا

کبھی گت بھری ناچنا ذوق سے — کہ تیورا کے عاشق گرے شوق سے

کھڑے ہو کے دو گھونٹ حقے کے لے — چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ دے

انگوٹھے کی لے سامنے آرسی — وہ صورت کو دیکھ اپنی گلزار سی

وہ شادی کی مجلس وہ گانے کا رنگ — وہ جی کی خوشی اور وہ دل کی ترنگ

وہ پھولوں کے گہنے کناری کے ھار

وہ بیٹھی ہوئی رنڈیوں کی قطار ہے[1]

دھنگانا[2] | جب نوشہ دولہن کے دروازے پر پہونچتا تھا تو اس موقع پر دولہن کے بھائی یا دوسرے قریبی رشتہ دار یا نوکر دولھا کو بہ جبر روکتے تھے اور اپنا نیگ طلب کرتے تھے۔ اس موقع پر نوشہ حسبِ مقدرت کچھ رقم یا تحفہ دیتا تھا۔ اس رسم کو دھنگانا کہتے ہیں اور جو رقم دی جاتی ہے وہ نیگ کہلاتی ہے۔

میر حسن نے اس رسم کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"جب براتی بڑھتے بڑھتے دلہن کے مکان کے دروازے پر پہونچ جاتے ہیں تو یہاں آدمیوں کا ایک گروہ ہاتھوں میں ڈنڈے لئے زور زور سے چلاتا ہوا آتا ہے کہ "اب اس کے آگے نہ بڑھنا" نوشہ کے ہمراہی جب راستہ رکا ہوا دیکھتے ہیں تو وہیں ٹھہر جاتے ہیں، وہ فریقِ ثانی کے افراد سے آگے بڑھنے کی اجازت مانگتے ہیں کیونکہ ان کا معاملہ دولھا سے ہے اس پر بھی وہ لوگ براتیوں کو اپنا حریف سمجھتے ہوئے ان کو روکنے کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان پر ناشپاتی، لیموں، بیگن، مولی، شلجم اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ان کی طرف پھینکتے ہیں جب ان کا یہ عمل ختم ہو جاتا ہے تو ہاتھوں میں بیت لے کر وہ شور و غل مچاتے ہیں اور اس طرح بڑی افراتفری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دھکم دھکا میں لوگوں کی پگڑیاں سر سے گر پڑتی ہیں اور ایک دوسرے کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں لیکن وہ لوگ دولھا کو ہاتھ نہیں لگاتے"۔

"ان کے اندر جانے کی اس کوشش کے موقع پر دولہن کی طرف سے کچھ اور لوگ موقع پر آتے ہیں اور بآوازِ بلند التوائے جنگ کی درخواست کرتے ہیں۔ اب بالکل خاموشی چھا جاتی ہے اور وہ لوگ انکی بات سننے لگتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دولھا کے اندر داخل ہونیکے

---

[1] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۵ اس زمانے میں عام طور پر براتیں بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے نکلتی تھیں۔ گلزارِ شجاعی ص ۵۰۴ گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۶-۳۵۸ نیز Observations etc P. 304

[2] یہ راجپوتوں کی رسم ہے۔ ہفت تماشا ص ۱۴۸۔

لئے دروازہ کھولنے سے پہلے اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ راستہ کھولنے کی خدمت کے صلے میں وہ کچھ دے،

اس بات کے سنتے ہی پھر کچھ جھگڑا سا شروع ہوجاتا ہے اس موقعہ پر نوشہ کی طرف سے ایک معزز شخص براتیوں میں سے آگے آتا ہے اور کہتا ہے کہ نوشہ کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے لیکن اس کی طرف سے وہ ایک تحفہ پیش کرتا ہے۔ وہ کچھ روپیہ تقسیم کرتا ہے اور دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔" [۱]

اٹھارہویں انیسویں صدی میں یہ رسم عام تھی حضرت قاسم کی شادی کے بیان میں سودا نے کئی مرتبہ اس رسم کا ذکر کیا ہے [۲]

نیگ میں جا کے دھنگانے کے دیا اپنا سر لینے والوں نے کہا خرم و شاداں ہو کر [۲]

---

[۱] منوچی جلد سوم ص ۱۵۱، ہفت تماشا ص ۱۲۰۔

[۲] کلیات سودا۔ جلد دوم ص ۱۶۵ / ۱۹۸، ۲۶۳ / ۳۶۳

دیوڑی پر آکھڑا یوں سارا انجل لے کر!

نوشے کے نینی بھائی راہ باندھ کر کھڑے آ

کینک معتبر کوں سنگات اپنے لیکر

دیکر سیزاں یہاں سوں جاتا تبھی دیوڑی اندر

گنج اسرار (قلمی)

پنجاب میں اس کے برخلاف ایک دوسری رسم عمل میں آتی تھی جو "ہاتھ لیوا" کہلاتی تھی۔ اس رسم کے مطابق جب نوشہ دلہن کے دروازے پر پہونچتا تھا تو ایک نائی اس کا راستہ روکتا تھا اور اس کو ایک دھاگے سے ناپتا تھا اور اس موقعہ پر سوا روپیہ اس کو بطور نیگ دیا جاتا تھا۔ بعد ازاں نوشہ اندر داخل ہوتا تھا، اسی وقت دلہن دروازہ پر آکر کھڑی ہوتی تھی۔ اس کو ایک روپیہ دے کر دولہا دولہن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا تھا۔

Tribes + castes, I, P. 815

دھنگانا کے بعد دولہا کو اندر جانے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اس کے ہمراہ رشتہ دار اور نوکر چاکر بھی اندر جاتے تھے اور باقی براتی باہر ہی رک جاتے تھے۔ اندر جاکر نوشہ کو اسی طرح جس طرح کچھ دیر پہلے باہر ہوا تھا، عورتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ منوچی لکھتا ہے۔

"مندرجہ بالا ہمراہیوں کے ساتھ نوشہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ایک ایسا مقام آتا ہے ہے جہاں عورتوں کی ایک فوج ہاتھوں میں پھولوں کے گجروں سے مزین ڈنڈے لئے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ جب قضیہ ختم ہوجاتا ہے تو وہ عورتیں ایک بڑے کمرے تک نوشہ کو لے جاتی ہیں، ایک سجے ہوئے ایک بڑے تخت پر نوشہ کو بٹھادیا جاتا ہے اور سازوں کے ساتھ گانے والی عورتیں اس کے چاروں طرف آکر کھڑی ہوجاتی ہیں"[1] حرم سرا کا منظر ملاحظہ ہو:

اِدھر کا تو یہ رنگ تھا اور یہ راگ	محل میں اُدھر گوڑیاں[2] اور سہاگ
وہ گہری سی شادی مبارک وہ ڈھول	وہ ٹونے شلونے[3] وہ میٹھے سے بول
اترنے کی واں سمدھنوں کی پھبن[4]	کھلیں پھول جیسے چمن در چمن
گلوں میں پہنانا وہ ہنس ہنس کے ہار	سٹاسٹ وہ پھولوں کی چھڑیوں کی مار
دکھانا وہ بن بن کے اپنا بناؤ	وہ آپس کی رسمیں وہ آپس کا چاؤ
تھاقے[5]، ہنسی شور و غل تالیاں	سہانی سہانی نئی گالیاں[6]

مختصر یہ کہ اندر لے جاکر جب دولھا کو مسند پر بٹھا دیا جاتا تھا تو رقص و سرود شروع ہوتا تھا۔[7] بعد ازیں نکاح ہوتا تھا اور براتیوں کی خاطر و تواضع پان اور شربت سے

---

[1] منوچی ج ۳ ص ۱۵۱-۱۵۲، نادرات شاہی ص ۱۱۵۔

[2] گھوڑیاں ایک قسم کا گیت جو عورتیں شادی بیاہ کے موقع پر گاتی ہیں۔ ایسے گیت ملاحظہ ہوں۔ رسوم دہلی ص ۹۷-۱۰۰۔

[3] ایک قسم کا گیت جو شادی کے موقع پر مراثنیں گاتی ہیں۔ یہ گیت بہت فحش ہوتے ہیں۔

[4] راجپوتوں کی رسم کے مطابق اب بھی راجپوت مسلمانوں میں عورتیں برات میں نہیں جاتیں۔

[5] قہقہے۔ [6] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۵ [7] ہفت تماشا ص ۱۴۹

کی جاتی تھی[1]۔ اس موقع پر تواضع کے پانوں پر سونے اور چاندی کے ورق لگائے جاتے تھے۔ بیڑہ پان کے زیر عنوان انند رام مخلص نے شادی میں اس رسم کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"بہندوستان در ایام جشن شادیہا انواع تکلف بر برگ بالای آں ... پان ... چہ بقدر برگ پان ورقی از طلا و نقرہ ساختہ آں را بینا کار و مرصع کاری سازند و نمائش تکرونز است" [2]

نکاح کے بعد نوشہ کو زنان خانہ میں بلایا جاتا تھا اور وہاں بہت سی رسمیں عمل میں آتی تھیں۔

چلا وہ دولہا دولہن کی طرف — اُڑے جیسے بلبل چمن کی طرف
وہاں تک پہنچتے ہوئے کیا کہوں — ہوئے ٹوٹکے لاکھ بہر شگون [3]

آرسی مصحف | اس رسم کے مطابق دولہا دولہن کو سر جوڑ کر آمنے سامنے بٹھاتے تھے۔ بیچ میں تکیہ تکیہ پر قرآن شریف رکھ کر دولہا سے سورۂ اخلاص نکال کر پڑھنے اور دولہن کے منہ پر پھوں کرنے کو کہا جاتا تھا غرضکہ قرآن شریف پر آئینہ رکھ کر دولہا اور دلہن دونوں کے اوپر کپڑا ڈال دیتے تھے اور وہاں دولہا دولہن کا چہرہ دیکھتا تھا [4]۔

---

[1] ملاحظہ ہو مراثی سودا، فرخ نامہ ص ۷۹ ب، احوال خواتین ص ۲۲۳ الف، مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۶۲-۱۸۷-۱۹۲-۱۹۷-۲۰۸-

ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان — پلا سب کو شربت دیا خاصدان — ص ۱۲۶

مرزا قتیل کا بیان ہے "اگر شب عروسی سے پہلے نکاح عمل میں آگیا ہو تو دولھا کو حرم سرا میں طلب کیا جاتا ہے ورنہ نکاح کے بعد بلایا جاتا ہے اور وہی شربت جس کا ساچق کے ضمن میں ذکر آچکا ہے، پھر شب عروسی میں براتیوں کو پلاتے ہیں اگر نکاح پہلے ہوچکا ہے تو شربت دوبارہ پلایا جاتا ہے یعنی ایک بار ساچق میں اور ایکبار شب عروسی میں اور اگر پہلے نکاح ہوچکا تھا تو تین بار شربت پلایا جاتا ہے ورنہ دو بار اور ہر تینوں بار یا دونوں مرتبہ تھالی کے بھاگ جاگ جاتے ہیں۔ ہفت تماشا ص ۱۴۹-

[2] مرآۃ الاصلاح ص ۱۴۴ الف [3] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۶، گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۶۔ [4] برائے تفصیل ملاحظہ ہو رسوم دہلی ص ۱۲۴-۱۲۵-

دکھا مصحف اور آرسی کو نکال	دھرا بیچ میں سر بہ آنچل کو ڈال[۱]

اس موقع پر اور بھی رسمیں ادا ہوتی تھیں۔ میر حسن دہلوی کا بیان ملاحظہ ہو۔

وہ جلوے[۲] کا ہونا وہ شادی کی دھوم	وہ آپس میں دولھا دولہن کی رسوم
کسی نے پلائی سِروَنج[۳] آن کر	کوئی گالیاں دے گئی جان کر
گئی کوئی واں گال سے پھر لگا	گئی کوئی دولہن کی جوتی چھوا
وہ شیریں جو بیٹھی تھی شیریں بنی	نبات[۴] اس کو چنتے بنے کو بنی
چنائی نبات اس کو اس گھات سے	کہ ڈھکا[۵] دیا ہر گھڑی بات سے
زبس دل تو تھا اس کا ہر جا پہ بند	سبھی جائے اس نے چنی کر پسند
اٹھائی ڈلی اس کی آنکھوں سے یوں	کریں نوش بادام شیریں کو جوں
ڈلی وہ جو ہونٹوں کی تھی لب ملی	وہ مصری کی منہ سے اٹھائی ڈلی
کمر سے اٹھائی ڈلی اس طرح	کہ ہاں ہوں نہیں کی نہیں جس طرح
ذرا پاؤں پڑ کے اٹھانے اڑا	نہیں اور ہاں کا عجب غل پڑا[۶]

بعض گھروں میں اس موقع پر دیگر رسوم کے علاوہ ایک اور رسم ادا ہوتی تھی اور اس کے مطابق دولھا کے منہ میں لگام لگا کر، لگام دولہن کے ہاتھ میں دے دیتے تھے اور اکثر اس کو گھوڑے کی طرح کھڑا کر کے اس کی پیٹھ پر زین رکھتے تھے اور دولہن کو اس پر سوار کرتے تھے اس رسم پر

۱؎ مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۶، نیز ملاحظہ ہو۔ کلیات سودا جلد دوم ص ۱۹۰، ۱۹۲، ۱۹۷، گذشتہ لکھنو
Tribes + castes,
I, P P 817 (fn -1)· 817-838. observations etc P. 206 209-220

۲؎ دولہا دولہن کو آمنے سامنے بٹھا کر آرسی دکھانا ۳؎ یہ بھی ایک شادی کی رسم ہے۔ کلیات سودا ج ۲ ص ۱۶۵

۱۹۷، ۲۰۹، ۲۲۳، ۲۶۲۔

۴؎ نبات چنوانا۔ دولہن کے جسم کے کئی اعضا پر مصری کی ڈلیاں رکھتے تھے جو دولھا سے چنوائی جاتی تھیں۔

۵؎ جان جان کر ترسانا۔ ۶؎ مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۷، کلیات سودا ج ۲ ص ۱۶۲، ۱۹۰، ۱۹۲، ۱۹۸

عمل کرنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دوھا اور دولہن میں اتحاد پیدا ہو اور تمام عمر دولہا "ایک ایسے گھوڑے کی طرح جو اپنے سوار کا تابعدار رہوتا ہے" بھی اپنی بیوی کا تابعدار رہے۔[1] اس کے بعد سٹھنیاں گائی جاتی تھیں جو فحاشی سے بھری ہوتی تھیں اور ان میں نوشہ کے ماں باپ کی مذمت ہوتی تھی۔[2]

رخصتی | رخصتی کے وقت طرح طرح کے ٹونے اور ٹوٹکے عمل میں آتے تھے کہ اللہ دولہا دولہن کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔

سحر کا وہ ہونا وہ ٹونے کا وقت　　　وہ دولہن کی رخصت وہ رونے کا وقت[3]

اس موقع پر عام طور پر دولہن کا بھائی اُسے اپنی گود میں اٹھا کر پالکی یا ڈولی پر سوار کرتا تھا مگر کہیں کہیں دوھا خود ہی دولہن کو سوار کراتا تھا۔

بٹھانا محافے میں آخر کو لا کے　　　وہ دولہا کا دولہن کو گودی اٹھا[4]

جب دولہن کو محافہ، ڈولی یا پالکی پر سوار کر چکتے تھے اور کہار ڈولی اٹھا کر روانہ ہونے لگتے تھے تو اس وقت سے جب تک دولہن اپنے نئے گھر نہیں پہنچ جاتی تھی، راستے بھر دولہا کے گھر والے پالکی پر زر نثار کرتے چلتے تھے۔

چلے لے کے چنڈول جس دم کہار　　　کیا دو طرف سے زر اس پر نثار[5]

---

[1] ہفت تماشا ص ۱۴۹-۱۵۰　[2] ہفت تماشا ص ۱۵۰ پنجاب میں اس موقع پر کچھ اور رسمیں ادا ہوتی تھیں مثلاً "کور کلیوا" رسم کے مطابق دولہا اور شہ بالا کو کھیر کھلائی جاتی تھی۔ جوا کھیلنا۔ اس رسم کے مطابق دوھا اور دولہن آمنے سامنے بٹھائے جاتے تھے اور ان کے درمیان پانی سے بھرا ہوا ایک کونڈا رکھا جاتا تھا اور اس پانی میں ایک انگوٹھی، چھالی اور دو یا چار سکے ڈال کر لٹائے جاتے تھے۔ دولہن اور دولہا اسکو لوٹنے کی کوشش کرتے تھے جس کے ہاتھ پہلے انگوٹھی پڑ جاتی تھی اس کی فتح ہوتی تھی۔ Tribes & castes, I, P 815

[3] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۷، گذشتہ لکھنؤ ص ۳۵۹، "بابل گانا" ۳۰، شرح بیت پلائی ص ۳۶۰

[4] ایضاً ص ۱۲۸۔ اس کے برخلاف پنجاب میں دولہا اور دولہن کے دامن کو باندھ کر ان کو آگے اور پیچھے کرکے نکالا جاتا تھا۔ Tribes & castes, I, P 815

یہی رسم ویدک عہد میں بھی پائی جاتی تھی ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کا قدیم تمدن از ڈاکٹر بینی پرشاد مترجمہ مولوی اصغر حسین۔ ہندوستانی اکیڈیمی، یوپی الہ آباد ۱۹۵۰ء ص ۶۴　[5] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۸

ادبیات

غزل

جناب آلم مظفر نگری

جلوۂ حسنِ ازل کے آئینہ داروں کو دیکھ
لالہ زاروں کو سمن زاروں کو گلزاروں کو دیکھ

اہلِ دل آرام دیتے ہیں دل آزاروں کو دیکھ
برگِ گل کے سایۂ گلرنگ میں خاروں کو دیکھ

حالتیں ٹوٹے دلوں کی دیکھنی ہیں گر تجھے
جاگ ہنگامِ سحر اور ڈوبتے تاروں کو دیکھ

دولتِ دنیا تو کیا، ہیں بے نیازِ دو جہاں
منعمِ کوتہ نظر ان کے طلبگار دل کو دیکھ

زندگی کی عشرتوں میں غم سے گھبراتا ہے کیوں
خار بھی دامن میں ہیں پھولوں کے گلزاروں کو دیکھ

رفعتوں سے دے رہے ہیں اپنی یہ درسِ خودی
خامشی بھی ان کی ہے تقریر کہساروں کو دیکھ

کامیابی کی ضمانت ہے مذاقِ جستجو
زندگی میں زندگی آموز آشاروں کو دیکھ

کفر و ایماں میں نہیں باقی ہے کوئی امتیاز
رشتۂ تسبیح سے پیوستہ زناروں کو دیکھ

شبنمِ تر، بوئے گل، رنگِ چمن، موجِ ہوا
کس طرح گرمِ سفر ہیں ان سبکساروں کو دیکھ

دل کی آنکھوں سے گل و لالہ کی اک دن سیر کر
یعنی آغشتہ بخوں ان کے دل افگاروں کو دیکھ

راہ میں گرمِ سفر رہنا ہی منزل ہے تری
تو نہ منزل کو نہ منزل کے طلبگاروں کو دیکھ

تبصرہ تو خود ہی کر لے اپنی مشقِ ناز پر
اپنے خون آلودہ پیکانوں کو سوفاروں کو دیکھ

سر جھکا کر ہیں ندامت سے طلبگارِ کرم
مالکِ روزِ جزا اپنے گنہگاروں کو دیکھ

گل تو ہیں بیگانۂ رسمِ محبت اے آلم
جو لپٹ جاتے ہیں دامن سے تو ان خاروں کو دیکھ

تبصرے

العقد الثمین فی فتوح الہند از مولانا قاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری (عربی) تقطیع کلاں، ضخامت ۲۳۵ صفحات، ٹائپ جلی اور روشن، قیمت ندارد، پتہ: ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول السورتی تاجران کتب جامع محلہ بمبئی - ۳

فاضل مصنف برصغیر ہند و پاک کے نامور محقق عالم اور مصنف ہیں۔ ان کی تحقیقات کا موضوع خاص ہندوستان سے اسلام کا تعلق ہے۔ چنانچہ اب تک اس سلسلہ میں متعدد کتابیں عربی اور اردو میں ان کے قلم سے نکل کر ارباب علم و نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی زنجیر طلائی کی ایک کڑی ہے۔ اس میں موصوف نے بڑی تفصیل اور تحقیق سے یہ بتایا ہے کہ ہندوستان سے عربوں کا تعلق کب قائم ہوا۔ اور دونوں ملکوں پر اس تعلق کے اثرات کیا پڑے۔ عہد نبوت، عہد خلافت راشدہ اور پھر عہد بنی امیہ میں اس تعلق کی نوعیت کیا رہی۔ فتوحات یا تجارت و تبلیغ و اشاعت اسلام کی تقریب سے ہندوستان میں صحابہ و تابعین میں سے کون کون سے بزرگ تشریف فرما ہوئے اور ان کی وجہ سے اس ملک کی تہذیب و ثقافت اور مذہب و سیاست میں کیا انقلاب ہوا۔ زبان بڑی شستہ اور رواں ہے۔ آخر میں مضامین اور مآخذ کی الگ الگ دو فہرستیں ہیں غرض کہ بڑی ہی دلچسپ، معلومات افزا اور بصیرت افروز ہے جزاہ اللہ احسن الجزا۔ ہندوستان اور عرب کی تاریخ کا کوئی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

انوار الفریدیہ از جناب سید مسلم صاحب نظامی، تقطیع متوسط، ضخامت ۴۸۸ صفحات، کتابت و طباعت غنیمت، قیمت مجلد -/7 پتہ: خواجہ اولاد کتاب گھر، درگاہ حضرت نظام الدین اولیا نئی دہلی

حضرت بابا فریدالدین مسعود گنجشکر کے حالات میں اب تک سب سے زیادہ محققانہ تصنیف پروفیسر

خلیق احمد نظامی کی کتاب "لائف اینڈ ٹائم حضرت بابا" تھی۔ لیکن اول تو یہ کتاب انگریزی میں تھی اور زیادہ مفصل اور مبسوط بھی نہیں تھی۔ اس لیئے اردو میں خلا محسوس ہوتا تھا۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ زیر تبصرہ کتاب سے یہ خلا کسی حد تک پُر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ چشتیہ سلسلہ کی مختصر تاریخ کے بعد حضرت بابا کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، تزکیۂ نفس، اوصاف و کمالات، روحانی فیضان اور اس کے سلسلے وغیرہ یہ سب حالات بڑی تفصیل اور حوالہ سے لکھے ہیں۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ ان کا قلم ایک مورخ کا قلم ہو۔ لیکن مشائخ طریقت کے حالات میں اس عہد پر قائم رہنا مشکل ہے۔ چنانچہ یہ "طے کا روزہ" "چلۂ معکوس" اور "نماز معکوس" وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ہماری سمجھ سے باہر ہیں اور شریعت میں ہرگز ان کی کوئی سند نہیں ہے۔ بہرحال کتاب دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔

نئے مشاہدات اور معجزۂ شق القمر از جناب معین الدین صاحب رہبر فاروقی، تقطیع متوسط ضخامت ۳۰۸ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت -/7، پتہ: مکتبۂ نشأۃ ثانیہ۔ معظم جاہی ارکٹ، حیدر آباد، دکن۔

کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ معجزۂ شق القمر حق ہے۔ اس سلسلہ میں جتنے اخبار و احادیث تھیں ان کو مع سند کے یکجا کر دیا ہے اور جو لوگ قرآن سے اس معجزہ کا ثبوت نہیں مانتے ان کی تردید دلائل و براہین سے کی ہے۔ اس کے بعد موجودہ تحقیقات سے چاند کی نسبت اب تک جو کچھ معلومات حاصل ہو چکی ہیں ان کا مع حوالہ کے ذکر کر کے یہ دکھایا ہے کہ چاند پر اب تک شق قمر کے اثرات و معلومات موجود ہیں اور اس طرح سائنس کی تحقیقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر شہادت ہیں۔ اس سلسلہ میں معجزہ کی حقیقت و ماہیت اور اس سے متعلقہ مباحث پر بھی مفصل گفتگو کی ہے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسلامی جذبہ سے سرشار ہو کر بڑی محنت اور کاوش سے لکھا ہے۔ اس حیثیت سے اس کتاب کا مطالعہ معلومات میں اضافہ کا موجب ہوگا۔ لیکن علمی حیثیت سے موصوف کے متعدد افکار و آرا بلکہ دعاوی سے ہم کو اختلاف ہے مثلاً ص ۸۱ پر ان کا یہ دعویٰ کہ "انسان زمین کے سوا کسی دوسرے کرہ میں نہ رہ سکے گا" ص ۸۲ پر "معجزہ شق قمر کے نشانات کرۂ قمر پر موجود ہیں" اس سلسلے میں مصنف کا

یہ مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے کہ معجزات کے لئے باقی رہنا ضروری ہے۔ مصنف نے روش عام کی پیروی میں ص ۸۶ پر قرآن سے یہ پیش گوئی منسوب کی ہے کہ "یہودی قیامت تک ذلیل و رسوا رہیں گے" حالانکہ ایسا کہنا قرآن پر سر تا سر الزام ہے۔ ص ۱۰۷ پر مصنف کا یہ دعویٰ کہ "چاند پر آتش فشانی کیفیات نہیں پائی جاتیں" موجودہ تحقیقات اور دریافت سے غلط ثابت ہوگیا ہے۔ اسی طرح ص ۲۲۸ پر یہ دعویٰ کرنا کہ "چاند کے سوا کوئی کرہ ٹوٹا ہوا نہیں ہے" محتاج ثبوت ہے اور قرآن کی طرف اس کی نسبت جسارتِ بیجا ہے۔

امن عالم کی بنیادیں از جناب منظور حسین صاحب ریڈر انجینرنگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، تقطیع خورد، ضخامت ۱۸۰ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مذکور نہیں،
پتہ: مصنف سے ملے گی۔

اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہی امن عالم برقرار رہ سکتا ہے۔ یہ آج کل کا عام موضوع ہے لیکن آج تک اس موضوع پر زیر تبصرہ کتاب سے بہتر اور کوئی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔ لائق مصنف چونکہ سائنس کے آدمی ہیں اور اسلامیات کا فطری ذوق اور مطالعہ رکھتے ہیں اس لئے ان کی بحث سر تا سر سائنٹفک اور علمی ہے۔ انھوں نے انسانی فطرت کا تجزیہ کر کے دقتِ نظر سے ان اسباب و عوامل کا جائزہ لیا ہے جو سوسائٹی میں شر و فساد اور تخریب کا باعث ہوتے ہیں اور پھر قرآن کی تصریحات کی روشنی میں بتایا ہے کہ اسلام انسانی کردار و عمل کے ان رخنوں کو کس طرح بند کرتا ہے۔ اس مضمون کو بڑھا کر اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن مصنف کی بحث اس قدر جامع اور To the Point ہے کہ جو کچھ لکھا جائے گا وہ سب اسی کی تشریح اور توضیح ہوگا۔

ضرورت ہے کہ اس کتاب کا انگریزی اور ہندی میں ترجمہ کر کے اسے زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

حکومت ہند کا تجارتی ادارہ

حج ۱۹۷۰ء

۱- بحری جہازوں کی روانگی اور واپسی

حج ۱۹۷۰ء کے لئے ہمارے جہازوں کی بمبئی سے روانگی اور جدہ سے واپسی کا عارضی پروگرام حسب ذیل ہوگا :-

بمبئی سے روانگی / جدہ سے روانگی

رمضان عید سے پہلے

نمبر	بمبئی سے روانگی (جہاز)		تاریخ	جدہ سے روانگی (جہاز)		تاریخ
۱	ایس، ایس "محمدی"	تقریباً	۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۹ء	ایس، ایس "محمدی"	تقریباً	۲۲ر فروری ۱۹۷۰ء
۲	ایس، ایس "محمدی"	″	۲۰ر نومبر ۱۹۶۹ء	ایس، ایس "محمدی"	″	۲۴ر ″ ۱۹۷۰ء

رمضان عید بعد

نمبر	بمبئی سے روانگی (جہاز)		تاریخ	جدہ سے روانگی (جہاز)		تاریخ
۳	ایس۔ ایس۔ "سعودی"	تقریباً	۱۲ر دسمبر ۱۹۶۹ء	ایس۔ ایس۔ "سعودی"	تقریباً	۲۶ر فروری ۱۹۷۰ء
۴	ایس۔ ایس۔ "محمدی"	″	۲۰ر دسمبر ۱۹۶۹ء	″ ۔ ″ "محمدی"	″	۱۲ر مارچ ۱۹۷۰ء
۵	″ ۔ ″ ۔ "مظفری"	″	۲۷ر دسمبر ۱۹۶۹ء	″ ۔ ″ "مظفری"	″	۱۴ر مارچ ۱۹۷۰ء
۶	″ ۔ ″ ۔ "سعودی"	″	۳ر جنوری ۱۹۷۰ء	″ ۔ ″ "سعودی"	″	۲۰ر مارچ ۱۹۷۰ء
۷	″ ۔ ″ ۔ "محمدی"	″	۷ر جنوری ۱۹۷۰ء	″ ۔ ″ "محمدی"	″	۳۰ر مارچ ۱۹۷۰ء
۸	″ ۔ ″ ۔ "مظفری"	″	۱۴ر جنوری ۱۹۷۰ء	″ ۔ ″ "مظفری"	″	یکم اپریل ۱۹۷۰ء
۹	″ ۔ ″ ۔ "سعودی"	″	۲۴ر جنوری ۱۹۷۰ء	″ ۔ ″ "سعودی"	″	۱۰ر اپریل ۱۹۷۰ء
۱۰	″ ۔ ″ ۔ "محمدی"	″	۲۹ر جنوری ۱۹۷۰ء	″ ۔ ″ "محمدی"	″	۱۷ر اپریل ۱۹۷۰ء
۱۱	″ ۔ ″ ۔ "محمدی"	″	یکم فروری ۱۹۷۰ء	″ ۔ ″ "مظفری"	″	۱۹ر اپریل ۱۹۷۰ء

یقینی تاریخوں کا اعلان ہر ایک جہاز کی روانگی سے کم از کم پندرہ روز قبل کیا جائے گا

۲- پلگرم پاس

تمام حاجیوں کے لئے پلگرم پاس (حج پاسپورٹ) حاصل کرنا ضروری ہے یہ پاس بمبئی میں واقع حج کمیٹی کے دفتر سے حاصل کئے جا سکتے ہیں، عازمین حج کی سہولت کے لئے پلگرم پاس ...... کی رجسٹریشن فیس مبلغ بارہ روپے کرایہ جہاز کے ساتھ وصول کر لی جائیگی اس لئے حج کمیٹی بمبئی پلگرم پاس بنانے کی الگ سے کوئی فیس [illegible] لیگی۔

صرف واپسی ٹکٹ ہی جاری کئے جائیں گے

بمبئی تا جدّہ اور واپسی سفر

۳- کرایہ جہاز:-

فرسٹ کلاس	کرایہ مع خوراکی	محاصل صفائی جدّہ، کرایہ مکان و اخراجات ٹرانسپورٹ -	پلگرام پاس کی رجسٹریشن فیس	مجموعی رقم
بالغان	۱۶۷۰ روپے	۱۳۳ روپے	۱۲ روپے	۱۸۱۵ روپے
بچے ۲ تا ۵ سال	۸۳۵ روپے	-- --	۱۲ روپے	۸۴۷ روپے
" ۱ تا ۲ سال	۷۲۳ روپے	.. ..	۱۲ روپے	۷۳۵ "
" ۱ سال سے کم	.. ..	.. ..	۱۲ روپے	۱۲ "
ڈیک کلاس				
بالغان	۶۰۰ روپے	۱۳۳ روپے	۱۲ روپے	۷۴۵ "
بچے ۲ تا ۵ سال	۳۰۰ روپے	.. ..	۱۲ روپے	۳۱۲ "
بچے ۱ تا ۲ سال	۲۶۵ "	.. ..	۱۲ روپے	۲۷۷ "
بچے ۱ سال سے کم	.. ..		۱۲ روپے	۱۲ "

۴- پابندیاں حاجیوں کی عام صحت اور بھلائی کے پیش نظر حکومت ہند نے بعض پابندیاں عائد کی ہیں جن کے تحت مندرجہ ذیل طبقوں کے اصحاب کو سفر حج پر جانے کی اجازت نہیں دی جائیگی چنانچہ عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی درخواستیں پیش کرنیسے پہلے ان پابندیوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

(الف) جن بچوں کی عمر پانچ اور چودہ سال کے درمیان ہوگی۔

(ب) جن عازمین حج کے پاس ہندوستانی سکّے میں نقد رقم -/۱۲۵۰ روپوں سے کم ہوگی

(ج) جن لوگوں نے گذشتہ پانچ سال کے اندر یعنی ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۹ء کے درمیان فریضۂ حج ادا کیا ہے۔ ایسے اصحاب کو حج بدل پر جانے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

(د) جن خواتین کو جہاز پر سوار ہونے کے وقت پانچ ماہ یا اس سے زائد کا حمل ہوگا۔

(ھ) جو لوگ مندرجہ ذیل بیماریوں یا معذوریوں میں مبتلا ہوں گے۔

(۱) دماغی امراض (۲) تپ دق یا سل (۳) قلبی امراض (۴) شدید دمہ (۵) متعدی جذام (۶) دیگر خطرناک چھوت کی بیماریاں۔

اگر کسی شخص کی بیماری یا کسی خاتون کے حمل کی مدّت کے متعلق کوئی شبہ ہوگا تو ان کا بمبئی میں طبی معائنہ کیا جائیگا، اسلئے عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی درخواستوں میں غلط بیانی سے کام نہ لیں۔

۵- نشستیں محفوظ کرانے کا طریقہ تمام درخواست دہندگان کیلئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ وہ درخواست کے ہر فارم پر اپنا پاسپورٹ سائز کا تازہ فوٹو چسپاں کریں اور ساتھ ہی فوٹو کی تین کاپیاں بھیجیں جن کی پشت پر عازم حج کا پورا نام لکھا جائے، فوٹو کی شرط خواتین کے لئے بھی ضروری ہے تاہم پردہ نشین خواتین اس سے مستثنیٰ ہوں گی۔ ایک سال سے کم عمر کے بچوں کے فوٹو بھیجنے کی ضرورت

ہر عازم حج کو علیحدہ فارم پر درخواست کی دو نقلیں بھیجنی چاہئیں۔ اگرچہ ایک سال سے کم عمر کے بچے کا کرایہ معاف ہوتا ہے تاہم اس کی درخواست بھی علیحدہ فارم پر دو نقلوں میں ہونی چاہئے۔ اور اس پر اس کے والد یا سرپرست کے دستخط ہونے چاہئیں اس میں بچے کی صحیح عمر درج ہونی چاہئے اور اس کی تاریخ ولادت کا سرٹیفکیٹ بھی ساتھ ہونا چاہئے درخواست کے ہمراہ اس مضمون کا حلف نامہ ہونا چاہئے کہ عازم حج نے گذشتہ پانچ سال میں حج نہیں کیا۔
حلف نامہ ہونا چاہئے کہ عازم حج نے گذشتہ پانچ سال میں حج نہیں کیا۔ حلف نامہ عازم حج کے وطن ضلع یا ریاست کے اس عہدہ دار کا تصدیق شدہ ہونا چاہئے جس کا ذکر درخواست فارم میں کیا گیا ہے علاوہ ازیں عازم حج کے وطن ضلع یا ریاست میں رہنے والے کسی مستند ڈاکٹر یا حکیم کا سرٹیفکیٹ اس مفہوم کا ہونا چاہئے کہ عازم حج صحت مند اور سفر حج کے قابل ہے درخواست ہر طرح مکمل ہونی چاہئے ورنہ اس پر غور نہیں کیا جائیگا۔ درخواست کے فارم پر مندرجہ ذیل تفصیلات درج ہونی چاہئیں۔

(۱) نام جلی حروف میں (۲) والد یا شوہر کا نام (۳) جنسیت یعنی مرد یا عورت (۴) عمر (۵) تاریخ ولادت (۶) قومیت ہندوستانی یا غیر ہندوستانی (۷) پیشہ (۸) مستقل پورا پتہ۔ گاؤں۔ پوسٹ آفس ضلع ریاست۔ (۹) ہندوستان میں نامزد کردہ شخص کا نام، پتہ اور یہ کہ اس کے ساتھ کیا رشتہ ہے (۱۰) اگر درخواست دہندہ خاتون ہے تو ہمسفر محرم کا نام، رشتہ اور پتہ (۱۱) رمضان سے پہلے سفر کرنا ہے یا رمضان بعد (۱۲) کس جہاز سے سفر کا ارادہ ہے (اس جہاز کا نام اور اس کی تاریخ روانگی) اور اگر اس جہاز میں جگہ نہ مل سکے تو دوسرے جہاز کا نام اور اس کی تاریخ روانگی (۱۳) کس کلاس میں سفر کرنا ہے (۱۴) اس سے پہلے کس سنہ میں حج کیا ہے (۱۵) ارسال کردہ رقم، ڈرافٹ کا نمبر، رقم بینک کا نام اور مقام (۱۶) مطلوبہ غیر ملکی زرمبادلہ (۱۷) درخواست دہندہ کے دستخط یا نشانی انگوٹھا (۱۸) درخواست بھیجنے کی تاریخ (۱۹) نمونے کے لئے درخواست دہندہ کے دو مزید دستخط یا انگوٹھے کے نشان۔

(الف) فرسٹ کلاس

(۱) درخواست مع نقل ہونی چاہئے۔ اس میں تمام تفصیلات کی خانہ پری کی جانی چاہئے ہر بالغ کی درخواست کے ساتھ جس کی عمر چودہ سال سے اوپر ہو کرایہ کی پوری رقم ۱۸۱۵ روپے، تین تا ۵ سال کی عمر کے بچے کے لئے ۸۴۷/- روپے، ایک تا تین سال کی عمر کے بچے کے لئے ۵۳۷ روپے اور ایک سال سے کم عمر کے بچے کے لئے بارہ روپے مع حلف نامہ و ڈاکٹری سرٹیفکیٹ درخواست رجسٹرڈ ہی بھیجنی چاہئے۔

(۲) ڈی لکس کیبن (ملحقہ غسل خانہ) کے ہر برتھ کے لئے ۵۰ روپے زائد دینے ہوں گے۔ یہ رقم نقدی کی صورت میں حاجیوں کے مسافر خانہ میں اس وقت وصول کی جائیگی جب نشستوں کا تعین ہوگا۔ لہٰذا حاجیوں کو ڈی لکس کیبن کی رقم کرایہ کے ساتھ نہیں بھیجنی چاہئے۔

(۳) فرسٹ کلاس کے ہر بالغ حاجی کو اپنے ساتھ ڈیک کا صرف ایک حاجی لے جانے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ ڈیک کا حاجی بھی اسی "طبقے" کا ہو، اس صورت میں یہ درخواستیں ایک ہی لفافے میں بھیجی جائیں۔ لیکن ایک لفافے کے اندر درخواستوں کی مجموعی تعداد سات سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ ان میں ڈیک کی درخواستیں زیادہ سے زیادہ تین ہو سکتی ہیں۔

(۴) اگر فرسٹ کلاس کا ریزرویشن منسوخ کرایا گیا تو اس کے ساتھ ڈیک کا ریزرویشن ازخود منسوخ ہو جائیگا

(ب) ڈیک کلاس

درخواستیں مع نقل ہونی چاہئیں۔ ان میں تمام تفصیلات کی خانہ پری کی جانی چاہئے ہر بالغ کی درخواست کے ساتھ جس کی عمر چودہ سال سے اوپر ہو کرایہ کی پوری رقم ۷۴۵ روپے تین یا پانچ سال کی عمر کے بچے کے لئے ۳۱۲/- روپے، ایک تا تین سال کی عمر کے بچے کے لئے ۲۷۷/- روپے اور ایک سال سے کم عمر کے بچے کے لئے ۱۲ روپے مع حلف نامہ و ڈاکٹری سرٹیفکیٹ۔ درخواست وغیرہ

رجسٹرڈ پوسٹ سے ہی بھیجنی چاہیئے۔

(ج) عام ہدایات

(۱) تمام رقوم "دی مغل لائن لمیٹڈ" کے نام بنک ڈرافٹ کی شکل میں ہونی چاہیئیں۔ اور ڈرافٹ ایسا ہونا چاہیئے جسے بمبئی میں بھنایا جا سکے (بہتر ہوگا ڈرافٹ اسٹیٹ بنک آف انڈیا کے بھیجے جائیں) البتہ ایسے مقامات پر رہنے والے عازمین حج جہاں بنک کی سہولت نہیں ہے، بیمہ شدہ لفافے کے اندر کرایہ کی رقم بھیج سکتے ہیں۔ جو بنک ڈرافٹ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء سے پہلے جاری کئے گئے ہوں وہ اسی صورت میں قبول کئے جائینگے جب انھیں جاری کرنے والے بنک کے ذریعہ دوبارہ بھنانے کے قابل بنا دیا گیا ہو۔ کوئی رقم کسی اور شکل میں مثلاً منی آرڈر یا چیک کے ذریعہ قبول نہیں کی جائے گی۔ حاجی کو کسی اور کے نام کا نہیں بلکہ اپنے ہی نام کا ڈرافٹ بنانا چاہیئے، تاکہ واپسی کی صورت میں بینک سے بھنانے میں کوئی دقت نہ ہو۔

(۲) خواتین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے ہمسفر مرد (محرم) کا پورا نام، پتہ اور رشتہ بتائیں۔ ایسی خواتین اور محرم کی درخواستیں ایک ہی لفافے میں بھیجی جانی چاہیئیں

(۳) لفافے کے اوپر بھیجنے والے کا نام عازمین حج میں سے کسی ایک کا ہونا چاہیئے کسی غیر متعلقہ شخص کا نہیں، یہ امر لازمی ہے۔ یہ شرط اسلئے رکھی گئی ہے کہ عازمین حج کو ان کی درخواستوں کا نتیجہ جلد معلوم ہو سکے۔ انجمنوں، حج کمیٹیوں اور ایجنسیوں وغیرہ کو درخواست کے فارموں یا لفافوں پر اپنا نام اور پتہ نہیں لکھنا چاہیئے تمام خط و کتابت معہ قرعہ کا نتیجہ اور بی فارم وغیرہ عازمین حج سے براہ راست کی جائے گی۔

(۴) حاجیوں کو ایک سے زائد مقامات سے درخواستیں نہیں بھیجنی چاہیئیں درخواست وہیں سے بھیجی جائے جو رہائش یا کاروبار کا مستقل پتہ ہو۔

(۵) رمضان عید سے پہلے زیادہ سے زیادہ (۲۸۵۰) حاجیوں کے سفر کا انتظام کیا جائے گا، ان میں سے قرعہ اندازی کے ذریعہ (۱۴۶۰) حاجی پہلے جہاز سے بھیجے جائیں گے اور بقیہ دوسرے جہاز سے۔

(۶) والدین کے ہمراہ جانے والے ایک تا ۵ سال اور چودہ تا سولہ سال کی عمر کے بچوں کی درخواستوں کے ساتھ پیدائش کا مستند سرٹیفکٹ ہونا ضروری ہے اس کے بغیر ان پر غور نہیں کیا جائے گا۔

(۷) کسی بھی لفافے میں سات سے زیادہ درخواستیں نہیں ہونی چاہیئیں۔ اور وہ سب ایک ہی ریاست اور ایک ہی "طبقے" کی ہونی چاہیئیں۔ جس لفافے میں سات سے زیادہ درخواستیں ہوں گی اسے قبول نہیں کیا جائیگا۔

۶۔ **طبقات**۔ درخواستوں کا اندراج مندرجہ ذیل طبقوں میں کیا جائے گا۔

	نشان طبقہ
(۱) حج ۱۹۶۹ء کی ویٹنگ لسٹ پر آئے ہوئے درخواست دہندگان۔	/W/
(۲) جو درخواستیں ماضی میں دو بار مسترد ہو چکی ہیں	" " /TR/
(۳) جو درخواستیں صرف حج ۱۹۶۹ء کے لئے مسترد ہوئی تھیں۔	" " /F/
(۴) جو درخواستیں پہلی بار بھیجی جا رہی ہیں۔	

ہر ایک ریاست کا حرفِ تہجی نشان

A اترپردیش B مغربی بنگال C بہار D مہاراشٹر E کیرالا F آسام G آندھرا پردیش H جموں و کشمیر I میسور J گجرات K مدراس L مدھیہ پردیش M راجستھان N پنجاب اور ہریانہ O تری پورہ P اڑیسہ Q دہلی R منی پور S ہماچل پردیش T لکادیپ U پانڈیچری V گوا، دمن اور دیو W انڈمان و نکوبار X سکم Y ناگالینڈ Z دادر و نگر حویلی Z1 نیفا

ہر درخواست پر نمبر سلسلہ دیا جائیگا۔ اور ہر نمبر سے قبل ریاست کیلئے مقرر کردہ حرف تہجی ہوگا، درخواست کا نشان طبقہ ہوگا، اور لفافے کا نمبر سلسلہ ہوگا مثال کے طور پر مغربی بنگال سے آئی ہوئی کوئی درخواست اگر دو سال

تک مسترد ہوتی رہی ہو تو اس پر اس طرح نمبر ڈالا جائیگا۔ درخواست کا نمبر سلسلہ / لفافے کا نمبر سلسلہ / B/TR۔

(الف) طبقات ۱ و ۲:۔ وہ حاجی جنکے نام حج ۱۹۶۹ء کی "ویٹنگ لسٹ" میں تھے اور جنھیں جہاز میں جگہ نہ مل سکی یا جنکی درخواستیں دو سال یا اس سے زائد عرصے سے مسترد ہوتی رہی ہیں، انھیں امسال یقینی طور پر جہاز میں جگہ دیجائیگی بشرطیکہ انھوں نے اس سے پہلے کبھی حج نہ کیا ہو، اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں کی تعداد اس ریاست کے کوٹہ سے تجاوز نہ کرتی ہو، ایسے حاجیوں کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے "ویٹنگ لسٹ" فارم یا مسترد کی ہوئی درخواستیں اپنی تازہ درخواستوں کے ساتھ نتھی کریں اس کے بغیر ان درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

جن عازمینِ حج کے پاس حج ۱۹۶۹ء کے "ویٹنگ لسٹ" فارم یا گذشتہ دو سال کے مسترد فارم نہ ہوں وہ اپنی تازہ درخواستوں میں پرانے نمبروں کا حوالہ دیں۔ ورنہ ان کی درخواستیں ان طبقوں میں شمار نہیں کی جائیں گی۔ اگر طبقات ۱، ۲ کے عازمین حج کی تعداد ان کی ریاست کے کوٹہ سے تجاوز کر جائے تو ان عازمین حج کو ترجیح دیجائیگی جنکی عمر ساٹھ سال یا اس سے زیادہ ہو، باقی ماندہ عازمین حج کے لئے ان کی ریاست کے کوٹہ کی حد میں رہتے ہوئے قرعہ اندازی کیجائیگی۔

(ب) طبقہ ۳:۔ فرسٹ کلاس یا ڈیک کے جن عازمین حج کی درخواست گذشتہ سال یعنی ۱۹۶۹ء حج کے لئے مسترد ہوئی تھی انھیں دوسروں پر ترجیح دیجائیگی بشرطیکہ انھوں نے اس سے پہلے کبھی حج نہ کیا ہو اس لئے ان عازمین حج کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی تازہ درخواستوں کے ساتھ مسترد کی ہوئی درخواستیں نتھی کریں ورنہ انکا شمار طبقہ ۴ میں ہوگا

(ج) طبقہ ۴:۔ وہ عازمین حج جو پہلی بار درخواست بھیج رہے ہیں یا جنھوں نے پانچ سال قبل حج کیا ہے اور جو مذکورہ بالا تین طبقوں میں نہیں آتے وہ نئے عازم حج تصور کئے جائیںگے انکا شمار طبقہ ۴ میں ہوگا اور ان کی درخواستوں کی قرعہ اندازی کی جائیگی۔ انھیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے لفافے میں دوسرے طبقات سے تعلق رکھنے والے عازمین حج کی درخواستیں نہ ہوں

د (ا) جن خواتین کا تعلق طبقہ ۱ یا ۲ سے ہو، انھیں چاہیے کہ وہ اپنی درخواست میں اپنے اس محرم کا نام لکھیں جس کے ساتھ وہ سفر کرنیوالی ہیں اگر محرم اور خواتین ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں تو ان کی درخواستیں ایک ہی لفافہ میں بھیجی جا سکتی ہیں اگر محرم کا تعلق طبقہ ۳ یا ۴ سے ہے تو اسے اپنی درخواست علیحدہ لفافے میں بھیجنی چاہیے۔

(ب) جو عازمین حج ایک ساتھ سفر کرنے کے خواہشمند ہوں، مثال کے طور پر میاں بیوی، بھائی، بہن، باپ، بیٹی وغیرہ اور ان کا تعلق مختلف طبقات سے ہو، یعنی ایک کا نام ۱۹۶۹ء کی ویٹنگ لسٹ پر ہو دوسرے کی درخواست پہلی بار بھیجی جا رہی ہو، تو وہ ایک ہی لفافے میں اپنی درخواستیں بھیج سکتے ہیں لیکن یہ سب درخواستیں سب سے نچلے طبقے میں شمار کی جائیں گی، مثال کے طور پر اگر ایک درخواست تیسرے طبقے کی اور دوسری درخواست دوسرے طبقے کی اور تیسری درخواست پہلے طبقے کی ہو تو تمام درخواستیں تیسرے طبقے میں شمار کی جائیں گی۔

عازمین حج کو اس امر کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ مختلف طبقات کی درخواستیں ایک لفافے میں نہ بھیجی جائیں ہر ایک طبقہ کی درخواستوں کے لئے الگ لفافہ ہو اور ان کے ڈرافٹ بھی علیحدہ ہوں۔

۷۔ **ویٹنگ لسٹ** (۱) درخواستوں میں سے ایک مخصوص تعداد کو قرعہ اندازی کے ذریعے فرسٹ اور ڈیک کلاس کی ویٹنگ لسٹ پر لیا جائے گا اور ریزرویشن منسوخ ہونے کی صورت میں ویٹنگ لسٹ والوں کو موقع دیا جائیگا اور متعلقہ حاجی کو اس کی اطلاع فوراً دی جائے گی، (۲) جن عازمین حج کے نام ویٹنگ لسٹ پر آئیں گے انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بغیر بلائے بمبئی نہ آئیں ورنہ سفر حج کا انتظام نہ ہونے کی صورت میں کمپنی کوئی ذمہ داری قبول نہ کریگی۔ (۳) جو درخواستیں قرعہ اندازی میں کامیاب نہ ہونگی انھیں ڈرافٹ وغیرہ کے ساتھ بھیجنے والوں کو لوٹا دیا جائیگا۔

۸۔ **بکنگ کا آغاز** کمپنی کے دفتر کے کاونٹر پر کوئی درخواست قبول نہیں کی جائیگی تمام درخواستیں رجسٹرڈ یا بیمہ زدہ لفافوں میں اس طریقے سے بھیجی جائیں جو اوپر بتایا گیا ہے۔ درخواستیں ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء

تک ہمیں مل جانی چاہئیں اس تاریخ کے بعد جو بھی درخواست موصول ہوگی اُسے واپس کردیا جائیگا۔ درخواست وصول کرنیکی آخری تاریخ کے تقریباً دس روز بعد قرعہ اندازی ہوگی۔

۹- ریزرویشن کی منسوخی

(۱) اگر کوئی عازم حج اپنا ریزرویشن منسوخ کرانا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ کم از کم دس روز قبل کمپنی کو مطلع کرے، ورنہ کرایہ کی رقم واپس کرتے وقت اس میں سے دس فی صدی رقم کاٹ لی جائیگی۔ اس قاعدے کا اطلاق ویٹنگ لسٹ کے ان حاجیوں پر بھی ہوگا جنھیں جہاز میں جگہ پیش کی جائیگی اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔

(۲) اگر کوئی صاحب اپنا ریزرویشن منسوخ کرانا چاہیں گے تو انہیں اپنا "بی" فارم یا ویٹنگ لسٹ فارم واپس کرنا ہوگا اور ساتھ ہی یہ بھی بتانا ہوگا کہ ان کی ارسال کردہ رقم بینک ڈرافٹ سے بھیجی جائے یا بذریعہ منی آرڈر۔ بنک ڈرافٹ سے رقم منگانے کی صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ اسٹامپ لگی رسید پیشگی بھیجی جائے جس پر کسی گواہ کی موجودگی میں دستخط کئے جائیں۔

۱۰- جہاز کی تبدیلی

ایک جہاز کا ریزرویشن دوسرے جہاز میں تبدیل کرنے کی اجازت انتہائی مجبوری کی حالت میں دیجائیگی اور اس کے لئے کوئی تحریری ثبوت پیش کرنا ہوگا۔

۱۱- نام کی تبدیلی

ریزرویشن میں نام تبدیل کرنے کی اجازت نہ ہوگی

۱۲- آگاہی

حاجیوں کو خود اپنے مفاد کی خاطر درخواست فارم کی خانہ پُری اعلان ہذا کے مطابق کرنی چاہئے۔ اگر کوئی حقیقت چھپائی گئی یا غلط بیانی سے کام لیا گیا، تو درخواست دہندہ سفر حج سے محروم رہیگا اور اسکی کرایہ کی رقم ضبط کرلی جائیگی۔ اسکے علاوہ اسکے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جائیگی۔

۱۳- غیر ممالک کے لوگ یا غیر ملکوں میں مقیم ہندوستانی جو انٹرنیشنل پاسپورٹ پر حج کے لئے جانا چاہتے ہوں، انھیں چاہیے کہ وہ اپنی نشستیں محفوظ کرانے کے لئے مغل لائن سے رجوع کریں۔

۱۴- عازمین حج کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جدہ سے بمبئی کے لئے واپسی کا انتظام سختی کے ساتھ ترتیب وار ہوتا ہے، یعنی جو لوگ پہلے جہاز سے جاتے ہیں انہیں پہلے جہاز سے ہی واپس لایا جاتا ہے، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر کسی حاجی نے واپسی سفر کے لئے اپنی باری آنے پر جدہ میں رپورٹ نہ کی تو فی کس ۲۵ سعودی ریال جرمانہ کیا جائیگا اور اس کے بعد انکی واپسی کا انتظام اس جہاز سے کیا جائیگا جس میں جگہ مل سکیگی۔ اس شرط سے ان حاجیوں کو مستثنی کیا جاسکتا ہے جن کے بارے میں جدہ کے ہندوستانی سفارتخانہ کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ جدہ سے واپسی کے لئے جہاز کی تبدیلی ضروری تھی، حاجیوں کے درخواست فارموں کی خانہ پری اس طریقے سے ہی کی جانی چاہئے جو اعلان ہذا میں بتایا گیا ہے۔ اگر درخواست فارموں میں کسی بھی قسم کا کوئی نقص ہوا تو اس پر غور نہیں کیا جائیگا۔

سفر حج کے لئے درخواست کے فارم اور مزید معلومات کے لئے لکھئے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

ھیڈ آفس

۱۶ بنک اسٹریٹ، فورٹ، بمبئی نمبر ۱

ٹیلیفون نمبر ۲۵۶۸۳۵ چار لائنس

تار کا پتہ "مغل" MOGUL بمبئی BOMBAY

Registerd No. D. 183

AUGUST 1969

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

طابع مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآنِ کریم کے الفاظ کی شرح اور اُس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اُردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لُغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مُدرّس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اُردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کرسکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہلِ علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں "لغات قرآن" کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے۔ جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی سہولت سے نکالے جاسکتے ہیں۔ "مکمل لغات قرآن" اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات	۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد پانچ روپے	مجلد	چھ روپے
جلد دوم	"	۳۳۶	"	" پانچ روپے	"	چھ روپے
جلد سوم	"	۳۳۲	"	" پانچ روپے	"	چھ روپے
جلد چہارم	"	۳۸۶	"	" چھ روپے	"	سات روپے
جلد پنجم	"	۵۰۰	"	" آٹھ روپے	"	نو روپے
جلد ششم	"	۳۲۴	"	" پانچ روپے	"	چھ روپے

(پُوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبہ برُہان۔ اُردو بازار جامع مسجد دہلی

شمارہ ۳	جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۹ء	جلد ۶۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے دفتر برہان دہلی سے بعد مکانی کے باوجود ادارت کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھنے کی پاداش کبھی کبھی اس شکل میں بھگتنی پڑتی ہے کہ میرے علم و اطلاع کے بغیر کوئی ایک ایسا مقالہ شائع ہو جاتا ہے جو کسی اور کے لئے ہو یا نہ ہو خود میرے لئے بڑی تکلیف اور اذیت کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ گذشتہ اشاعت بابت ماہ اگست میں جو ایک مضمون "قرآن کا منہاج فکر و نظر" شائع ہوا ہے وہ ایسا ہی ہے اور اس کے وجوہ بھی ہیں۔

(۱) مقالہ نگار نے شروع کے دو تین صفحات میں اپنے ممدوح کی شان میں جو قصیدہ خوانی کی ہے برہان کے صفحات اس طرح کی مداحی سے قطعاً نا آشنا ہیں اور یہ چیز اس کے سنجیدہ علمی مذاق کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔

(۲) مقالہ نگار گفتگو کرنا چاہتے ہیں علمی موضوعات پر لیکن اندازِ نگارش ہے بالکل خطیبانہ اور یہ انگریزی کی مثل "گول سوراخ میں چوکور میخ" کا مصداق ہے اور اس لئے برہان کے ذوق اور مزاج کے خلاف ہے۔

(۳) "متشابہات" سے ہمارے نزدیک یہ مراد لینا تو صحیح ہے کہ یہ قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جن میں بعض حقائق تشبیہہ، استعارہ یا تمثیل کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان "متشابہات" میں وہ آیات بھی داخل ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے صفات یا بعض خاص اعمال بیان کئے گئے ہیں مثلاً "الرحمٰن علی العرش استوی" "یَدُ اللہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ" وغیرہ وغیرہ اور ان کے علاوہ جنت اور دوزخ کی تفصیلات جن آیات میں بیان کی گئی ہیں وہ بھی متشابہات

میں شامل ہیں، یعنی جنت کی راحتیں اور آسائشیں اور جہنم کا عذاب اور تکالیف یہ سب حق ضرور ہیں لیکن ان کی حقیقت کیا ہے؟ وہی جو الفاظ سے سمجھ میں آتی ہے؟ یا ان کی اصل حقیقت صرف اللہ کو معلوم ہے اور آیات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ محض استعارہ و تمثیل ہے کیونکہ "لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ" کے مطابق انسانی ذہن ان کی اصل حقیقت و ماہیت کا ادراک و شعور کر ہی نہیں سکتا لیکن مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ سخت مغالطہ انگیز ہے۔ ان کی تحریر (ص ۳۹) سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کا وجود کہیں الگ اور مستقل نہیں ہے۔ بلکہ یہیں اس دنیا میں راحت و اذیت کی شکل میں یہ دونوں موجود ہیں۔ اگر مقالہ نگار یا ان کے ممدوح کا سچ مچ یہی عقیدہ ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ سرتاسر گمراہی اور زیغِ مبین ہے اور قرآن کی نصوصِ صریحہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس سلسلہ میں چند آیات کے ناتمام ٹکڑوں کو نقل کر کے ان کا جو مطلب لکھا گیا ہے اس کے متعلق سردست یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہی وہ تفسیر بالرائے ہے جس کے متعلق حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

(۴) یہ سب کچھ تو خیر تھا ہی۔ مقالہ نگار نے سب سے زیادہ غضب یہ کیا ہے کہ آج کل کے چلے ہوئے "نعرۂ وحدتِ ادیان" کی تائید میں انھوں نے اسلام اور غیر اسلام دونوں کو ایک صف میں لا بٹھایا ہے اور اس سلسلہ میں قرآن کی مشہور آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی الآیۃ (البقرہ ۶۲) نقل کر کے (ص ۵۲) اس کا وہی مطلب بیان کیا ہے جو اس نظریہ کے حامل حضرات عام طور پر بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ مطلب اس آیت کے سیاق و سباق اور پورے قرآن کی تعلیمات و تصریحات اور اس کی اسپرٹ کے قطعاً خلاف ہے۔ موصوف نے اپنے اس موقف کی تائید میں امام غزالی کا ایک جملہ بھی نقل کیا ہے، لیکن ہمیں سخت افسوس ہے کہ مقالہ نگار نے امام غزالی کا یہ رسالہ التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ پڑھا ہی نہیں ہے اور اگر پڑھا ہے تو انھوں نے علمی خیانت کے جرم کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ امام غزالی نے اپنا یہ خیال ان لوگوں کے متعلق ظاہر کیا ہے جو دور

دراز کے پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کو دعوتِ محمدی نہیں پہنچی اور وہ اسلام سے پہلے کے اپنے کسی دین پر قائم ہیں (پوری بحث کے لئے دیکھئے رسالۂ مذکور ص ۱۸ و ۱۹)

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

غرض کہ یہ پورا مقام اسی نوع کے غلط اور گمراہ کن بیانات سے پُر ہے اور ہمیں اس کے برہان میں شائع ہو جانے کا سخت افسوس اور قلق ہے۔

اس موقع پر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ "وحدتِ ادیان" کا لفظ حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں استعمال کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں "دین" کا لفظ آیا ہے وہ مفرد اور واحد ہی آیا ہے جمع کے ساتھ یعنی ادیان کہیں نہیں آیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن صرف ایک دین کا قائل ہے جو حضرت آدمؑ سے لے کر بعثتِ محمدی تک جاری و ساری ہے اور جو ارتقا کے مختلف مراحل و منازل سے گذرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو گیا اور اب اس میں مزید ترقی اور اضافہ کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ اسلام بے شبہ دنیا کے سب لوگوں اور مذہبوں کے ساتھ امن و امان سے رہنا چاہتا ہے اور اسی لئے اس کے ہاں جگہ جگہ رواداری اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ نرمی، ملاطفت۔ اور مدارات کا حکم ہے لیکن جہاں تک دین کا تعلق ہے اس کی دعوت صاف لفظوں میں یہی ہے کہ پیغامِ محمدی دین کی آخری ارتقائی اور مکمل شکل ہے اور اب اس بنا پر نوعِ انسان کی دینی اور دنیوی فلاح و نجاح اس کے اتباع میں ہی مضمر ہے۔

سٹہ بازی اور اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت

مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پچھلے دنوں پاکستان سے ایک سوالنامہ میں سٹہ بازی اور اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت کا اسلامی حکم دریافت کیا گیا تھا۔ نیز یہ معلوم کیا گیا تھا کہ عدم جواز کی صورت میں اسلامی حکومت کیا متبادل انتظام کرتی ہے۔

ذیل میں پہلے سوالنامہ نقل کیا جاتا ہے پھر اس کے مندرجات کی تفصیل دی جاتی ہے۔

سوالنامہ موجودہ دنیا میں بار بار مالیاتی بحران (MONETARY CRISES) آتے ہیں اور ہر بحران پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ساری دنیا تباہی کے کنارے آگئی ہے۔ علماء معاشیات نے اس مسئلہ پر جتنا بھی غور و خوض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سب کچھ کے پیچھے اصل علت سٹہ بازی (SPECULATION) ہے۔ اس ضمن میں چند سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ شریعت کی روشنی اس کا حل فرما کر ہماری ذہنی الجھن کو دور کریں گے۔

(۱) کیا سٹہ بازی (SPECULATION) اسلام میں کلیتہً ناجائز ہے، اگر ہاں تو کیوں؟

(۲) موجودہ دور میں اسٹاک ایکسچینج (STOCK EXCHANGE) پر جو حصص اور تمسکات کا کاروبار ہوتا ہے اس میں سٹہ بازی کو بہت دخل ہے لیکن وہاں پر سٹہ بازی کی مختلف شکلیں رائج ہیں۔ ان میں سے چار اہم صورتیں درج ذیل ہیں:

(۱) زید جس کے پاس الف لمیٹیڈ کمپنی کے ... ۱۰ حصص ہیں، محسوس کرتا ہے کہ آئندہ تھوڑے عرصہ میں ان حصص کی قیمت گر جائے گی تو وہ اس خیال سے کہ اگر وہ اب ان حصص کو فروخت کر دے

تو قیمت گرنے پر انھیں حصص کو دوبارہ سستے داموں پر خرید سکتا ہے، اپنے حصص فروخت کر دیتا ہے اس کو اصطلاحاً BEARISH ACTIVITY کہتے ہیں۔

(ب) زید سوچتا ہے کہ آئندہ تھوڑے عرصہ میں الف لمیٹڈ کمپنی کے حصص کی قیمت چڑھنے والی ہے لہٰذا وہ اس کمپنی کے حصص ابھی خریدنے کی جلدی کرتا ہے تاکہ جب قیمتیں چڑھیں تو وہ ان حصص کو مہنگے داموں بیچ دے اس کو اصطلاحاً BULLISH ACTIVITY کہتے ہیں۔

(ج) زید اخبار میں الف لمیٹڈ کمپنی کا اشتہار برائے فروختنی حصص (PROSPECTUS) دیکھتا ہے، زید فی الاصل کوئی سرمایہ کاری نہیں کرنا چاہتا لیکن پھر بھی وہ کچھ حصص (مثلاً ... احصص) کے لئے درخواست دے دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ درخواست پر مطلوبہ قسط بھی ادا کر دیتا ہے پھر وہ حالات کو بھانپتا ہے۔ اگر وہ محسوس کرے کہ ان حصص کی قیمت بازار میں چڑھ جائے گی تو وہ قیمت چڑھنے تک انتظار کرتا ہے اور قیمت چڑھتے ہی انھیں فروخت کر دیتا ہے۔ اس حالت میں کہ اس نے ان حصص پر صرف ایک قسط APPLICATION MONEY ادا کی ہوتی ہے اور وہ اس قسط پر اپنا منافع کما لیتا ہے لیکن اگر وہ محسوس کرے کہ ان حصص کی قیمت میں اضافہ ہونے کا امکان کم ہے تو وہ اپنی درخواست واپس لے لیتا ہے اور اُسے اپنی پہلی قسط بھی واپس مل جاتی ہے۔ کیا اس طرح سے درخواست دے کر واپس لینا شرعاً جائز ہے؟ کیا درخواست اور پہلی قسط کے دے دینے پر معاہدہ بیع مکمل نہیں ہو جاتا اور پھر اسے توڑنا جائز نہیں ہے؟ اس مثال میں زید کو اصطلاحاً STAG کہا جاتا ہے۔

(د) زید اپنے دلال (STOCK BROKER) بکر سے یکم مارچ ۱۹۶۹ء کو ٹیلی فون پر کہتا ہے کہ وہ (یعنی بکر) زید کے لئے الف لمیٹڈ کمپنی کے ... احصص خرید کے رکھ لے اور یہ کہ زید ان حصص کی ادائیگی ۱۵ مارچ کو کرے گا۔

بکر عمر سے حصص خرید لیتا ہے اور اپنے پاس رکھ لیتا ہے، مہینے کی پندرہ تاریخ کو زید بکر کو ٹیلی فون پر کہتا ہے کہ چونکہ اس کے پاس (یعنی زید کے پاس) اس وقت تک پیسوں کا کوئی انتظام

نہیں ہو سکا لہٰذا وہ ادائیگی مزید ۱۵ دن (یعنی ۳۰ مارچ تک) کے لئے ملتوی کر دے۔ اس کو اصطلاح میں CONTAGO کرنا یا CARRY OVER کرنا کہتے ہیں۔

ادھر بکر کو ادائیگی بہر صورت کرنا ہے لہٰذا بکر کسی بنک سے یا کسی اور جگہ سے ۱۵ روز تک کا قرض لے کر عمر کو ادائیگی کر دیتا ہے اب ۳۰ مارچ کو زید مارکیٹ کا بھاؤ دیکھتا ہے تو بھاؤ چڑھ چکا ہوتا ہے لہٰذا زید بکر کو کہتا ہے کہ میرے حصص فروخت کر دو جو نفع ہو اس میں سے قرض پر کا سود، اپنا کمیشن اور دوسرے قانونی اخراجات کاٹ کر باقی مجھے ادا کر دو۔ چنانچہ بکر ایسا ہی کرتا ہے لیکن اگر ۳۰ مارچ کو قیمتیں گر چکی ہوں تو نقصان بھی زید ہی کو اٹھانا پڑتا ہے، اس صورت میں نفع اور نقصان دونوں کا ذمہ دار زید ہے۔

کیا شرعاً یہ کاروبار جائز ہے؟ فرض کیا کہ ہم اس میں سے سود کو نکال دیں تو کیا پھر بھی یہ ناجائز ہی ٹھہرے گا؟

براہِ کرم ان چاروں صورتوں کے بارے میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

(۳) اگر اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت ناجائز ہے تو پھر ایک اسلامی حکومت میں مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں (JOINT STOCK COMPENIES) کے حصص کی خرید و فروخت کا کیا متبادل انتظام ہوگا؟

سوال نامے میں مندرجات کی تفصیل یہ ہے۔

مندرجات کی تفصیل — سٹہ بازی

سٹہ بازی دراصل مستقبل کی سودا بازی ہے جس میں دو فریق محض تخمین و اندازہ سے قیمتوں کے گھٹنے اور بڑھنے پر معاملہ کرتے ہیں یعنی ایک فریق کا اندازہ آئندہ قیمت بڑھنے کا ہوتا ہے اور دوسرے کا اندازہ آئندہ قیمت گھٹنے کا ہوتا ہے۔ پھر دونوں اپنے اپنے اندازہ کو بنیاد بنا کر آپس میں ایک معاہدہ کرتے ہیں جس میں نفع و نقصان کا فیصلہ غائب سودے پر قبضہ کے بغیر کر لیا جاتا ہے۔

چنانچہ مدت گزرنے کے بعد جس شخص کا اندازہ صحیح ثابت ہوتا ہے اس کو قیمت کے فرق کی نسبت

سے نفع ہوتا ہے اور جس کا اندازہ غلط ثابت ہوتا ہے اس کو اسی نسبت سے نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

قیمت کے گھٹنے اور بڑھنے کا اندازہ جس طرح اشیاء میں ہوتا ہے اسی طرح حصص و تمسکات میں بھی ہوتا ہے۔

اشیاء کی صورت یہ ہے مثلاً:

زید اور بکر کے درمیان یہ معاملہ طے ہوا کہ تین ماہ کے بعد زید بکر سے سو من گیہوں ۴۰ روپے من کے حساب سے خریدے گا۔ مدت گزرنے کے بعد دونوں بازار جاکر صحیح قیمت معلوم کرتے ہیں اگر اس وقت گیہوں کی قیمت چالیس روپیہ فی من ہے تو دونوں میں کسی کو نہ نفع ہوتا ہے اور نہ نقصان ہوتا ہے لیکن اگر اندازہ کے مطابق اس وقت قیمت بڑھ گئی ہے یعنی ۴۰ روپے فی من کے بجائے ۴۲ روپے من ہو گئی ہے تو زید بکر سے دو روپے من کے حساب سے وصول کرے گا اسی طرح دوسرے شخص کے اندازہ کے مطابق اگر اس وقت گیہوں کی قیمت گھٹ گئی ہے یعنی ۴۰ کے بجائے ۳۸ روپے من ہو گئی ہے تو زید نقصان میں رہے گا اور اس کو دو روپے فی من کے حساب سے دینا پڑے گا۔

حصص و تمسکات کی صورت یہ ہے۔ مثلاً:

زید کو یہ اندازہ ہوا کہ یکم جنوری سے قیمت بڑھ جائے گی تو اس نے ۳ ماہ پہلے حصص و تمسکات خرید لئے کہ قیمت بڑھنے کے بعد ان سے زیادہ نفع اٹھایا جائے گا اسی طرح یکم جنوری سے قیمت گھٹنے کا اندازہ ہوا تو ۳ ماہ پہلے حصص و تمسکات بیچ دئے کہ آئندہ پھر سستے داموں خرید کر ان سے نفع اٹھایا جائے گا۔

اندازہ کرنے والے اپنے اپنے اندازہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے عموماً غلط افواہیں پھیلاتے ہیں۔ تاکہ آئندہ بازار کا نرخ ان کے موافق ہو جائے۔ مثلاً ایک فریق یہ افواہ پھیلاتا ہے کہ حکومت اپنی ضرورت کے لئے اتنا مال خریدنے والی ہے، یا باہر کے ملک سے مال نہ آسکے گا، کارخانوں میں ہڑتالیں ہوں گی اور رسد طلب کے مقابلے میں کم ہو جائے گی، پھر ان سب کے نتیجہ میں لازمی طور سے قیمتیں

چڑھیں گی، یا دوسرا فریق یہ افواہ پھیلاتا ہے کہ باہر سے مال ضرورت سے زیادہ آرہا ہے اور مال کی طلب گھٹ گئی ہے جس کے نتیجہ میں قیمتوں کا گر جانا یقینی ہے وغیرہ۔

اسٹاک ایکسچینج | اسٹاک ایکسچینج اس "ادارہ" کو کہتے ہیں جو حصص و تمسکات کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہے اس کا تعلق مشترکہ سرمایہ کی کمپنی سے ہے۔

مشترکہ سرمایہ کی کمپنی | مشترکہ سرمایہ کی کمپنی JOINT STOCK COMPANY دراصل بہت سے لوگوں کی ایک انجمن ہوتی ہے جس میں مشترکہ سرمایہ کاروباری اغراض کے لیے لگایا جاتا ہے اور نفع و نقصان کو آپس میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ابتداء میں یہ کمپنی کم از کم سات افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ افراد جگہ کا انتخاب کرتے ہیں، سرمایہ کا تخمینہ لگاتے اور کاروبار کی نوعیت وغیرہ بنیادی امور طے کر کے اپنا سرمایہ لگاتے ہیں پھر بعد میں بہت سے افراد حصہ دار بن کر شریک ہوتے اور علیحدہ ہوتے رہتے ہیں۔

کمپنی کو قانونی شکل دینے کے لئے مختلف چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً رجسٹرار کے پاس کاغذات (دستاویز) داخل کرنا، شمولیت اور کام شروع کرنے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا اور قانونی کارروائی پوری ہونے کا اعلان کرنا وغیرہ۔ ان سب کے بغیر کوئی کمپنی کام شروع کرنے کی مجاز نہیں ہو سکتی۔

کمپنی کا انتظام ڈائریکٹروں کی ایک جماعت کے سپرد ہوتا ہے جس کو تمام حصہ دار مل کر منتخب کرتے ہیں۔ یہ جماعت تنخواہ دار ہونے کے ساتھ کمپنی میں حصہ دار بھی ہوتی ہے۔۔۔۔

اسے بورڈ آف ڈائریکٹرز کہتے ہیں۔ حصہ داروں کا اجلاس سال میں ایک مرتبہ ضروری ہوتا ہے جس میں درج ذیل مختلف امور انجام پاتے ہیں:

(۱) ڈائریکٹروں اور آڈیٹروں کا انتخاب۔ (۲) پالیسی اور اصول وضع کرنا

(۳) سال بھر کی رپورٹ پیش کرنا۔ (۴) منافع کی تقسیم اور اسکی مقدار کا اعلان کرنا وغیرہ

کمپنی میں سرمایہ حاصل کرنے کی شکلیں | کمپنی میں سرمایہ حاصل کرنے کی دو شکلیں ہیں۔

(۱) وہ جو چھوٹے چھوٹے یونٹ (UNITS) کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے جیسے شیرز SHARES (حصص) کہتے ہیں۔

(۲) وہ جو تمسّکات کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے، جیسے انگلستان میں ڈبینچر (DEBENTURE) اور امریکہ میں بونڈ (BOND) کہتے ہیں۔

ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

حصص (۱) سرمایہ حاصل کرنے کی پہلی شکل SHARES (حصص) کی ہے۔ یہ ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے بلکہ لوگوں کی سہولت کے پیش نظر کمپنی مختلف قسم کے چھوٹے بڑے بے شمار SHARES (حصص) جاری کرتی ہے۔ جن پر باقاعدہ نمبر پڑے رہتے ہیں اور ان کے خریدنے والوں کو ایک سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔

حصص کی بڑی تقسیم یہ ہے:

(۱) وہ جن کو دوسرے حصّوں پر ترجیح دی جاتی ہے اور ایک مقررہ شرح کے اعتبار سے نفع دیا جاتا ہے ان کو PREFERENCE SHARES (ترجیحی حصّے) کہتے ہیں۔ ترجیحی کی کئی صورتیں ہیں۔

(الف) بعض وہ ہیں جن کو صرف سال رواں کے نفع میں ترجیح دی جاتی ہے۔ تھوڑا بہت جس قدر بھی نفع ہو اور اگر سال رواں میں بالفرض نفع نہ ہو تو ان کو کچھ نہیں ملتا۔

(ب) بعض وہ ہیں جن کو اگلے سال کے نفع سے بھی دینے کی شرط ہوتی ہے یعنی اگر سال رواں کا نفع ترجیحی حصہ داروں کے لئے کافی نہیں ہوتا تو اگلے سال کے نفع سے پہلے یہ بقایا ادا کیا جاتا پھر اس کی تقسیم ہوتی ہے۔

(ج) بعض حصہ داروں کا سرمایہ کمپنی ایک عرصہ کے بعد واپس کر دیتی ہے ان کو بھی حسب معاہدہ نفع میں ترجیح دی جاتی ہے۔

(د) بعض حصہ دار پہلے اپنا ترجیحی حصہ وصول کرتے ہیں پھر سب حصہ داروں کے لینے کے بعد جو باقی بچتا ہے اس میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

(۲) وہ جو ترجیحی حصوں کے بعد ادا کئے جاتے ہیں ان کو ORDINARY SHARES (معمولی حصے) کہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں ان کے لئے ایک حد مقرر ہوتی ہے۔

(۳) وہ جنکی ادائیگی ترجیحی اور معمولی دونوں حصوں کے بعد کی جاتی ہے۔ ان کو DEFERRED SHARES (ملتوی شدہ حصے) کہتے ہیں۔

(۴) وہ جو ترجیحی اور معمولی نیز ایک مقررہ رقم اندوختہ میں ڈالنے کے بعد ادا کئے جاتے ہیں ان کو FOUNDERS SHARES (بانیوں کے حصے) کہتے ہیں۔

بانیوں کے حصوں کی تعداد بالعموم بہت محدود ہوتی اور جب نفع زیادہ ہوتا ہے تو ان کی قیمت بڑھ جاتی ہے نیز یہ حصے ان کی خدمات کے صلہ میں بقیہ رقم سے آدھی چوتھائی کی نسبت سے دئے جاتے ہیں۔

تمسکات سرمایہ حاصل کرنے کی دوسری شکل تمسکات (بونڈ یا ڈیبنچر) کی ہے۔ کاروبار چلانے کے لئے کمپنی قرض لیتی اور تمسکات کو قرض کی تصدیق (تحریری دستاویز) کے طور پر جاری کرتی ہے جس پر سود کی ایک خاص شرح بھی ادا کرتی ہے۔

تمسکات کئی قسم کے جاری کیے جاتے ہیں مثلاً:

(۱) وہ جن پر کمپنی کے اثاثہ کی ضمانت ہو۔ ان کو مکفول تمسکات کہتے ہیں۔

(۲) وہ جن پر کمپنی کے اثاثہ کی ضمانت نہ ہو ان کو معمولی تمسکات کہتے ہیں۔

(۳) وہ جن کی ادائیگی ایک مخصوص تاریخ یا نوٹس ملنے پر کردی جاتی ہے۔

(۴) وہ جن کی ادائیگی عام طور سے کمپنی کے قیام تک نہیں کی جاتی۔

تمسکات کی ایک اور تقسیم "بیرر" (BEARER) اور "رجسٹرڈ" کی کی جاتی ہے

"بیرر" وہ جو صرف دستخط کرنے سے منتقل ہوجاتے ہیں۔

"رجسٹرڈ" وہ جو بغیر کمپنی کے رجسٹرڈ کرائے نہیں منتقل ہو سکتے۔

حصص اور تمسکات میں فرق حصص و تمسکات (شیرز اور بونڈ) میں درج ذیل

قسم کے فرق بیان کیے جاتے ہیں:

(۱) شیئرز ہولڈر کمپنی کے حصے دار ہوتے ہیں۔ جبکہ تمسکات کے مالک کمپنی کے قرض خواہ ہوتے ہیں۔

(۲) کمپنی جب ختم ہونے لگتی ہے تو پہلے تمسکات کے مالکوں کی ادائیگی کی جاتی ہے شیئرز ہولڈر کی ادائیگی بعد میں ہوتی ہے۔

(۳) تمسکات حصص کے مقابلے میں زیادہ محفوظ سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مالک نفع و نقصان میں شریک نہیں ہوتے۔

(۴) شیئرز ہولڈر کی آمدنی میں کمی بیشی کے لحاظ سے نفع میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے لیکن تمسکات کے مالک مقررہ شرح سود سے زیادہ نہیں حاصل کر سکتے۔ اگرچہ کتنی ہی آمدنی ہو۔

دلالوں کی معرفت حصص اور تمسکات کی خرید و فروخت:

کمپنی کے چھوٹے بڑے حصص اور تمسکات کی بھی مال منقولہ کی طرح خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں ان کی خرید و فروخت مستقل کاروبار کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے اور اسٹاک ایکسچینج کے نام سے مستقل ادارہ قائم ہے۔ نیز خرید و فروخت کے معاملے میں مدد دینے کے لئے دلال (بطور پیشہ) کمیشن پر دلال مقرر ہیں۔ جس کو اپنا حصہ بیچنا ہوتا ہے وہ اس کو اسٹاک ایکسچینج میں دلالوں کی معرفت جمع کر دیتا ہے اسی طرح جس کو خریدنا ہوتا ہے وہ اسٹاک ایکسچینج سے دلالوں کی معرفت خرید لیتا ہے۔[1]

کمپنی کے نظام میں فوائد کے ساتھ خرابیاں:

اس میں شک نہیں کہ موجودہ طریق پیداوار میں مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کو بڑی اہمیت حاصل

---

[1] حوالہ اور مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اصولِ معاشیات ج ۱ پروفیسر ٹاسگ۔ اصول معاشیات ج ۱، ڈاکٹر محسن، مقدمہ معاشیات دانٹروڈکشن ٹو اکنامکس) اصولِ معاشیات حصہ دوم باب ۵ محمد الیاس۔ پرنسپل اکنامکس ج ۲ باب ۶۔

ہے، ان کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر کاروبار چلانے کے لئے زیادہ سرمایہ جمع ہونا اور صنعت وحرفت نیز تجارت کو فروغ دینے میں بڑی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔

لیکن فوائد کے ساتھ کمپنی کے موجودہ نظام میں چند در چند خرابیاں بھی بیان کی جاتی ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔ مثلاً:

(۱) کمپنیوں کا یہ نظام اس قدر واسطہ در واسطہ اور پیچیدہ ہے کہ اس کو اجتماعی شکل دینا نہایت مشکل کام ہے۔

(۲) خرید وفروخت کے ذریعہ حصوں کا ہر وقت منتقل ہوتے رہنا اس کاروبار کا خاص گُر ہے لیکن اس منتقلی میں دھوکہ دہی، ناانصافی، اجتماعی مفاد کی قربانی اور ناجائز استحصال وغیرہ قسم کی بہت سی بُرائیاں پائی جاتی ہیں۔

ڈائریکٹر و منیجر وغیرہ چونکہ کمپنی اور مارکیٹ کی حالت سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اس بنا پر جب وہ کمپنی کی حالت خراب دیکھتے ہیں تو اپنے حصوں کو فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جب اس کی حالت اچھی ہوتی ہے تو اپنے ایجنٹوں اور رشتہ داروں کے ذریعہ زیادہ حصے خرید لیتے ہیں۔

ڈائریکٹر و جنرل منیجر وغیرہ کے اختیارات اب اگرچہ پہلے کے مقابلے میں محدود ہو گئے ہیں لیکن کاروبار کا یہ سرمایہ دارانہ نظام ہی کچھ اس قدر پیچیدہ ہے کہ مذکورہ قسم کی برائیوں سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔

(۳) خرید وفروخت کے وقت ہر شخص صرف اپنے مفاد کو مدنظر رکھتا اور مشترکہ مفاد کو بالکلیہ نظرانداز کر دیتا ہے۔

(۴) یہ کمپنیاں بڑی حد تک قرض (ادھار) پر چلتی ہیں جس کی بنا پر ہمیشہ سود کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

(۵) اس نظام سے اجارہ داری بڑھتی اور سرمایہ ایک طبقہ میں محدود رہتا ہے جس سے

امارت وغربت میں توازن برقرار رکھنے کی صورت نہیں رہ جاتی۔

(۶) دلالوں کا ایک پیشہ ور درمیانی طبقہ ابھر آتا ہے جو صرف اپنے کمیشن سے دلچسپی رکھتا ہے خواہ بازار کا بھاؤ گھٹے یا بڑھے جس طرح قمار خانہ کے مالک اور گھوڑ دوڑ کے منتظمین کو اصل دلچسپی اپنے کمیشن سے ہوتی ہے۔ ہار جیت سے ان کو کوئی بحث نہیں ہوتی۔

خرابیوں کے بارے میں چند ماہرین معاشیات کی رائے:

ذیل میں ماہرینِ معاشیات کی چند رائیں نقل کی جاتی ہیں جن سے مذکورہ بیان کی تصدیق ہوتی ہے (ماہرین کی یہ رائیں کمپنی کے بہت سے فوائد تسلیم کرنے کے بعد ہیں) مور لینڈ صاحب کہتے ہیں:

"اس قسم کا کاروبار سراسر قمار بازی معلوم ہوتا ہے محض مستقبل کے حالات کے اندازہ پر لوگ کاروبار کرتے ہیں...... پس اگر کوئی ناتجربہ کار طلب و رسد کے پورے پورے حالات جانے بغیر یونہی ایسا کاروبار شروع کردے تو یقیناً جلد اس کا دیوالہ نکل جائے گا[1]"

دوسری جگہ ہے:

"آج کل کے مکمل بازاروں میں تاجروں کی بڑی بڑی جماعتیں رہتی ہیں جن کا یہی خاص کام ہے کہ رسد و طلب کے متعلق ضروری حالات معلوم کریں اور اپنی معلومات کی بنا پر اندازہ لگائیں[2]۔"

پروفیسر ٹاسگ کہتے ہیں:

"موجودہ زمانہ کے کارپوریشن یا انجمن سرمایہ مشترک کے حصے داروں میں مشترکہ

---

[1] مقدمہ معاشیات (انٹروڈکشن ٹو اکنامکس) باب ۴، فصل ۲۷، ص ۲۴۳

[2] ایضاً فصل ۱۶، ص ۱۵۵۔

اغراض کے لئے اجتماعی مسائل کا احساس بالکلیہ مفقود ہوگیا ہے .... ہر شخص محض اپنے ہی ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اور متوقعہ نقصان کی صورت میں اس کاروبار سے ہاتھ اٹھالیتا ہے۔ جس طرح کہ چوہا ڈوبتے وقت اس جہاز کو چھوڑ دیتا ہے جس میں اب تک پناہ لئے ہوئے تھا یا اگر اس کو اس کاروبار میں آئندہ زیادہ منافع ملنے کی توقع معلوم ہوتی ہے تو اپنی ذاتی منفعت کی خاطر دوسرے ساتھ والے حصہ داروں سے حصص کثیر تعداد میں خرید لیتا ہے۔ جب کمپنی کے حالات خراب ہوں تو حصے فروخت کر دینا اور جب حالات رو بہ اصلاح ہوں تو خرید لینا۔ یہ کاروبار کا خاص گر ہے[۱]۔"

پھر آگے چل کر ہے:

"لیکن لمحہ بھر کے لئے بھی یہ خیال نہیں پیدا ہوتا کہ اس سے کسی اخلاقی اصول کی شکست و ریخت ہوگی یا انصاف کا خون ہوگا[۲]۔"

ایک اور جگہ ہے:

"تمسکات کے خریداروں اور فروشندوں کی پوری جماعت ایک دوسرے کو دھوکا دینے کی تاک میں رہتی ہے[۳]۔"

جان اے ٹاڈ کہتے ہیں۔

"رقم کی فوری ضرورت پر بینک اہل معاملہ کو جو قرض دیتے ہیں اور حصص و تمسکات بطور ضمانت اپنے پاس رکھتے ہیں ان کی قیمت قرضہ سے زائد ہوتی ہے دوسرے بینک اس قسم کا کاروبار بہت محدود طریقے پر کرسکتے ہیں، اس لئے دلالوں کا ایک

۱و۲ اصول معاشیات ج ۱، باب ۶، ص ۱۰۱۲۔

۳ پرنسپلز آف اکنامکس ج ۲، باب ۶، ص ۸۸ از اسلام کے معاشی نظریئے۔

خاص طبقہ اس کو انجام دینے کے لئے رونما ہو گیا ہے۔ اس کو راہن دلاّلی کہتے ہیں اور عملاً حصص وتمسکات کو رہن کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔"[1]

غرض کمپنی کے موجودہ نظام میں ماہرین معاشیات نے کئی قسم کے نقائص بیان کئے ہیں، جن کے بارے میں پروفیسر ٹاسگ نے یہاں تک کہا ہے کہ:

"تخمینی قمار بازی کے نقائص جتنے قطعی اور یقینی ہیں اسی طرح وضع آئین و قوانین کے ذریعہ سے ان کو روکنا یا ان کا استیصال کرنا انتہائی مشکل چیز ہے۔"[2]

پھر آگے چل کر ہے:

"بایں ہمہ تخمینی قمار بازی کے نقائص اس قدر عظیم ہیں کہ ان کو کم کرنے کی غرض سے کچھ خطرات برداشت کئے جا سکتے ہیں ...... سب سے زیادہ مؤثر علاج ہوگا کہ تمام صنعتوں کے لئے ایک زیادہ بہتر اخلاقی معیار مقرر کیا جائے اور قمار بازی کی سب قسموں کے خلاف عوام میں رائے پیدا کی جائے۔"[3]

ذیل میں مبادلہ کی چند صورتوں کا اسلامی حکم بیان کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ سٹہ بازی اور اسٹاک ایکسچینج کا اسلامی حکم دریافت کرنے میں سہولت ہو۔

مبادلہ کی وہ صورتیں جن میں ذخیرہ اندوزی و اجارہ داری وغیرہ قسم کی خرابیاں پائی جاتی ہیں

(۱) کچھ لوگ شہر سے کئی میل کے فاصلہ پر تجارتی قافلہ سے ملاقات کرتے اور اس سے سستے دام مال خرید کر شہر میں مہنگے دام فروخت کرتے تھے اس کو "تلقی جلب" کہتے ہیں۔

(۲) کچھ لوگ گویا بازار کی سول ایجنسی لے لیتے یعنی تاجروں کے ایجنٹ (دلال) بن کر بیٹھ کر لیتے ہیں کہ بازار میں باہر سے جو مال آئے گا وہ انھیں کے توسط سے فروخت ہوگا۔ اس کو

---

[1] مبادلات باب ۳، ص ۲۲ و ۲۴۔

[2] و [3] اصول معاشیات باب ۱۱، ص ۱۶، ۱۷ و ۲۱۔

"بیع الحاضر لباد" کہتے ہیں۔

(۳) کچھ لوگ تجارتی قافلوں اور غلہ کے تاجروں سے رسد کا ذخیرہ خرید لیتے۔ اور ضرورت کے باوجود روک کر جب اور جس دام چاہتے فروخت کرتے تھے۔ اس کو "احتکار" کہتے ہیں۔

ان صورتوں میں چونکہ اجارہ داری، ذخیرہ اندوزی، طلب و رسد کے قدرتی تناسب میں خلل اندازی اور ناجائز استحصال وغیرہ قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں اس بنا پر ان سے منع کیا گیا ہے۔

ان صورتوں کی ممانعت سے متعلق حدیثیں چنانچہ پہلی صورت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تلقوا الرکبان بیع [1]	خریداری کرنے کے لئے قافلوں سے نہ ملاقات کرو۔

دوسری روایت میں ہے:

لا تلقوا الجلب فمن تلقی فاشتری منہ فاذا أتی سیدہ لا بالسوق فھو بالخیار [2]	غلہ لانے والے تاجروں سے نہ ملاقات کرو۔ اگر کسی نے (شہر آنے سے پہلے) ان سے مل کر غلہ خرید لیا اور شہر آنے کے بعد بازار بھاؤ کا پتہ چلا تو مہنگا ہونے کی صورت میں ان کو اختیار ہے چاہے تو معاملہ باقی رکھیں اور چاہے تو فسخ کر دیں۔

ایک اور روایت میں ہے:

لا تلقوا السلع حتی یھبط بھا الأسواق [3]	تجارتی سامان سے نہ ملاقات کرو یہاں تک کہ اس کو بازار میں اتارا جائے۔

دوسری صورت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] بخاری و مسلم کتاب البیوع [2] مشکوۃ باب المنھی عنھا من البیوع۔ [3] ایضاً

لا یبیع حاضر لباد [۱] — شہر (بازار) کا آدمی دیہات (باہر) کے تاجر سے بیع کا معاملہ نہ کرے۔

دوسری جگہ ہے:

لا یبیع حاضر لباد دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم ببعض [۲] — شہر (بازار) کا آدمی دیہات (باہر) کے تاجر سے بیع کا معاملہ نہ کرے۔ لوگوں کو چھوڑ دو۔ اللہ بعض کو بعض کے ذریعہ روزی پہنچاتا ہے۔

طاؤس (راوی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے مذکورہ حدیث کا مطلب پوچھا تو انھوں نے فرمایا:

لا یکون لہ سمسارا [۳] — شہر کا آدمی دیہات کے تاجر کا دلال نہ بنے۔

"بیع حاضر لباد" کی تعبیر دو طرح منقول ہے۔

(۱) پہلی یہ کہ بازار کا آدمی باہر کے تاجر سے (بحیثیت دلال) کہے کہ تم اپنا مال آج کے بھاؤ نہ فروخت کرو بلکہ میرے پاس رہنے دو تاکہ میں اس کو بھاؤ چڑھنے پر گراں قیمت فروخت کروں۔ [۴]

(۲) دوسری یہ کہ بازار کا آدمی ضرورت کے باوجود اہل شہر کے ہاتھ غلہ نہ فروخت کرے بلکہ سادہ لوح دیہاتیوں کے ہاتھ گراں قیمت فروخت کرے۔ [۵]

تیسری صورت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احتکر فھو خاطی [۶] — جس نے احتکار کیا وہ گنہگار ہے۔

دوسری روایت میں ہے:

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یحتکر الطعام [۷] — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ میں احتکار کرنے سے منع فرمایا۔

---

[۱] مسلم کتاب البیوع۔ [۲] ایضاً [۳] بخاری پ، باب ھل یبیع حاضر لباد [۴] حاشیہ مشکوٰۃ باب النہی عنہا من البیوع۔ [۵] ہدایہ ج ۳ فصل فیما یکرہ [۶] ابو داؤد کتاب البیوع [۷] بیہقی کتاب البیوع۔

ایک اور روایت میں ہے :

المحتکر ملعون [1] — احتکار کرنے والا ملعون ہے۔

یہ ممانعت صرف غلّہ کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ حالات کی رعایت سے تمام ان چیزوں کو شامل ہے جن کے احتکار سے عام لوگوں کو تکلیف ہو۔

کل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتکار وإن کان ذهبا أو فضة أو ثوبا [2] — ہر وہ چیز جس کے روکنے سے عام لوگوں کو نقصان پہنچے وہ احتکار ہے اگرچہ سونا، چاندی اور کپڑا ہو۔

مذکورہ صورتوں کی بنیاد تخمین پر بتائی جاتی ہے

مذکورہ صورتوں کی بنیاد تخمین پر بتائی جاتی ہے کیونکہ چند افراد مال پر قبضہ مستقبل کے اندازہ کے بغیر نہیں کرتے ہیں اگرچہ تخمین عام حالت میں پیچیدگی نہیں پیدا کرتی بلکہ اس کی پیچیدگی خاص حالت تک محدود رہتی ہے

پروفیسر ٹاسگ کہتے ہیں :

"تخمین کا میلان اور شوق رکھنے والے اس قسم کے کاروبار میں حصّہ لینے کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ کسی شے کی کل رسد کو خرید کر اس پر قابو جما لیتے ہیں اور اس کے بعد اگر ممکن ہو تو اس کو بہت زیادہ منافع پر فروخت کرتے ہیں" [3]

دوسری جگہ ہے :

"عوام ان تخمینی احتکاروں سے بالکل بے تعلق نہیں رہتے، عوام کی بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جو ملتوی نہیں ہو سکتیں اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بازاری قیمت پر اشیاء خریدنا ناگزیر ہوتا ہے" [4]

چند وہ صورتیں جن میں دھوکا فریب اور مستقبل کی سودا بازی وغیرہ قسم کی خرابیاں پائی جاتی ہیں	(۱) کچھ لوگ دودھ دینے والے جانور کے تھنوں میں کئی وقت کا دودھ روک لیتے تاکہ تھنوں میں

---

[1] طیبی شرح مشکوۃ کتاب البیوع [2] ہدایہ ج ۴ کتاب الکراہیۃ

[3] اصول معاشیات ج ۱، ب ۱۵، ص ۲۱۰ [4] ایضاً ص ۲۱۲

زیادہ دودھ دیکھ کر خریدار زیادہ قیمت لگائے۔

(۲) کچھ لوگ بھیگے ہوئے غلّہ کو نیچے چھپا دیتے اور خشک غلہ کو اوپر کرکے کُل کو خشک کے دام فروخت کرتے تھے۔

(۳) کچھ لوگ دودھ کو تھن میں، گھی کو دودھ میں، نطفہ کو پیٹھ میں، حمل کو پیٹ میں اور شکار کو جال میں فروخت کرتے تھے۔

اس قسم کی صورتوں میں چونکہ دھوکہ، فریب، جہالت اور مستقبل کی سودا بازی وغیرہ جیسی برائیاں پائی جاتی ہیں اس بنا پر ان سے منع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ :

ان صورتوں کی ممانعت سے متعلق حدیثیں پہلی صورت کے بارے میں رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا تصروا الإبل والغنم[۱]	اونٹنی اور بکری کے تھنوں میں دودھ نہ روکو

دوسری روایت میں ہے :

من اشتری شاۃ مصراۃ فھو بالخیار ثلثۃ ایام[۲]	جس شخص نے وہ بکری خریدی جس کے تھن میں دودھ جمع کیا گیا تھا اس کو تین دن تک معاملہ باقی رکھنے اور فسخ کرنے کا اختیار رہے۔

دوسری صورت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واقعہ ہے :

إن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرّ علی صبرۃ طعام فادخل یدہ فیھا فنالت أصابعہ بللا فقال ماھذا یاصاحب الطعام قال أصابتہ السماء	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلّہ کے ایک ڈھیر کے پاس تشریف لے گئے۔ جب آپ نے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈالا تو اس میں تری محسوس کی۔ غلہ والے سے پوچھا یہ تری کیسی ہے؟ اس نے جواب دیا

[۱] مشکوٰۃ باب المنھی عنھا من البیوع [۲] مسلم کتاب البیوع۔

یا رسول اللہ قال أفلا جعلته فوق الطعام حتی یراہ الناس من غشنی فلیس منی [۱]

کہ یا رسول اللہ غلہ بارش سے بھیگ گیا ہے آپ نے فرمایا کہ تم نے اس بھیگے ہوئے کو اوپر کیوں نہیں کیا۔ یاد رکھو جس شخص نے فریب کیا وہ مجھ سے نہیں ہے۔

تیسری صورت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات یہ ہیں:

نھی ان یباع فی ضرع وسمن فی لبن [۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ دودھ تھن میں اور گھی دودھ میں بیچا جائے۔

دوسری روایت یہ ہے:

نھی عن المضامین والملاقیح وحبل الحبلۃ والمضامین ما فی أصلاب الإبل والملاقیح ما فی بطونھا وحبل الحبلۃ ولد ولد ھذہ الناقۃ [۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مضامین، ملاقیح اور حبل الحبلہ کی بیع سے منع فرمایا۔ مضامین وہ نطفہ جو اونٹ کی پشت میں ہے ملاقیح وہ حمل جو اونٹنی کے پیٹ میں ہے، اور حبل الحبلہ سے مراد اونٹنی کے بچہ کا بچہ ہے۔

بعض لوگوں نے مضامین سے، حمل اور ملاقیح سے نطفہ مراد لیا ہے اسی طرح حبل الحبلہ سے اس مدت تک کوئی وعدہ یا معاملہ مراد لیا ہے جس میں اونٹنی کے بچہ پیدا ہو پھر اس بچہ کے بچہ پیدا ہو [۴]

تیسری روایت ہے:

نھی عن شراء ما فی بطون الأنعام حتی تضع وعن بیع ما فی ضروعھا وعن شراء العبد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمل کے خریدنے سے منع فرمایا جو جانوروں کے پیٹ میں ہے، دودھ کی بیع سے منع فرمایا جو تھنوں میں ہے، غلام کے خریدنے

---

[۱] مشکوٰۃ و مسلم باب النھی عنھا من البیوع۔ [۲] ابن ابی شیبہ فی مصنفہ عن طریق عکرمہ۔
[۳] عبدالرزاق فی مصنفہ عن ابن عمر و حاشیہ ہدایہ ج ۲، کتاب البیوع۔ [۴] حاشیہ ہدایہ ج ۲، کتاب البیوع۔

وھو آبق وعن شراء المغانم حتی تقسم وعن شراء الصدقات حتی تقبض وعن ضربة القائص[1]	سے منع فرمایا جو بھاگا ہوا ہے تقسیم سے پہلے مالِ غنیمت کے خریدنے سے منع فرمایا، قبضہ سے پہلے صدقات کے خریدنے سے منع فرمایا، اور ایک مرتبہ جال ڈالنے سے جو شکار ملے اس پر معاملہ کرنے سے منع فرمایا۔

بعض نے ضربة القائص سے ان موتیوں پر خرید و فروخت کا معاملہ مراد لیا ہے جن کو غوطہ لگانے والے پہلی مرتبہ غوطہ سے حاصل کرے[2]۔

ایک روایت میں عمومی حیثیت سے دھوکہ و فریب کی تمام شکلوں سے منع فرمایا ہے:

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الغرر[3]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکہ کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ (باقی آئندہ)

[1] ابنِ ماجہ و دار قطنی [2] حاشیہ ہدایہ ج ۲ کتاب البیوع [3] مسلم و مشکوٰۃ۔

تاریخ قطبی

تصحیح ڈاکٹر سیّد مجاہد حسین زیدی پر ایک نظر

از جناب ڈاکٹر محمد خالد صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

علاوہ ازیں مرتب کو وزن شعر کا بھی احساس نہیں ہے۔ اکثر مصرعے وزن سے خارج ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ص ۱۲۲ س ۸ — بند در یک شکارستاں نمی ماند — شکار افگن شکار افگن ہمی راند

یہاں پہلے مصرعہ میں بند کی وجہ سے نہ وزن ٹھیک ہے اور نہ معنیٰ واضح ہیں، کوئی اور لفظ ہوگا

ص ۱۲۷ س ۱۱ — زقحط آتش دیگ دانہا بمرد — چہ قحطی کہ آتش ازاں جاں نبرد

اس شعر میں پہلا مصرعہ بے معنیٰ اور خارج از وزن ہے۔

ص ۱۳۳ س ۲ — حسینی نبو سید آں بے وفا — کہ آخر نزد سیلی در قفا

یہاں سیلی نہیں سیلئی ہونا چاہئے ورنہ مصرعہ خارج از وزن ہوگا۔

ص ۱۵۰ س ۱۸ — یکی قلزم آہن آید بموج — نہنگان راہ جلوہ گر فوج فوج

دوسرے مصرعہ میں راہ کی وجہ سے مصرعہ وزن سے خارج ہے۔ رہ ہونا چاہئے۔

ص ۲۲۲ س ۱۷ — بہ بیتم تا خود بہنگام جنگ — کہ گردد چو موم وگہ باشد چو سنگ

پہلا مصرع وزن سے خارج ہے دوسرے مصرعہ میں گہ کی جگہ کہ ہونا چاہیئے۔

ص ۲۳۶ س ۱۴ — ہمیں خواہد ایں چرخ جفا کوش — کہ بی نیستی نہ بخشد شربت نوش

دوسرا مصرعہ بے معنیٰ اور وزن سے خارج ہے، پہلے مصرعہ میں جفاکیش ہونا چاہیئے اور دوسرا مصرعہ حاشیہ کے مطابق ہونا چاہیے۔

ص ۲۶۶ س ۱۰ — دوسرا مصرعہ: بہ کردن کار کار مانیست، معلوم نہیں کیا ہے۔

ص ۲۶۷ س ۹ — پہلا مصرعہ: ای نادان غافل درچہ کاری، اس مصرعہ کے شروع میں لفظ تو رہ گیا ہے اس لیے مصرعہ وزن سے خارج ہے۔

ص ۴۴۴ س ۱۴ — زلبس کافتادکا نرا داد میداد — جہاں را عدل نوشیروان شد ازیاد

دوسرے مصرعہ میں نوشیروان کی جگہ نوشروان ہونا چاہیئے ورنہ مصرعہ وزن سے گر جائے گا۔ پہلے مصرعہ میں 'کافتادکانرا' کے بجائے 'افتادگان را' ہونا چاہیے۔

ص ۵۹۴ س ۱۱ — چو پرسد تاریخش ای دل بگوی — ہمایوں بود وارث ملک وی

مصرعہ اول وزن نادرست، پرسد کی جگہ پرسند ہونا چاہیے۔ اور دوسرے مصرعہ میں وی کی جگہ 'اوی' ہونا چاہیئے۔

ذیل میں بعض مقامات سے اس کتاب کی چند غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے

ص ۳ س ۱۱ — بمد اومت شکار و رسوم و آئین رزم و پیکار۔ اس عبارت میں رسوم کے پہلے مباشرت کا لفظ ہونا چاہیے، جیسا کہ حاشیہ میں درج ہے۔

ص ۵ س ۱۴ — بی منازعی، غلط، بی منازعی ہونا چاہیے۔

س ۱۵ — بحکومت سمرقند آنحدود نصب فرمودند و عنان عزیمت را ...... اس میں سمرقند کے بعد واؤ عاطفہ ہونا چاہیے۔

ص ۶ س ۴ — رای زرین کوئی چیز نہیں، رای رزین ہونا چاہیے، یہی غلطی ص ۱۴۶ پر

دوبارہ ہے مگر ص ۱۹۸ پر رای رزین صحیح لکھا ہے۔ رزین کے معنی پختہ ہیں اور اس کا استعمال اسی اس طرح ہوا ہے۔

ص ۶ س ۱۲ باد رسید غلط، باور رسید صحیح ہے۔

ص ۷ س ۵ پیش نماند، بیش نماند صحیح ہے۔

" س ۷ دست جلالت غلط، دست جلادت ہونا چاہیئے۔

" س ۱۶ چوں مور بر روی قبر یہاں قبر کی جگہ قیر ہونا چاہیئے۔

" س ۱۹ سر لطف خفی کے بجائے لطف حقی ہونا چاہیئے۔

ص ۸ س ۲ خدای عزوجل را یہاں را کے بجائے مر ہونا چاہیئے۔

س ۵ خاک چینیں بی تنگی بر فرق نام خود بختند یہاں بختند کے بجائے بیختند ہونا چاہیئے۔

ص ۹ س ۳ لؤلؤ لالا بدون اضافت غلط ہے۔

س ۱۰ نرگس شرف تاج زر از رنج بجز یافت یہاں بجز غلط ہے۔

س ۱۹ چوں ایں منبر محمد بیگ ... رسید محمد بیگ سے پہلے حرف اضافت بہ ہونا چاہیئے۔

ص ۱۰ س ۳ گر از کوہ پرسی بیای جواب بیای کی جگہ بیابی ہونا چاہیئے۔

س ۱۱-۱۰ آں دو بزرگ را ازاں منزل تاریک سپاہ بیروں آوردہ یہاں سپاہ غلط ہے 'وسیاہ' ہونا چاہیئے یعنی منزل تاریک وسیاہ۔

س ۱۲-۱۱ درخور دنایت ہمت خود اسپی لاغری وشتری عنکبوت پیکر بالبشاں عطا فرمود خوردنایت غلط ہے، درخور دنایت ہونا چاہیئے۔ اسپی لاغری کی جگہ اسپ لاغری یا اسپے لاغر ہونا چاہیئے۔

س ۱۳ مبارک شاہ سنجری غلط مبارک شاہ سجزی صحیح ہے۔

ص ۱۰ س ۱۳ ریاض دولتش بہ سبزۂ پیروزی آراستہ گشت اس جملہ میں پروزی غلط پیروزی صحیح ہے۔

ص ۱۱ س ۲ مبارک شاہ سنجری کی جگہ مبارک شاہ سجزی ہونا چاہیئے۔

س ۱۲ پانژدہ غلط، پانزدہ ہونا چاہیئے۔

س ۱۳ جمعی کثیر وجم غفیر، یہاں جمّی غفیر ہونا چاہیئے۔

ص ۱۲ س ۲-۱ باندک مدتی رتبہ وشان بکثرت رجال و وفور اموال ... ازسائر الوسات ممتاز بودند وسمت تقدم داشتند در مقام اطاعت وانقیاد در آمدند

اس عبارت میں دو بنیادی غلطیاں ہیں۔ اول رتبہ وشان کے پہلے حرف اضافت 'بہ' یا 'در' ہونا چاہیئے۔ دوم داشتند کے بعد حرف عطف ہونا چاہیئے یا پہلے کے جملے شرطی ہونے چاہئیں موجودہ صورت میں اس کا مطلب خبط ہے۔

ص ۱۲ س ۵ چوں در دیوان قضا پرداز وقدر مقرر شدہ بود اس جملہ میں قضا کے بعد پرداز غیر ضروری ہے یا پھر حاشیہ کی عبارت مناسب ہوگی یعنی چوں در دیوان قضا پروانچہ قدر مشیت ومقررنہ شدہ بود ('نہ' بہرحال غلط ہے۔)

س ۸ ادبار نکبت کے بجائے ادبار ونکبت ہونا چاہیئے۔

ص ۱۳ س ۱ حق برادرو خواہری یہاں حق برادری وخواہری ہونا چاہیئے۔

ص ۱۵ س ۱۵ القصہ بر در زمان غبار کدورت ... بالا گرفتہ، یہاں بر در زمان کے بجائے در زمان ہونا چاہیے۔

س ۱۹ بساط مسارفت را درہم نوردیدہ یہاں مصارفت کی جگہ مصادقت ہونا چاہیے۔

ص ۱۷ س ۱۳ جمعی مردم بے غرض دیدہ عرض کردہ بودند، دیدہ زاید ہے

ص ۱۸ س ۳ کمر کوشش واجتہاد برمیان مردمی بستہ، مردمی غلط، مردی ہونا چاہیے۔

ص ۲۲ س ۱۰ بی مداہنہ ، بی مداہنہ ہونا چاہیے

س ۱۴ ہمی کاشتم تخم و پیچ و بزہ بظاہر تخم بیخ و بزہ صحیح ہونا چاہئے۔

س ۱۶ کہ آن داستان روعلنت پاک ، روعنست غلط ہے۔

س ۱۷ بدیں می بیزد کرنجند و خرد اس میں دو غلطیاں ہیں۔ بیزد صحیح نہیں ہے، کوئی دیگر لفظ ہوگا۔ کرنجند کی جگہ گرنجند صحیح ہوگا۔

ص ۲۸ س ۹ باقبال بشت صاحبقراں زفرق ہمہ مملکت شاداں

دوسرے مصرعہ میں فرق کی جگہ نسخہ بدل میں فرش لکھا ہے۔ صحیح لفظ فرش ہونا چاہئے ورنہ مصرعہ وزن سے خارج ہوجائے گا۔

ص ۲۹ س ۱۲ رواں گشت فرمان صاحبقراں کہ اغرق سوی کش آید رواں

دوسرا مصرعہ وزن سے خارج ہے، بسوی ہونا چاہئے۔

ص ۳۰ س ۳ جف القلم ماہو کاین اس میں ما کی جگہ بما ہونا چاہیے۔

س ۱۵ ہر ہنری کہ درد مجال سودای سروری باشد بتیغ فنا بردارد و ہر کس را کہ اندیشۂ سرکشی و برتری بخاطر راہ یابد زندہ بگذارد

اس میں ہر ہنری غلط، کوئی دیگر لفظ از قسم سرداری، سروری وغیرہ ہونا چاہئے، درد غلط، درو صحیح ہے۔ زندہ بگذارد کی جگہ زندہ نگذارد صحیح ہے۔

ص ۳۰ س ۱۷ تاترقی کردن شاخ کہن سرنکشد شاخ نواز سروبن

پہلا مصرعہ وزن سے خارج اور بے معنی ہے

ص ۳۱ س ۱ لاجرم اسباب زوال و امساک بغایت کمال بر مزاج او غالب شد، یہ جملہ بے معنی ہے، حاشیہ کی عبارت صحیح ہے۔

س ۱۳ سعی پیش از بیش ، بیش از بیش صحیح ہے۔

ص ۳۱ س ۱۹ بیجانگاہ بیجایگاہ صحیح ہے اور یہ کئی جگہ اسی طرح سے غلط لکھا ہے۔

ص ۳۳ س ۸ ماہیم دوست و دامن اولاد مصطفےٰ یہاں مائیم ودست ہونا چاہئے۔

ص ۳۴ س ۱۵ خودنمای می کردند کی جگہ خودنمائی ہونا چاہیئے۔

ص ۳۵ س ۱۷ برآں سخت ہم اعتماد نمودہ سخت کی جگہ سخن ہونا چاہئے۔

ص ۳۶ س ۳ کہ نہاں شدم من اینجا مکندم آشکارا، مکندم کی جگہ مکنیدم ہونا چاہیے۔
مکنیدم بمعنی مکنید مرا۔ مکند فارسی کا کوئی لفظ نہیں۔

ص ۳۷ س ۲ خدمتش را کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

ص ۳۸ س ۱۴ تشریف بودند کی جگہ تشریف داشتند ہونا چاہیے، جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۳۹ س ۱۷ امید رار کی جگہ امید وار ہونا چاہیے۔

س ۱۸ جہت الکلام مالا کلام ہونا چاہیے۔

ص ۴۰ س ۸ پانژدہم کی جگہ پانزدہم ہونا چاہیے۔

ص ۴۲ س ۱۴ وگر کی جگہ دگر ہونا چاہیے۔

س ۱۷ بگمردند کی جگہ بگروند ہونا چاہیے۔

س ۱۹ پروانگان کے بعد واؤ ہونا چاہیے۔

ص ۴۴ س ۸-۷ باسطرلاب (س ۱۲،۱۴) فتح وفیروزی ارتقاع اختر خجستہ فال اقبال بازجست
یہاں ارتقاع کے بجائے ارتفاع ہونا چاہیے۔

ص ۴۴ س ۱۴ طیرو سپر دیار یہاں طیر کی جگہ کوئی دوسرا لفظ ہوگا، طیر بے معنیٰ ہے

ص ۴۵ س ۶ فراز کے بجائے فرار ہونا چاہیے۔

س ۱۴ سغیداز کی جگہ غالباً سغید دُز ہونا چاہیے

س ۱۷ زاں حصاری کہ طرف بارۂ او درعلواز سیارہ دار دعار

دوسرے مصرعہ میں لفظ سیارہ واضح نہیں ہے۔ ستارہ سے وزن ٹھیک ہوگا ورنہ

مصرعہ وزن سے خارج ہوجائے گا۔

ص ۴۷ س ۱۵ روس کی جگہ الوس ہونا چاہیے۔

ص ۵۰ س ۱۱ بسفر حجاز توجہ نماید اس جملہ کو Inverted Commas میں نہ ہونا چاہئے۔

س ۷ یہاں بنیان واضح نہیں ہے۔

س ۱۶ در تصرف بینمود یہاں تصرف مینمود ہونا چاہیے۔

ص ۵۱ س ۷ مگر بتیغ مراد و راطلاق نتواں داد یہاں نتواں داد ہونا چاہیے۔

س ۱۴ در کنج کے بجائے در گنج ہونا چاہیے۔

ص ۵۲ س ۴ مصرعہ دوم: کند بیش از اندیشہ آنجا گذار، یہاں بیش کے بجائے پیش ہونا چاہیے۔

س ۱۵ عرادہ و مجانیق کی جگہ عرادہ و منجانیق ہونا چاہیے۔

س ۱۷ آستین توانای کی جگہ آستین توانائی ہونا چاہیے۔

ص ۵۵ س ۲۱-۲۰ بسمرقند بردو بنوکران امیر حسین یہاں برد کے بجائے بردند ہونا چاہیے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۵۶ س ۹-۸ بیگم را و فور سعادت و اقبال بیدرق بجنود عون و تائید حضرت ذوالجلال بسمرقند آوردند۔ یہاں ہمراہ وفور سعادت یا با وفور سعادت ہونا چاہیے۔ حاشیہ میں ’وخود‘ ’وفور‘ کا مصحف ہے۔

س ۱۹ مصرعہ اول میں کزین کے بجائے گزین ہونا چاہیے۔

ص ۵۷ س ۲ مصرعہ دوم میں صرصر کرو کی جگہ صرصر گرد ہونا چاہیے۔

س ۳ مصرعہ دوم میں بوی کی جگہ ’بہ‘ ہونا چاہیے۔

س ۱۷ مصرعہ دوم میں بجکیز غلط ہے۔

س ۱۸ مصرعہ اول میں خدمت کرا کی جگہ خدمت گرا ہونا چاہیے۔

ص ۵۸ س ۵ سپہری برانا سپہر پُر از ماہ ہونا چاہیے۔

س ۸ مراسم رعایت میں مراسم زاید ہے

س ۲۱ دوسرے مصرعے میں دبا کی جگہ ویا ہونا چاہیے۔

ص ۶۷ س ۹ ملک را ذرہ بردہ غولان غور زغولان غوری کہ دیدہ غرور
پہلے مصرعے میں زرہ اور دوسرے مصرع میں زغولان غوری کی جگہ نہ غولان غوری ہونا چاہیے۔

ص ۶۸ س ۵-۶ انتظار کارزار شاہدۂ کوشش نبرد آزمایان تیغ کرار سیر میفرمود
انتظار سیر فرمود غلط معلوم ہوتا ہے۔

س ۷ قوت یکی در ہزار شد میں قوت یکی را صحیح ہے یعنی در کے بجائے را ہونا چاہیے۔

س ۸-۹ نرد مان ایک لفظ ہے، نرد کو سطر کا آخری لفظ اور بانہا کو دوسری سطر کا پہلا لفظ قرار دینا نہایت فاحش غلطی ہے۔

س ۱۵ وزان دو لفظ نہیں بلکہ ایک لفظ ہے۔ وزیدن سے اسم حالیہ

ص ۶۹ س ۱ مصرعہ دوم میں اخگری غلط ہے، اختری ہونا چاہیے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

س ۳ چوں ملک غیاث الدین را مشاہدۂ آں کارزار کارخویش را زار دید اس جملہ میں غیاث الدین کے بعد را کے بجائے از ہونا چاہیے۔

ص ۷۰ س ۸ حصار و مزلیق پندار بیرون آمدہ اس میں حصار و مزلیق غلط ہے، حصار مزلیق ہونا چاہیے، واؤ زاید ہے

ص ۷۱ س ۲ اوان کے بجائے آوانی ہونا چاہیے۔

س ۳ رسیدند کے بجائے رسانیدند ہونا چاہیے، حاشیہ میں صحیح ہے

ص ۱۰۳ س ۱۲ بنولیستت غلط ہے نبولیست ہونا چاہیے۔

ص ۱۰۷ س ۶ مصرعہ دوم: زقف مہرگل در پاش چون مرجان یہ مصرعہ واضح نہیں اس سے کوئی معنیٰ نہیں نکلتے۔

ص ۱۰۸ س ۱۲ مصرعہ دوم میں وگر کی جگہ دگر ہونا چاہیے۔

ص ۱۱۰ س ۲۳ مصرعہ اول میں خوفی کی جگہ خونی۔

س ۲۴ مصرعہ دوم میں برخواست کی جگہ برخاست۔

ص ۱۱۱ س ۱۸ مصرعہ دوم میں کرای کی جگہ گرای۔

ص ۱۱۲ س ۱۸ آب دود آنکہ یہ غلط ہے۔

ص ۱۱۳ س ۱۴-۱۵ بعضی ولایات راکہ تدم اطاعت وانقیاد برجادہ متابعت دود اونہادہ بودند تاخت کردہ اس میں 'جادہ متابعت دوداو' کے بجائے جادہ متابعت و وداد صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ص ۱۱۸ س ۱۳ بیشتر رفتہ کے بجائے پیشتر رفتہ ہونا چاہیے۔

ص ۱۲۰ س ۱۸ احوال غلط ہے چول ہونا چاہیے جیساکہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۱۲۲ س ۱۷-۱۴ ازکثرت غنائم وافرکہ دریورشہا بپای از فتوحات متواتر بدست جلادت عساکر گردون مآثر می افتاد باساتیان معسکر ظفر اثر از روی مکنت واسباب برامرای دیگر عہد و زمان فائق بودند اس میں دو جگہ غلطی معلوم ہوتی ہے، ایک 'بپای' زاید معلوم ہوتا ہے اور باساتیان مشتبہ ہے اور جملہ جو کہ Subordinate Clause میں ہونا چاہیے وہ نہیں ہے۔

ص ۱۲۴ س ۳ کافۂ کے بجائے کافہ ہونا چاہیے۔

ص ۱۲۵ س ۳ بیجابگاہ غلط ہے، بیجائگاہ ہونا چاہیے۔

س ۶ اکناف وولایات اس میں واو زاید ہے۔

ص ۱۲۷ س ۴ دریائی غلط ہے دریائی ہونا چاہیے۔

ص ۱۲۷ س ۷-۶ میں رسیدہ بود کی تکرار حذف ہوجانا چاہیے۔

ص ۱۲۸ س ۱۰-۹ بعرض رسانیدند چوں صاحبقران نظر بران سپاہ انگند بعرض رسانیدند کی جگہ پر بعرض گاہ حاضر شدند زیادہ صحیح ہے، جیساکہ حاشیہ میں ہے

ص ۱۳۲ س ۳ یہاں پر مفعول غائب ہے، تمور کے بعد شخصی یا کسی فرستادہ جیسے لفظ ہونا چاہیے۔

ص ۱۳۳ س ۲ مصرعہ اول میں ژال کے بجائے زال ہونا چاہیے۔

ص ۱۳۵ س ۶ عزو شانہ کے بجائے عزشانہ ہونا چاہیے، واو زاید ہے۔

س ۱۰ عالم السرو اظفیات میں ایک رکن واحد ایک رکن جمع مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

س ۱۳ گورکہ غلط ہے، اس کے بجائے کورگہ یا کورکہ ہونا چاہیے۔

ص ۱۳۶ س ۱۸ سلاوزبان غلط معلوم ہوتا ہے۔

س ۱۹ تیرے کا لفظ بظاہر غلط ہے۔

ص ۱۳۷ س ۲-۱ وخاک آں معرکہ را بیابان باخون مخالفان برآمیختند بیابان کی یہ جگہ نہیں ہے۔ اگر بیابان کو معرکہ کا مصاف سمجھا جائے تو بھی عبارت ٹھیک نہیں ہوتی۔

س ۶ قوشرن کی جگہ قوشون ہونا چاہیے۔

س ۹-۸ فدای دار و بست از جان شستہ یہاں فدائی وار از دست جان شستہ ہونا چاہیے۔

ص ۱۳۸ س ۴ مصرعہ دوم میں بھگین کی جگہ سھگین ہونا چاہیے۔

س ۵ مصرعہ دوم میں انباشتہ کی جگہ انپاشتہ ہونا چاہیے۔

س ۲۰ برکشادند کا مفعول غائب ہے، اس کے بعد واو عطف بھی ہونا چاہیے۔

ص ۱۳۹ س مہلتی و مہابای یہاں مہابای غلط معلوم ہوتا ہے۔

س ۱۳ لاجرم درمیان سیلاب چنان بیشتر درمیان دو سیلاب جیساکہ حاشیہ میں ہے درست ہے

ص ۱۴۰ س ۱۲-۱۱ بعضی از ترکان بزرگوار دراری سپہر شہریاری و در بحر سلطنت و کامگاری بودند برحسب اشارت فانکحوا ماطاب لکم من النساء باکرائم حلائل در سلک ازدواج انتظام داد یہاں ترکان بزرگوار کے بعد حرف موصول "کہ" محذوف معلوم ہوتا ہے۔ دراری غلط ہے، اس لئے کہ اگر ترکان بزرگوار مفعول نہ ہوگا تو "انتظام داد" کے فاعل کا مسئلہ جھگڑے میں پڑ جائے گا۔

س ۱۷ متواتر کے بعد دو کا لفظ غلط ہے، واو ہونا چاہیے۔

ص ۱۴۱ س ۱۸ یہاں سپاس کے پہلے بر غلط ہے، اس کے بجائے پُر از ہونا چاہیے۔

ص ۱۴۳ س ۱۲ رقبہ کے بجائے رفتہ ہونا چاہیے۔

ص ۱۴۴ س ۱۹ مصرعہ دوم میں ہامان کے بجائے ہامون ہونا چاہیے۔

ص ۱۴۶ س ۹-۸ بدست درویشان سید قوام الدین کشتہ شدہ بود درویشان غلط معلوم ہوتا ہے۔

س ۱۳ چون ممالک مازندران باتمام مسخر حضرت صاحبقران شد یہاں باتمام کی جگہ بالتمام ہونا چاہیے۔

س ۱۴ بممالکہ محروسہ ممالک محروسہ ہونا چاہیے۔

ص ۱۴۷ س ۸ بعد در موضع یہاں بعد زاید ہے

س ۱۵ زِرِی ہونا چاہیے۔ (مصرعہ دوم)

ص ۱۴۹ س ۸ مصرعہ اول میں تخت کی جگہ بخت ہونا چاہیے، بخت نگون بمعنی بدقسمتی۔

س ۱۷ سلطان زین العابدین کے بعد "را" ہونا چاہیے۔

ص ۱۵۰ س ۲ صعود کے بجائے صعوہ ہونا چاہیے۔

س ۱۶ بیہات مجموعی بظاہر چھاپے کی غلطی ہے، بہیئت مجموعی یا بہیأت مجموعی صحیح ہے۔

ص ۱۵۱ س ۸ پانزدہ کس پیش نماندہ بود "پانزدہ کس بیش" ہونا چاہیے۔

ص س ۲۰ مصرعہ دوم میں بدکالہ یا غلط ہے

ص ۱۵۴ س ۲ مصرعہ اول میں چندن سپاہ غلط، چندان سپاہ صحیح ہے

ص ۱۵۵ س ۱۲ مصرعہ اول میں نبرد کے بجائے نورد ہونا چاہیے، جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۱۵۶ س ۴-۳ سپاہ سلطان احمد ہر کس بگوشہ ای بیرون رفت اس میں ہر کس زاید ہے۔

ص ۱۵۸ س ۳ مصرعہ اول، کاوانہا کے بجائے کاروانہا ہونا چاہیے۔

ص ۱۶۸ س ۴ دوسرے مصرعہ کا قافیہ تیغہا نہیں ہو سکتا۔

ص ۱۶۹ س ۵ سامط کے بجائے صامت ہونا چاہیے، جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۱۷۳ س ۱۵ از آنجا متوجہ مولتان شد و حاکم مولتان را محاصرہ کرد اس میں "را محاصرہ کرد" یقیناً زاید ہے، جیسا کہ حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ قلعہ کا محاصرہ کیا جاتا ہے، حاکم کا محاصرہ درست نہیں ہے۔

ص ۱۷۶ س ۴-۳ و آن شیر مرد از وصول بآن درہ تنگ کہ از دو طرف آن کوہہا سر بفلک کشیدہ بود اس جملہ کی خبر ندارد

س ۱۹ اطناب سراپردۂ پادشاہی باد باوتاد عنایات الٰہی مسدود شد بے معنیٰ ہے۔

ص ۱۷۷ س ۱۴ یہاں نفوزہا غلط ہے

س ۱۷ مفصل آن کے بجائے تفصیل آن ہونا چاہیئے۔

ص ۱۷۹ س ۹-۷ بر حسب اشارت اصابت شعار برالغار با بر فر شکوہ شاہزادگان کامگار پیر محمد جہانگیر وامیر یادگار برلاس و دیگر امرای نامدار زیب و زینت پذیرفت را اور بر کی وجہ سے اس جملہ نے جو شکل اختیار کی ہے وہ نہایت مضحک ہے، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ فاعل مفعول کیا ہے۔ را اور بر کے بجائے 'از' ہونا چاہیے۔

س ۱۵ انتظام داد کے بجائے انتظام گرفت ہونا چاہیے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۱۸۰ س ۱۱ دندانہای ستور کردار کے بجائے دندانہای ستون کردار ہونا چاہیے۔

ص ۱۸۰ س ۱۷ مصرعہ دوم میں مغز سر آنراز کے بجائے سران راز ہونا چاہیے۔

س ۱۸ مصرعہ اول، کرکدن کے بجائے کرگدن ہونا چاہیے۔

س ۲۱ عَلوُی میں ی زاید ہے، زیر سے اضافت کا کام لینا چاہیے۔

ص ۱۸۱ س ۱۰-۹-۸ یہ جملے قواعد کے اعتبار سے غلط ہیں۔

س ۱۶ مصرعہ اول میں از کے بجائے ارہونا چاہیے۔

س ۲۰ خواطر حزم کے بجائے خواطر شرائط حزم جیسا کہ حاشیہ میں ہے ہونا چاہیے۔

ص ۱۸۲ س ۷ در آن حین لشکر کے بجائے در آن حین کہ لشکر ہونا چاہیے۔

ص ۱۸۳ س ۶ تیر گذار کے بجائے جان گذار ہونا چاہیے، جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

س ۱۳ پاتند باد کے بجائے باتند باد ہونا چاہیے۔

ص ۱۸۴ س ۹ حوض خاص دریاچہ است از محدثات فیروز شاہ است و بزرگی آن نیز ...... الخ اس میں فیروز شاہ کے بعد است زاید ہے۔

ص ۱۸۶ س ۱۲ خلخالہا زر اس میں اضافت غائب ہے، خلخالہای زر ہونا چاہیے۔

ص ۱۹۵ س ۶ برابر گشت کے بجائے برابر کرد ہونا چاہیے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۱۹۶ س ۱۵-۱۴ شوکت وسعت کے بجائے شوکت و وسعت ہونا چاہیے اور بہ بسیاری کے بجائے بر بسیاری ہونا چاہیے۔

س ۱۹ مصرعہ دوم: زبر دست ہر دست آفرید غلط ہے

ص ۱۹۷ س ۱۳-۱۲ دبیر بلاغت شعار قلم دار سر امتثال .... الخ اس میں دبیر کی جگہ دبیراد قلم دار کی جگہ قلم وار ہونا چاہیے۔

ص ۱۹۸ س ۹ خدای تعالی بہ بندگان رحمت کناد کنار کے بجائے کناد ہونا چاہیے۔ فارسی زبان کے مبتدی سے بھی یہ غلطی سرزد نہ ہونا چاہیے

س ۱۳ فرمانروای کی جگہ فرمانروائی ہونا چاہیے

ص ۱۹۹ س ۲ مصرعہ اول میں بر دیم کی جگہ بر دیم ہونا چاہیئے۔

ص ۲۰۰ س ۱ بعد ازاین باقدام غرور پیراہن فضولی بکرد : اس جملے میں بکرد کی جگہ مگرد (نہی) ہونا چاہیے۔

س ۱۰ مصرعہ اول میں گردیدہ ای اصل میں گردیدن سے ہے۔ فعل ہے، یہ گرا اور دیدن سے نہیں بنا ہے۔

ص ۲۰۱ س ۲ مصرعہ اول میں 'ہنگام ام' کے بجائے ہنگامہ ام ہونا چاہیے۔

س ۳ مصرعہ اول میں ناپسند مشتبہ ہے، مصرعہ دوم میں وگیر آنرا کے بجائے دیگراں را ہونا چاہیے۔

س ۸ بست کے بجائے پست ہونا چاہیے۔

س ۹ مصرعہ دوم : بنیاد مزد غلط ہے، واللہ اعلم کیا صحیح ہے۔

ص ۲۰۳ س ۶ متعلق بآن کی جگہ تعلق بآن ہونا چاہیے جیساکہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۲۰۶ س ۷ مصرعہ اول میں خواستہ کے بجائے خاستہ ہونا چاہیے۔

ص ۲۱۰ س ۱۴-۱۲ عاقبت صبح نیروزی از مطلع بی اثقال حضرت صاحبقران بیہمال دمیدہ شکست بر سپاہ شام افتاد و از بہادران لشکر منصور بضرب بازوی جلادت وساعد سعادت بر سپاہ شام افتاد یہ جملہ غلط اور سپاہ شام افتاد کی تکرار اس غلطی کی طرف مزید اشارہ کرتی ہے۔

ص ۲۱۱ س ۱۲ نہان و ستولی اس میں مستولی غلط ہے۔

س ۱۷ مصرعہ دوم میں بُردن کی جگہ برون ہونا چاہیے۔

س ۱۹ مصرعہ اول میں ذرہ ہای کی جگہ زرہای ہونا چاہیے۔

ص ۲۱۶ س ۷ سر بہر زد کی جگہ سر برزد ہونا چاہیے۔

س ۱۳ خواست کی جگہ خاست ہونا چاہیے۔

ص ۲۲۸ س ۱۳ مصرعہ دوم میں جست کی جگہ چُست ہونا چاہیے۔

س ۱۷ مصرعہ ثانی میں از آن پر زمین بے معنیٰ ہے، اس بنا پر واضح ہے کہ حاشیہ میں جو قرارت درج ہے وہ صحیح سمجھنا چاہیے۔

ص ۲۳۲ س ۱۴ مصرعہ دوم میں بخت کی جگہ تخت ہونا چاہیے۔

ص ۲۳۳ س ۴ اس سطر میں گشت و زائد ہے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

س ۱۲ کماخ کے بعد واو بے معنیٰ ہے۔

ص ۲۴۰ س ۸ خنا کے بجائے خناق ہونا چاہیے۔

ص ۲۵۹ س ۱ تذویرٔ ز سے ہونا چاہیے۔

ص ۲۶۸ س ۳ ازان نبود کی جگہ ازان بود ہونا چاہیے، جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

س ۱۱ دولت اقبال بعد قضا ... الخ یہاں بعد کے بجائے بہ ہونا چاہیے۔

ص ۲۶۹ س ۱۵ مصرعہ دوم میں پشت او کی جگہ پست او ہونا چاہیے۔

ص ۲۷۴ س ۱۱ مقابل بباغبان ... الخ مقابل باغبان ہونا چاہیے، حاشیہ میں صحیح درج ہے۔

س ۱۲-۱۳ توسین میں شیخ نظامی رحمت اللہ آوردہ کہ بالکل بے محل ہے۔

س ۱۷ کردی کی جگہ گردی ہونا چاہیے۔

ص ۲۹۰ س ۱۴ از قید خلاصی ... الخ خلاصی کے بجائے خلاص ہونا چاہیے۔

ص ۳۱۴ س ۱۳ مصرعہ دوم میں گرچہ واضح نہیں ہے۔

س ۱۵ کرہ نای کی جگہ کرنای ہونا چاہیے۔

س ۱۶ آن مطلع کی جگہ از مطلع یعنی آن کے بجائے از ہونا چاہیے۔

ص ۳۱۵ س ۲ تاریک شب کی جگہ تاریکی شب ہونا چاہیے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

س ۷ تبار غیر ضروری ہے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔ اسی سطر میں پیر حسین سعد کے بعد را ہونا چاہیے۔

ص ۳۱۵ س ۱۸ گرفت کے بجائے ساخت ہونا چاہیے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۳۲۰ س ۱۵ ازطرفین میں از غیر ضروری ہے۔

ص ۳۲۲ س ۱۰ مصرعہ دوم میں گرد کی جگہ کرد ہونا چاہیے۔

ص ۳۲۴ س ۳ کلام نظام کی جگہ کلام معجز نظام ہونا چاہئے۔

ص ۳۲۶ س ۷ مصرعہ اول میں بحرم کی جگہ سحرم ہونا چاہیے۔

ص ۳۳۲ س ۸ بی حفاظتی کی جگہ بی حفاظی ہونا چاہیے۔

ص ۳۳۶ س ۱۳ مآدی غلط ہے مأوی ہونا چاہیے۔

ص ۳۴۱ س ۱۸-۱۷ دلفریبائی کہ باخود دوست میداری مشان

دشمن جانند وچوں جاں دوست میداری مشان

دونوں مصرعوں میں میداری مشان کے بجائے میداریمشاں ہونا چاہئے، شان ضمیر متصل جمع غائب کی مثال ہے اور میداریم فعل حال جمع متکلم کا صیغہ۔ اس کے معنیٰ ہوئے ''ہم اُن کو دوست رکھتے ہیں'' قافیہ کی بحث میں اس کی بڑی اہمیت ہے، اس کو نفاذ کہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی مثال قاسم کاہی کی ایک بیت ہے جو اس کے رسالہ قافیہ میں اس طرح[1] درج ہے:

خوباں اگر بچشم یقیں بنگریمشان ہردم ہزار سجدۂ شکر آوریمشان

ص ۳۵۶ س ۷ مصرعہ دوم میں نگاہ کے بجائے بگاہ ہونا چاہیے۔

ص ۳۶۲ س ۶ طای غلط ہے، طائی ہونا چاہیے۔

ص ۴۲۲ س ۱۰ مصرعہ دوم میں بیراہ ورہ کی جگہ بی راہرو ہونا چاہیے۔

---

[1] جامی کا بھی ایک شعر کاہی کی ردیف و قافیہ میں ہے:

تاکی بخون دیدہ و دل پروریمشان ازرہ بروں روند و براہ آوریمشان

ص ۵۴۵ س ۱۱ برق قہرش چو رسد زہر آلود دوستان بگذرد از چرخ کبود

مصرعہ دوم میں دوستان غلط ہے

ص ۵۴۶ س ۱۴ مصرعہ دوم میں تارموی کی جگہ تارموئی ہونا چاہیے۔

س ۱۵ الحکم الله کی جگہ الحکم للہ ہونا چاہیے۔

ص ۵۲۰ س ۱۰ تبہیج کی جگہ بہتیج ہونا چاہیے ص ۵۷۰ س ۲۲ پر یہ لفظ صحیح لکھا ہے۔ مگر ص ۵۷۴ س ۱۷ پر پھر تبہیج غلط ہے۔

ص ۵۲۹ س ۱۲ مصرعہ دوم میں با آمد غلط ہے

س ۱۴ مصرعہ دوم میں گہر یا کی جگہ کہربا ہونا چاہیے۔

س ۱۵ مصرعہ اول میں گہرباو ارزرد بالکل بے معنیٰ ہے اس کی جگہ کہربا وار زرد ہونا چاہیے۔

س ۱۷ مصرعہ اول میں نا کی جگہ با ہونا چاہیے۔

ص ۵۳۸ س ۹ کشایند غلط ہے، ستانند ہونا چاہیے جیسا کہ حاشیہ میں ہے

ص ۵۷۳ س ۹ گبرگہ غلط ہے کورگہ ہونا چاہیے۔

ص ۵۷۷ س ۳ مصرعہ دوم میں ساختند کی جگہ تاختند ہونا چاہیے۔

ص ۵۸۲ س ۱۳ مصرعہ دوم میں گرد کی جگہ کرد ہونا چاہیے

س مصرعہ دوم میں حشرکہ کی جگہ حشرگہ ہونا چاہیے۔

ص ۵۸۴ س ۱۷ مصرعہ اول میں برخواست کی جگہ برخاست ہونا چاہیے۔

ص ۵۸۵ س ۳ مصرعہ اول میں زرہ از تیر کی جگہ دل رزم ہونا چاہیے، جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

س ۷ تارکار کی جگہ تباہ کار جیسا کہ حاشیہ میں ہے ہونا چاہیے۔

ص ۵۸۶ س ۱۲ وجود دنایر مشتبہ ہے۔

س ۱۶ برسانند کی جگہ شود درست ہے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔

ص ۵۸۸ س ۲ میزد کی جگہ میزدود ہونا چاہیے۔
ص ۵۹۳ س ۶ مصرعہ دوم میں وی کی جگہ دی ہونا چاہیے۔
ص ۵۹۴ س ۲-۱ یہ دو جملے بالکل غلط ہیں، حاشیہ کی مدد سے ان کی تصحیح ہونا چاہیے۔
س ۷-۶ سخن آرای اور معمای کی جگہ سخن آرائی اور معمائی ہونا چاہیے۔
س ۱۵ بدیع کی جگہ بدیعہ ہونا چاہیے۔
س ۱۶ وقاد کے بعد واو ہونا چاہیے۔
ص ۵۹۸ س ۱ کمنجای کی جگہ کم خواب ہونا چاہیے۔
ص ۵۹۹ س ۱۹ صعالیک غلط ہے ممالیک ہونا چاہیے۔
ص ۶۰۶ س ۱۸ باآشیان کی جگہ باآستان ہونا چاہیے۔
ص ۶۰۷ س ۳ بالعہد کی جگہ بالعہود ہونا چاہیے۔
ص ۶۰۸ س ۲ پوشیدہ نماند کہ رسوخ بپایۂ سریر اعلی ارسال گردانی؛ واضح ہے کہ اس جملے میں کچھ الفاظ درج ہونے سے رہ گئے ہیں: حاشیہ کی مدد سے اس کی تصحیح اس طرح ہوگی: پوشیدہ نماند کہ علامت رسوخ وثبات بر جادۂ عہد ومیثاق وایمان آنست کہ سخنان زیور را بسمع رضا جا دادہ آن مخادیل را بپایۂ سریر الخ
ص ۶۰۹ س ۹ مصرعہ اول میں پسند کی جگہ بسند ہونا چاہیے، دوسرے مصرعہ میں ندرور کی کی جگہ ندروی ہونا چاہیے۔
س ۱۸ بغدور زاید ہے۔
ص ۶۱۱ س ۵ یادگر کی جگہ یاد ہونا چاہیے، یادگر غلط ہے
ص ۶۱۲ س ۷ مصرعہ دوم میں نمای کی جگہ نمائی ہونا چاہیے۔
ص ۶۲۶ س ۱۱ آنجار و غلط ہے
ص ۶۲۷ س ۳ اغر کے بجائے اعز ہونا چاہیے۔

ص ۶۲۷ س ۷	مصرعہ اول میں جست کی جگہ چست ہونا چاہیے ۔
س ۱۳	قلعہ کشائی کی جگہ قلعہ گشائی ہونا چاہیے ۔ قلعہ کشای اسم فاعل ہے اور قلعہ گشائی میں یای مصدر ہے ۔
ص ۶۲۸ س ۳	دو اردم کی جگہ دوار دم ہونا چاہیے ۔
س ۱۴	ماہچہ کی جگہ ماہچۂ ہونا چاہیے ۔
ص ۶۴۰ س ۱۹	خطہ بجرہ کی جگہ خطۂ بجرہ ہونا چاہیے ۔
ص ۶۴۱ س ۹	مصرعہ دوم گدای کی جگہ گدائی ہونا چاہیے ۔
ص ۶۴۲ س ۸	بکشید غلط بخشید ہونا چاہیے ۔
ص ۶۴۴ س ۴	دیگری کے بعد مرزا حکیم چھوٹ گیا ہے جیسا کہ حاشیہ میں ہے ۔
ص ۶۴۵ س ۵	پی مساعدت کی جگہ بی مساعدت ہونا چاہیے ۔
س ۶ ـ ۷	اس جملہ کی خبر ندارد ۔ (رک حاشیہ)
س ۱۳	لازم التعظیم بسبب استعداد ابدی وموجب ارتقا بدرجات سرمدیست یہ غلط ہے حاشیہ کی مدد سے اس کی تصحیح ہونا چاہیے ۔
س ۱۵	مصرعہ اول میں بخائش کی جگہ بخشائش ہونا چاہیے ۔
ص ۶۵۲ س ۶	انواعیکہ غلط ہے
س ۷	است کی جگہ را ہونا چاہیے ۔
س ۱۰	بقول بالکل غلط ہے ۔
س ۱۳	بدلیعہ غلط طور پر آیا ہے ۔
ص ۶۵۳ س ۱	حاشیہ سے تصحیح ہونا چاہیے ۔
س ۷	نکر پیشہ کی جگہ فکرت پیشہ ہونا چاہیے ۔
س ۲۰	نغمہ سرای کی جگہ نغمہ سرائی ہونا چاہیے ۔

ص ۶۵۴ س ۵ رخش کی جگہ رُخ ہونا چاہیے۔

س ۱۲ ذرۂ کی جگہ ذرّوہ ہونا چاہیے۔

ص ۶۵۵ س ۱۹ تخت وافراز کے بجائے تخت وافراز ہونا چاہیے۔

س ۲۰ با وجودش کے بجائے باجودش ہونا چاہیے۔

ص ۶۵۶ س ۵ مصرعہ دوم میں عدم زد کی جگہ علو زد ہونا چاہیے۔

س ۷ مصرعہ اول بالکل غلط ہے۔ حاشیہ سے تصحیح ہونا چاہیے۔

س ۸ مصرعہ دوم: خورد توسن وچرخ اسکندری اس کے بجائے
خورد توسن چرخ اسکندری ہونا چاہیے۔

س ۱۷ شروع کے بجائے نماید ہونا چاہیے۔

ص ۶۵۷ س ۱۸ مصرعہ اول میں از کی جگہ ار ہونا چاہیے۔

ص ۶۵۹ س ۳ مصرعہ اول میں کوزن کی جگہ گوزن ہونا چاہیے۔ اسی شعر میں یکذرہ زن غلط ہے۔

س ۴ مصرعہ دوم میں بسیارگی غلط ہے۔

جن غلطیوں اور فروگذاشتوں کا اوپر ذکر ہوا ہے یہ نمونہ مشتی از خرواری ہیں۔ سرسری مطالعے سے میری نظر میں جو باتیں قابل ذکر معلوم ہوئیں ان کی طرف ان سطور میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کتاب کی تمام غلطیوں کے احاطے کے لئے دفتر درکار ہے جس کا نہ اس وقت موقع ہے، اور نہ اس مختصر سے مقالے میں اس کی گنجائش، راقم سطور کا منشا یہ ہے کہ متوں کی تصحیح کی طرف صرف ایسے حضرات کو متوجہ ہونا چاہیے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں، خواہ مخواہ کسی قدیم متن کو غلط طور پر پیش کرنا کوئی علمی خدمت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید میری اس تحریر سے میں اپنے مقصد کی طرف اشارہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں، اگر قارئین حضرات کے سامنے میں اپنے مقصد کو پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہوں تو میں اپنی سعی کو مشکور سمجھوں گا۔

پاکستان میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی مصروفیات
لکچر، تقریریں اور استقبالیے

از جناب ابو ظفر حسان احمد خاں صاحب ریسرچ اسکالر۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی پچھلے دنوں پاکستان گئے تھے جہاں ان کا قیام ۲۷ مئی سے ۱۳ جولائی تک رہا۔ اس مدت میں وہ پہلے لاہور گئے، وہاں سے اسلام آباد، پھر کراچی۔ واپسی لاہور سے ہی ہوئی اس لئے لاہور میں کراچی سے واپس ہو کر بھی قیام ہوا، مولانا کا یہ سفر صرف اپنے اعزۂ اقربار، اور دوست، احباب سے ملنے ملانے کے لیے تھا۔ اور تقسیم کے بعد یہ ان کا پہلا سفر تھا، یہاں سے روانگی سے قبل مولانا نے عہد کیا تھا کہ وہ پاکستان میں کوئی تقریر نہیں کریں گے لیکن موصوف کو ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کی وجہ سے برصغیر ہند و پاک کے علمی تحقیقی اور دینی اداروں میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہے اس کے باعث ہر جگہ یونیورسٹیوں، کالجوں اور دوسرے اداروں نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکیں۔ چونکہ یہ تمام لکچر اور تقریریں تاریخ کا ایک باب ہیں اس لئے ہم ذیل میں اس کی روئداد قلم بند کرتے ہیں[1]۔

---

[1] ہماری یہ روئداد پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کی ذاتی ڈائری اور ان اخبارات پر مبنی ہے جو موصوف اپنے ساتھ لائے ہیں

مولانا، ۲۷ مئی کی صبح کو فیروز پور کے راستے سے لاہور پہونچے اور اپنے داماد ڈاکٹر محمد اسلم صاحب استادِ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے یہاں قیام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی دن شام کو ایک پرتکلف عصرانہ کا انتظام کر رکھا تھا جس میں مولانا کے دیرینہ دوست پروفیسر شیخ عبدالرشید ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر وزیر الحسن عابدی، پروفیسر ظفر احمد قریشی اور دوسرے ارباب علم وادب موجود تھے۔ ایک عرصہ کے بعد ان دوستوں سے مل کر بڑی مسرت ہوئی اور دیر تک علمی اور ادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، اس عصرانہ میں گورنمنٹ انٹر کالج کے پرنسپل حافظ منظور الحق عثمانی بھی موجود تھے ان کے کالج میں ۳۰ مئی بروز جمعہ سیرۃ النبیؐ پر ایک جلسہ ہورہا تھا، پرنسپل صاحب نے مولانا سے باصرار درخواست کی کہ وہ بھی اس جلسے میں شریک ہوں اور تقریر کریں اصرار اتنا شدید تھا کہ مولانا انکار نہ کر سکے۔ چنانچہ جلسے میں شریک ہوئے اور "رحمت عالم" کے موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس جلسہ کی صدارت جسٹس بدیع الزماں کیکاؤس نے کی تھی۔ جلسہ ایک عظیم الشان پنڈال میں منعقد ہوا تھا جو طلبہ، اساتذہ اور بعض بیرونی مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس جلسہ میں اردو زبان کے مشہور مصنف پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور بعض دوسرے حضرات جیسا کہ انھوں نے کہا اخبارات میں مولانا کی تقریر کا اعلان پڑھ کر ہی شریک ہوئے تھے۔

دوسرے دن یعنی ۳۱ مئی کو شاہین ڈگری کالج لاہور میں مولانا کو ایک عصرانہ دیا گیا جس میں کالج کے اساتذہ کے علاوہ بیرونی حضرات میں سے پروفیسر علم الدین سالک، پروفیسر محمد سرور اور دوسرے ارباب علم وادب موجود تھے عصرانے کے بعد "اسلام اور سوشلزم" کے عنوان پر ایک مذاکرہ ہوا اور مولانا نے اس موضوع پر تقریر کی۔

۳ جون کو مولانا کی مصروفیت بہت زیادہ رہی کیونکہ اس دن صبح ۹ بجے لاہور چھاؤنی کے مسلم ہائی اسکول میں سیرت کے موضوع پر طلبہ اساتذہ اور چند بیرونی حضرات کو خطاب کیا اور عشاء کے بعد امامیہ مشن کے زیر اہتمام ایک جلسۂ سیرت میں تقریر کی۔ اسی دن شام کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے پاکستان اردو اکیڈمی میں ایک پرتکلف اور وسیع پیمانے پر استقبالیہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف برصغیر ہند و پاک کے

مشہور فاضل اور نامور مصنف ہیں پہلے پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل تھے اب وہاں سے سبکدوش ہو کر اکیڈمی کے چیرمین ہیں۔ یہ اکیڈمی اردو کا سب سے زیادہ پرچار کر رہی ہے اور اس نے چند برسوں ہی میں سائنس اور دوسرے علوم کی بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے چھاپا ہے اور ایک اردو انسائیکلو پیڈیا بھی تیار کر رہی ہے اس کا دفتر ایک وسیع اور کشادہ مکان میں واقع ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے مولانا کے ذاتی تعلقات کم وبیش چالیس برس پرانے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے علمی کاموں کے بڑے قدرداں اور مداح ہیں۔ استقبالیہ میں اردو اکیڈمی کے ارکان کے علاوہ لاہور کے نمایاں ارباب علم و ادب بھی موجود تھے۔ اس مجلس میں دیر تک ادبی مذاکرہ رہا۔ اس میں مولانا نے تفصیل سے بتایا کہ ہندوستان میں اردو زبان کے علمی، ادبی اور تصنیفی ادارے کیا کیا کام کر رہے ہیں اور ان کاموں کی کیا اہمیت ہے۔ سب حضرات نے اس پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور انھوں نے تسلیم کیا کہ ہندوستان کے بعض علمی اداروں کے کام اتنے اونچے ہیں کہ پاکستان میں اب تک ان کا جواب پیدا نہ ہو سکا۔

۵ رجون کو پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی طرف سے ایک استقبالیہ دیا گیا جس میں شعبے کے تمام اساتذہ، طلبہ اور طالبات نے شرکت کی اور چائے نوشی سے فراغت کے بعد صدر شعبۂ تاریخ پروفیسر محمد یاور خاں کی صدارت میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا نے صنف نسواں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کے موضوع پر سوا گھنٹہ تقریر کی۔ اس کے بعد طلبہ اور طالبات نے کچھ سوالات کئے اور موصوف نے اس کے جوابات دئے۔

اسی دن شام کو عشاء کے بعد سمن آباد لاہور کی مشہور اور عظیم الشان مسجد خضراء میں سیرت پر تقریر کی مسجد سامعین سے بھری ہوئی تھی ـــــ اسی دن پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر پروفیسر علاء الدین صدیقی نے مولانا کو ایک نہایت پرتکلف لنچ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں دیا اس میں شعبۂ اسلامیات کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کے علاوہ یونیورسٹی کے بعض دوسرے شعبوں کے پروفیسر اور چند بیرونی ارباب علم و ادب بھی موجود تھے ـــــ اس مجلس میں اسلام کے

اصول قانون سازی پر مذاکرہ بھی ہوا اور مولانا نے اس موضوع پر دیر تک اظہار خیال کیا ــــ
پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ اسلامیات بڑا عظیم الشان اور ترقی یافتہ شعبہ ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ
اور طلبہ وطالبات کی کثرت تعداد کے علاوہ اس شعبہ کی لائبریری عظیم الشان اور قابل دید ہے۔
اس وقت جو طلبہ اور طالبات اس شعبہ کے ماتحت ریسرچ کا کام کر رہے ہیں ان کی تعداد ایک درجن
سے زیادہ ہے ــــ پروفیسر علاء الدین صدیقی وائس چانسلر ہونے سے پہلے اس شعبے کے پروفیسر
اور صدر تھے، موصوف ایک متبحر اور محقق عالم وفاضل ہونے کے علاوہ نہایت دیندار اور بہت ہی
منتظم انسان ہیں۔

۷ رجون کو ہفت روزہ چٹان کے مشہور ایڈیٹر اور اردو زبان کے نامور ادیب، شاعر، اور
خطیب جناب آغا شورش کاشمیری نے اپنی کوٹھی پر ایک ڈنر دیا جس میں تکلفات کی حد کر دی گئی تھی۔ اس
ڈنر میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی علامہ اقبال کے فرزند
ڈاکٹر جاوید اقبال، شیخ محمد اشرف (مشہور تاجر کتب)، ڈاکٹر محمد اسلم، مسٹر مجید نظامی ایڈیٹر "نوائے
وقت"، میاں محمد طفیل نائب امیر جماعت اسلامی، مولوی محمد عبداللہ قریشی ایڈیٹر ادبی دنیا کے علاوہ
اور بہت سے حضرات جو لاہور کی علمی اور ادبی سوسائٹی کے نمایاں ارکان ہیں۔ کثیر تعداد میں موجود تھے۔
اگرچہ شورش صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی لیکن موصوف کو مولانا کے ساتھ عرصہ دراز سے بڑی عقیدت
اور محبت ہے جس کا اظہار انھوں نے نہ صرف اس موقع پر بلکہ لاہور کے زمانۂ قیام میں اور بھی متعدد
مواقع پر کیا ــــ آج کل پاکستان میں اسلام اور سوشلزم کی بحث بڑے زور شور سے چل رہی ہے چنانچہ
اس موقع پر بھی ڈنر کے بعد شورش صاحب نے سوشلزم اور کمیونزم کے خلاف اپنے خاص انداز میں
نہایت پرجوش تقریر کی۔ مولانا اکبرآبادی صاحب نے بھی اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار بڑی
سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کیا جس کو مجمع نے دلچسپی سے سنا۔ شورش صاحب کو مولانا ابوالکلام آزاد
سے غیر معمولی محبت بلکہ اس درجہ عشق ہے کہ غالباً ان کی گفتگو اور کوئی تقریر ایسی نہیں ہوتی جس میں
کسی نہ کسی عنوان سے وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر جذباتی انداز میں نہ کرتے ہوں۔ چنانچہ اس

موقع پر بھی انھوں نے اپنی تقریر میں مولانا آزادؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دار العلوم دیوبند کا ذکر جس جوش و خروش کے ساتھ کیا وہ مولانا کے لئے انتہائی مسرت انگیز بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ مسرت انگیز اس لئے کہ مولانا خود اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور حیرت انگیز اس لیے کہ لاہور میں بیٹھ کر ایک شخص اس درجہ جرأت و جسارت اور بیباکی سے ان حضرات کے محامد و مناقب پر دادِ خطابت دے رہا تھا۔

یہاں ایک اور عجیب و غریب واقعہ کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ سندھ کے ایک بہت پرانے سیاسی لیڈر ہیں جن کا نام محمد امین خاں کھوسو ہے یہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے پرانے تعلیم یافتہ ہیں انھوں نے علی گڈھ سے ۱۹۳۴ء میں ایم اے، ایل ایل بی کیا تھا اور یہاں کی اسٹوڈنٹس یونین کے عہدیدار بھی رہے تھے۔ علی گڈھ سے جانے کے بعد یہ ملک کی سیاسیات میں کود پڑے اور کانگریس کے بہت سرگرم کارکن بن گئے۔ تقسیم کے بعد حالات کو ناسازگار پاکر اپنے وطن جیکب آباد (سندھ) میں خانہ نشین ہوگئے ـــــ انھوں نے ایک مرتبہ مولانا اکبر آبادی صاحب کی مشہور کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد" پڑھی تھی، چونکہ ان کو مولانا سندھی کے ساتھ غیر معمولی ارادت و عقیدت تھی اس لئے وہ یہ کتاب پڑھ کر بیحد مسرور ہوئے اور طبعی طور پر مصنف سے ملاقات کرنے کا جذبہ ان میں پیدا ہوا۔ گذشتہ مئی کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے کہ ان سے کسی نے کہا کہ مولانا اکبر آبادی حیدر آباد سندھ میں ہیں وہ فوراً حیدر آباد کے لئے روانہ ہوگئے، مگر وہاں پہونچکر انھیں سخت مایوسی ہوئی۔ کھوسو صاحب کا بیان ہے کہ مایوسی کے عالم میں ایک دن اشراق کی نماز کے بعد مراقبہ کر رہا تھا کہ اچانک مجھے مولانا عبید اللہ سندھی سامنے کھڑے ہوئے نظر آئے اور انھوں نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ تم کو جس شخص کی تلاش ہے وہ آج کل لاہور میں مقیم ہے چنانچہ کھوسو صاحب لاہور آئے اور انار کلی لاہور کے مشہور ایر کنڈیشن ہوٹل "نعمت کدہ" میں مقیم ہوگئے۔ یہاں اتفاق ایسا ہوا کہ ۶ جون کی تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا مولانا اکبر آبادی صاحب نماز جمعہ کے لئے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کی مسجد شیراں والی میں گئے، نماز کے

بعد مولانا عبید اللہ الانور جو مولانا احمد علی صاحب کے صاحبزادے اور ان کے جانشین ہیں مصافحہ کے لئے بڑھے اتنے میں کھوسو صاحب جنھوں نے جمعہ کی نماز یہیں پڑھی تھی مولانا عبید اللہ الانور صاحب سے مصافحہ کے لئے لپکے تو انھوں نے کھوسو صاحب کو مولانا اکبر آبادی صاحب سے ملایا۔ کھوسو صاحب کا مولانا کا نام سننا تھا کہ فرط مسرت میں آپے سے باہر ہوگئے اور مولانا اکبر آبادی صاحب کو سینے سے لگاتے ہوئے بولے کہ میرے استاد مولانا سندھی نے جو کچھ کہا تھا اللہ کا شکر ہے کہ وہ سچ نکلا۔ اس کے بعد سب لوگ جب مولانا عبید اللہ الانور کے کمرے میں جاکر بیٹھے تو وہاں کھوسو صاحب نے پورا واقعہ سنایا۔ یہ جمعہ کا دن تھا اس کے دوسرے دن ۷ر جون کو کھوسو صاحب نے اپنے ہوٹل میں مولانا کو نہایت شاندار عصرانہ دیا جس میں لاہور کے اکابر علماء جو مولانا عبید اللہ سندھی سے تعلق رکھتے تھے یونیورسٹی کے پروفیسر، اور کچھ سرحد کے خوانین بڑی تعداد میں موجود تھے۔

لاہور میں مولانا کا قیام ۲۷ر مئی سے ۹ر جون تک رہا۔ اسی دن شام کی گاڑی سے اپنے پروگرام کے مطابق وہ اسلام آباد کے لئے روانہ ہوگئے۔ سوا چھ بجے کے قریب جب ٹرین راولپنڈی کے اسٹیشن پر پہونچی تو آپ کے میزبان سعید الدین احمد صاحب ڈار جو پاکستان گورنمنٹ میں ایک اعلیٰ افسر ہیں استقبال کے لئے موجود تھے، مولانا ڈار صاحب کے ساتھ اسلام آباد آئے اور انھیں کے سرکاری بنگلہ میں مقیم ہوئے۔ ابھی صرف رات گذری تھی کہ اسلام آباد کے علمی حلقوں میں مولانا کی آمد کی خبر مشہور ہوگئی چنانچہ ۱۰ر کی صبح کو آٹھ اور نو بجے کے درمیان ڈاکٹر صغیر احمد معصومی اور مولوی تنزیل الرحمان صاحب ایڈوکیٹ (صاحب مجموعہ قوانین اسلام) مکان پر پہونچ گئے اور دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

اسلام آباد میں حکومت پاکستان کا سب سے بڑا اسلامی تحقیقات کا ادارہ "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے قائم ہے یہ وہی ادارہ ہے جس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمان تھے جو پچھلے دنوں مستعفی ہوگئے ہیں اب اس ادارہ کے قائم مقام ڈائرکٹر ڈاکٹر صغیر احمد معصومی ہیں جو اپنے اصل عہدہ کے اعتبار سے پروفیسر بھی ہیں، یہ انسٹی ٹیوٹ ایک نہایت عظیم الشان ادارہ ہے جس میں دو پروفیسر چار ریڈر اور آٹھ ریسرچ اسسٹنٹ جو لکچرر گریڈ میں ہیں اسلامیات پر تحقیقات کا کام انگریزی، اردو، بنگلہ اور عربی

میں کر رہے ہیں، اس ادارہ کا ٹیکنیکل اسٹاف بھی بہت وسیع ہے اس کی لائبریری نہایت عظیم الشان ہے جس میں ساڑھے تین سو بالکل نادر مخطوطات بھی ہیں یہ ادارہ چار بڑی بڑی عمارتوں میں قائم ہے اور اس کے سب انتظامات اعلیٰ سے اعلیٰ ہیں۔ ڈاکٹر صغیر احمد معصومی مولانا کے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے رفیق کار مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کے بڑے بھائی ہیں اور اسلامیات کے فاضل اور بلندپایہ محقق ہونے کے ساتھ بڑے دیندار بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی مولانا سے ان کے قیام کلکتہ کے زمانے میں صرف ایک ملاقات تھوڑی دیر کے لئے ہوئی تھی جبکہ ڈاکٹر صاحب یورپ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر واپس ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو مولانا کے ساتھ نہ صرف ارادت وعقیدت بلکہ بڑی محبت بھی ہے۔ اسی کا اثر تھا کہ جب ۱۰ جون کی صبح کو انھیں کسی سے مولانا کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ کے پاس پہونچ گئے اور دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

دوسرے دن ۱۱ جون کو ڈاکٹر معصومی نے مولانا کو اسلام آباد کے سب سے بڑے ایرکنڈیشن ہوٹل شہرزاد میں ایک لنچ دیا جس میں انسٹی ٹیوٹ کے ارکان کے علاوہ بعض غیر ملکی مہمان اور افسران حکومت بھی شامل تھے۔ مولانا کا بیان ہے کہ یہ لنچ اس درجہ پر تکلف تھا کہ عرب ممالک میں سرکاری دعوتوں کی یاد تازہ ہوگئی۔

۱۲ جون کو پہلے سے ایک پروگرام کے مطابق "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" میں صبح کے وقت ایک جلسہ ہو رہا تھا جس میں مولوی تنزیل الرحمن صاحب ایڈوکیٹ "پاکستان میں اسلامی قانون سازی" کے موضوع پر تقریر کرنے والے تھے۔ مولانا کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ڈاکٹر معصومی نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ اس جلسہ کی صدارت کریں جسے آپ نے منظور کر لیا چنانچہ ۹ بجے جلسہ شروع ہوا تو ڈاکٹر معصومی کی تعارفی تقریر کے بعد مولوی تنزیل الرحمان صاحب نے ایک نہایت پرمغز اور پر از معلومات لکچر دیا۔ اس کے بعد مولانا اکبرآبادی صاحب نے بحیثیت صدر تقریر کی جس میں مولوی تنزیل الرحمان صاحب کی تقریر پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد اسلامی قانون سازی کے اصول موضوعہ کے عنوان پر پینتالیس منٹ تقریر کی۔

۱۲ جون کو انسٹی ٹیوٹ کے ایک سابق پروگرام کے مطابق ڈاکٹر معصومی "اختلافات صحابہ" پر اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھ رہے تھے ڈاکٹر صاحب کی خواہش پر مولانا نے اس جلسہ کی بھی صدارت کی، اور جب مقالہ کے ختم ہونے پر متعدد حضرات نے سوالات کیے تو سب کی رائے یہ ہوئی کہ اگرچہ یہ سوالات براہ راست ڈاکٹر معصومی کے مقالہ سے متعلق ہیں لیکن حاضرین مجلس کی خواہش ہے کہ صدر جلسہ ان سوالات کے جواب دیں۔ اور خود معصومی صاحب نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا، چنانچہ مولانا اکبرآبادی صاحب نے ایک تقریر کی جو ۴۵ - ۵۰ منٹ جاری رہی اور اس میں اختلافات صحابہ کے اسباب و وجوہ ان اختلافات کی نوعیت اور احکام پر ان کے اثرات ان سب پر روشنی ڈالی۔ انسٹی ٹیوٹ کے حضرات ان دونوں تقریروں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے مولانا سے درخواست کی کہ اسلام میں اصول تشریع کے موضوع پر وہ ایک بھرپور سمینار کرنا چاہتے ہیں مولانا اس میں شریک ہوں اور اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں لیکن چونکہ موصوف ۱۴ تاریخ کو اسلام آباد سے کراچی کے لئے روانگی کا پروگرام بنا چکے تھے اس لئے انھوں نے معذرت کی۔ علاوہ ازیں اسلام آباد میں قانون پیشہ حضرات کا ایک بڑا بھاری کلب ہے اس کلب کے صدر اور سکریٹری نے بھی کلب میں ایک تقریر کی بڑے اصرار سے فرمائش کی، لیکن مجبوراً ان سے بھی معذرت کرنی پڑی۔ اسلام آباد کے پانچ روزہ قیام میں ڈاکٹر معصومی کے علاوہ ڈاکٹر قدرت اللہ فاطمی ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مولوی تنزیل الرحمان صاحب ایڈوکیٹ اور جناب منہاج الدین بلگرامی جو محکمہ مالیات میں ایک اعلیٰ افسر ہیں، ان حضرات نے پر تکلف لنچ یا ڈنر سے مولانا کی تواضع کی۔

کراچی — !

۱۴ جون کو روانہ ہوکر ۱۵ کی شام کو مولانا کراچی پہونچے۔ اسٹیشن پر بہت سے اعزہ اقربا اور دوستوں نے استقبال کیا، یہاں ان کا قیام سید قاسم علی صاحب کی کوٹھی ۳۰ بنگلور ٹاؤن میں ہوا۔ سید صاحب جو وزارت تجارت میں سکریٹری کے عہدہ سے سبکدوش ہوکر ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں مولانا کے عزیز ہوتے ہیں، یہاں مولانا کی پہلی تقریر کراچی یونیورسٹی میں ہوئی اور اس

کی تقریب یہ ہوئی کہ ۱۹ جون کو کراچی یونیورسٹی میں اسلامک سوشیالوجی کا ایک مستقل ڈیپارٹمنٹ قائم ہو رہا تھا اور وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس کا افتتاح کرنے والے تھے۔ ڈاکٹر قریشی سے مولانا کے تعلقات اس زمانے سے ہیں جبکہ تقسیم سے قبل دونوں سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی اور دلی یونیورسٹی میں تھے۔ ڈاکٹر قریشی کی جب مولانا سے ایک عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی تو وہ بیحد مسرور ہوئے اور انھوں نے خواہش کی کہ نئے شعبہ کے افتتاح کے موقع پر مولانا بھی تقریر کریں۔ چنانچہ مذکورہ بالا تاریخ میں دس بجے یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات اور اساتذہ کے ایک عظیم اجتماع میں مولانا نے کم وبیش ایک گھنٹہ لکچر دیا جس میں یہ بتایا کہ اسلامک سوشیالوجی کیا ہے؟ اور اس کی اہمیت کیا ہے؟

اسی روز کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر اور صدر ڈاکٹر ریاض الاسلام کی طرف سے مولانا کو ایک نہایت پرتکلف اور وسیع پیمانہ پر استقبالیہ دیا گیا جس میں وائس چانسلر اور شہر کے بعض افاضل مثلاً پیر حسام الدین راشدی، پیر علی محمد راشدی کے علاوہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے صدر اور اساتذہ بھی شریک تھے یہاں کوئی تقریر نہیں ہوئی لیکن ہندوستان اور پاکستان کے مختلف علمی اور تعلیمی مسائل پر دیر تک تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

کراچی میں دوسری تقریر، ۲۷ جون کو سرسید گرلس کالج میں "اسلام میں عورتوں کے حقوق" کے موضوع پر ہوئی۔ یہ کالج جس کی تعمیر میں سید الطاف علی صاحب بریلوی کی کوششوں کا بڑا دخل ہے کراچی میں لڑکیوں کا بہت بڑا اور ممتاز کالج ہے اس میں کم وبیش تین ہزار لڑکیاں زیر تعلیم ہیں کالج کے ایک نہایت وسیع ہال میں جب دس بجے جلسہ شروع ہوا تو پورا ہال طالبات ومعلمات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ محترمہ مسز صدیقی جو کالج کی گورننگ باڈی کی چیرمین ہیں جلسہ کی صدارت کر رہی تھیں، ایک لڑکی نے قرآن مجید کی تلاوت کی اس کے بعد سید الطاف علی صاحب بریلوی نے تعارفی تقریر کی اور پھر مولانا نے سوا گھنٹہ مندرجہ بالا موضوع پر ایک لکچر دیا جس کو سب نے بڑے سکون اور توجہ ودلچسپی سے سنا۔ لکچر کے اختتام پر لڑکیوں نے مختلف سوالات کئے جس کے جوابات ان کو دیئے گئے مولانا کا بیان ہے کہ لڑکیوں کے یہ سب سوالات ان کی علمی دلچسپی اور مطالعہ کے ذوق کی دلیل تھے۔ لکچر کے اختتام پر جب مولانا ہال سے نکلنے لگے تو

لڑکیوں کی بڑی تعداد نے آٹوگراف لینے کے لئے یورش کی۔ ان سب کی تعمیل اس وقت ناممکن تھی اس لئے مولانا ساٹھ ستر آٹوگراف بکس لڑکیوں کی اجازت سے اپنے گھر لے آئے اور دوسرے دن ان کی خانہ پُری کر کے انھیں کالج کے دفتر واپس کر دیا۔

۲۸ رجون کو سید الطاف علی بریلوی سکرٹیری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے۔ کانفرنس کے دفتر میں مولانا کے لکچر کا انتظام کیا تھا چنانچہ شام کو چھ بجے جلسہ شروع ہوا جس میں کراچی کے ارباب علم و ادب اور ارباب تعلیم و تحقیق کا بڑا عمدہ اور منتخب مجمع تھا۔ جلسہ کے صدر پاکستان کے بہت مشہور صاحب علم و ادب جناب ممتاز حسن صاحب (ستارۂ پاکستان) تھے۔ سید الطاف علی صاحب کی تعارفی تقریر کے بعد مولانا نے "دینی تعلیم کا حال اور مستقبل" کے موضوع پر سوا گھنٹہ تک لکچر دیا۔ لکچر کے بعد نماز مغرب سے فارغ ہو کر جب دوبارہ جلسہ شروع ہوا تو متعدد حضرات نے سوالات کئے جن کے جوابات تسلی بخش طریقہ پر دئے گئے۔ آخر میں جناب ممتاز حسن صاحب نے بحیثیت صدر ایک فاضلانہ تقریر کی اور اس میں مولانا کی تقریر کی حد سے زیادہ تعریف و توصیف کی۔ اس میں انھوں نے یہاں تک کہا کہ اس موضوع پر آج تک میں نے اس درجہ مدلّل پر از معلومات اور بصیرت افروز تقریر نہیں سنی۔ انھوں نے مزید کہا کہ دینی تعلیم کے متعلق عرصہ سے میرے دماغ میں چند شکوک اور شبہات تھے لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ آج مولانا کی فصیح و بلیغ تقریر سننے کے بعد میرے وہ تمام شکوک و شبہات دور ہو گئے اور دینی تعلیم کی اہمیت و ضرورت اور اس کی وسعت کا مجھ کو یقین ہو گیا۔۔۔ فاضل صدر کی تقریر کے بعد مسٹر حسین امام (مشہور سر حسن امام کے برادر بزرگ) نے کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مولانا کے شکریہ میں ایک مختصر تقریر کی اور اس میں انھوں نے بھی کم و بیش انھیں خیالات کا اظہار کیا جو ان سے پہلے ممتاز حسن صاحب کر چکے تھے۔

۲۹ رجون کو مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے مولانا اکبر آبادی صاحب کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ مولانا بنوری صاحب برصغیر ہند و پاک کے نہایت ممتاز عالم محقق اور مصنف ہیں۔ انھوں نے کراچی میں ایک نہایت عظیم الشان عربی کا مدرسہ "مدرسہ عربیہ اسلامیہ" کے نام سے قائم کیا ہے۔ مدرسہ کے ساتھ

ایک نہایت عظیم الشان اور بڑی خوبصورت مسجد ہے جو کئی لاکھ روپے سے تیار ہوئی ہے۔ مدرسہ کی عمارت جو مسجد سے بالکل متصل ہے دو منزلہ ہے جس میں طلبہ کے رہنے کے کمرے، کلاس رومز، دفتر اور مہمان خانہ وغیرہ سب بالکل جدید طرز کا اور ٹیپ ٹاپ کا ہے۔ اس مدرسہ کی دو خصوصیتیں بہت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا بنوری اس مدرسہ کے لئے کبھی چندہ کی اپیل نہیں کرتے، کوئی اشتہار نہیں دیتے اور دوسری یہ کہ زکوٰۃ کا پیسہ مدرسین کی تنخواہوں کے لئے قبول نہیں کرتے۔ تعلیمی اعتبار سے یہ مدرسہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ یہاں علوم اسلامیہ پر ریسرچ کا ایک خاص شعبہ ہے جس کو تخصص کا شعبہ کہتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو طلبہ تخصص کے شعبہ میں داخل ہوتے ہیں ان کو موضوع سے متعلق نہایت وسیع مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ مولانا بنوری بہت بڑے عالم ہونے کے ساتھ ان جدید علمی اور دینی ضرورتوں سے پوری طرح باخبر ہیں جو جدید علوم وفنون کی ترقی نے پیدا کردی ہیں اس لئے مدرسہ کے نصاب تعلیم میں ان ضرورتوں کی تکمیل کا اور ساتھ ہی طلبہ کی دینی اور اخلاقی تربیت کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں طلبہ کے قیام وطعام کا جو اعلیٰ انتظام یہاں ہے وہ دوسرے مدارس میں کم ہی ہوگا۔

مولانا بنوری اور مولانا اکبرآبادی دونوں دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں اس بنا پر دونوں میں دیرینہ اخلاص ومحبت کا رشتہ اور رابطہ قائم ہے اسی تعلق کی بنا پر ۲۹ جون کو مولانا بنوری نے مولانا اکبرآبادی کو صبح کے وقت مدعو کیا۔ مولانا کے اعزاز میں مولانا بنوری نے چند معززین شہر کو بھی مدعو کرلیا تھا مولانا اکبرآبادی جب مدرسہ پہونچے تو مولانا بنوری نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ خود چل پھر کر مولانا کو مسجد اور مدرسہ کی ایک ایک چیز کا معائنہ کرایا۔ اس مدرسہ کی لائبریری بہت عظیم الشان ہے، مولانا بنوری نے اس لائبریری کی خاص خاص اور اہم کتابیں بھی دکھائیں اس کے بعد مدرسہ کے ایک وسیع ہال میں طلبہ، اساتذہ اور معززین شہر کا ایک اہم اجتماع ہوا جس میں پہلے مولانا بنوری نے نہایت پرجوش اور ولولہ انگیز تعارفی تقریر کی جس کے ایک ایک لفظ سے اس محبت وخلوص کا اندازہ ہوتا تھا جو معزز میزبان کو اس اجتماع کے مہمان خصوصی کے ساتھ تھا۔ مولانا بنوری کی تعارفی تقریر کے بعد مولانا اکبرآبادی کی تقریر ہوئی جو

کم وبیش ایک گھنٹہ جاری رہی۔ موصوف نے اپنی تقریر میں مدارس عربیہ کے نصاب پر مفصل گفتگو کر کے اس پر روشنی ڈالی کہ اس نصاب میں کیا کیا تبدیلیاں ہونی چاہئیں اور کیوں۔ اس ضمن میں انھوں نے ان افکار و نظریات کا تجزیہ کیا جو علوم جدیدہ کی غیر معمولی ترقی کے باعث پیدا ہو رہے ہیں اور جن کی زد براہ راست اسلامی افکار و نظریات پر پڑ رہی ہے۔ آخر میں مولانا بنوری کی شخصیت، ان کے علمی اور تبلیغی کاموں کا تذکرہ کر کے اپنی اس غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا جو مدرسہ کو دیکھ کر پیدا ہوئی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد مولانا بنوری کی طرف سے ایک نہایت شاندار اور پر تکلف لنچ ہوا جس میں مدرسہ کے اساتذہ کرام کے علاوہ بہت سے بیرونی حضرات بھی شریک تھے۔

یکم جولائی کا دن مولانا کے لئے بڑی مصروفیت کا دن تھا۔ اس روز دوپہر کا کھانا برصغیر ہندو پاک کے مشہور شاعر جناب عبدالعزیز خالد کے ساتھ کھایا جنھوں نے تکلفات کی حد کر دی تھی، مولانا کے اعزاز میں متعدد ارباب علم وادب کو بھی مدعو کیا تھا۔ اسی روز صبح کو دس بجے مدرسہ یعقوبیہ کا معاینہ کیا اور وہاں کے طلبار کا امتحان لیا۔ شام کو پانچ بجے شعیب محمدی ہائی اسکول کے استقبالیہ میں شریک ہوئے اور تعلیم کے موضوع پر تقریر کی اس کے بعد چھ بجے پاکستان کے نہایت ممتاز اور مشہور عالم مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کے استقبالیہ میں شریک ہوئے۔ مولانا کی شخصیت پاکستان میں بڑی بھاری بھر کم ہے عوام وخواص میں ان کی خطابت بہت مقبول ہے اور ملک کے سیاسی حلقوں پر بھی ان کا بڑا اثر ہے، مولانا نے یہ استقبالیہ کوسموپولیٹن کلب میں منعقد کیا تھا۔ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات، علمار کرام اور تجار، یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ، بعض مشائخ عظام اور بعض سیاسی پارٹیوں کے سربراہ ڈھائی سو کی تعداد میں موجود تھے۔ استقبالیہ کا انتظام ایک بڑے شامیانے کے نیچے کیا گیا تھا۔ اس میں قرآن مجید کی تلاوت کے بعد پہلے مولانا تھانوی نے مولانا اکبرآبادی کے تعارف میں پندرہ منٹ تک فصیح وبلیغ تقریر کی جس میں موصوف کی علمی اور تحقیقی تصنیفات اور تعلیمی وتدریسی خدمات کا بہت پرجوش طریقے پر تذکرہ فرمایا۔ اس کے بعد مولانا اکبرآبادی نے "ہمارا نظام تعلیم کیسا ہونا چاہئے" کے موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس استقبالیہ میں سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی، مولانا محمد یوسف

بنوری، پیر ماکی شریف، پروفیسر احسان رشید صدر شعبہ اقتصادیات کراچی یونیورسٹی اور علامہ سراج الدین بھی موجود تھے۔ ان حضرات نے خاص طور پر مولانا کی تقریر کی بڑی داد دی اور دیر تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ پاکستان میں مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کی جو پوزیشن ہے اس کی وجہ سے کراچی کے اخبارات نے اس استقبالیہ کے فوٹو بھی شائع کئے اور مولانا اکبر آبادی صاحب کی تقریر کا خلاصہ بھی۔ کراچی میں لوگ کہتے تھے کہ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ مولانا تھانوی نے کسی بیرون ملک کے عالم کو اس بڑے پیمانے پر استقبالیہ دیا ہو۔ اس سلسلہ میں یہ ذکر کرنا رہ گیا کہ کراچی میں ایک بہت پرانا مدرسہ مدرسہ مظہر العلوم کھڈا ہے اس مدرسہ کو مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ خصوصاً اور دوسرے اکابر دیوبند کے ساتھ عموماً بہت گہرا تعلق رہ چکا ہے۔ اس تعلق کی بنا پر ایک روز مدرسہ کے ارباب حل وعقد نے مولانا کو اپنے یہاں مدعو کیا اور بڑا شاندار استقبالیہ دیا جس میں مدرسہ کے اساتذہ کے علاوہ حیدر آباد سندھ سے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی اور چند دوسرے مقامی علماء و فضلاء شریک تھے۔ اخبارات میں مولانا اکبر آبادی کا تذکرہ آنے کی وجہ سے کراچی کے مختلف ادبی، علمی اور تعلیمی اداروں کی طرف سے بھی تقریر اور استقبالیہ کی پیہم دعوتیں آرہی تھیں لیکن چونکہ پروگرام میں کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے سب سے معذرت کرنی پڑی۔ اور ۳ر جولائی کو تیز گام سے لاہور کے لئے روانگی ہو گئی، اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لئے مولانا کے اعزہ اقرباء اور خاص دوستوں کے علاوہ متعدد اخبارات کے نمائندے یونیورسٹی کے اساتذہ اور ارباب علم وادب بڑی تعداد میں موجود تھے۔

۴ر جولائی کو جب مولانا لاہور پہونچے تو ان کے لئے یہاں پہلے سے ایک پروگرام تیار تھا چنانچہ ۵ر جولائی کی شام کو چھ بجے لاہور کے مشہور ادارے "آئینۂ ادب" کی ایک ادبی تقریب میں شریک ہوئے اور اقبال پر ایک تقریر کی، جس میں اقبال کے متعلق بعض ذاتی تجربات بیان کئے، چونکہ یہ ایک نئی چیز تھی اس لئے ارباب علم وادب کے اس منتخب مجمع نے اس کو بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنا۔

۶ر جولائی کو لاہور کے ماہنامہ "سیارہ" کے ایڈیٹر اور اردو زبان کے مشہور ادیب وشاعر جناب نعیم صدیقی نے پارک لگژری نامی ایرکنڈیشنڈ ہوٹل میں مولانا کو استقبالیہ دیا، اس میں

لاہور کے ادباء اور شعراء اور اہل قلم کا بڑا اچھا اجتماع تھا۔ اس میں پہلے نعیم صدیقی صاحب نے مولانا کے تعارف میں ایک تحریر پڑھی اور اس کے بعد مولانا نے "نظام تعلیم کی اصلاح" پر کم و بیش چالیس منٹ تقریر کی۔

۸ جولائی کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ اردو کے ریڈر اور "صحیفہ" کے ایڈیٹر ڈاکٹر وحید قریشی نے نہایت پرتکلف عصرانہ دیا جس میں امتیاز علی تاج، پروفیسر محمد عثمان، مشہور ناول نویس ایم اسلم، مولوی محمد اسماعیل پانی پتی اور دوسرے ارباب علم و ادب کا ایک بڑا اچھا اجتماع تھا۔

۹ جولائی کو جناب اشرف صبوحی صاحب نے ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے پارک لگژری ہوٹل میں نہایت پرتکلف اور وسیع پیمانے پر ایک عصرانہ دیا اس موقع پر پہلے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے تعارفی تقریر کی اس کے بعد مولانا نے مجمع کو خطاب کیا۔ چونکہ یہ مجمع زیادہ تر ادبی قسم کا تھا اس لئے مولانا کی یہ تقریر بھی خالص ادبی رنگ کی تھی، جس کو لوگوں نے بڑی دلچسپی سے سنا اور مسکرا مسکرا کر داد دیتے رہے۔ یہ عصرانہ بھی اس درجہ اہم تھا کہ دوسرے دن اخبارات میں اس کا فوٹو اور اس کے اقتباسات شائع ہوئے۔

۱۱ جولائی کا دن بہت مصروف دن تھا کیونکہ اس روز صبح کو نو بجے مولانا نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ پبلک ایڈمنسٹریشن کی دعوت پر "اسلام کے معاشی نظام" پر ایک توسیعی لکچر دیا اس لکچر میں اس شعبہ کے پوسٹ گریجویٹ طلبہ اور طالبات اور اسٹاف کے علاوہ دوسرے شعبوں کے طلبہ اور اساتذہ بھی خاصی تعداد میں شریک ہوئے حسب ضابطہ لکچر کے بعد طلبہ اور طالبات کی بڑی تعداد نے سوالات کرنے چاہے لیکن چونکہ لکچر کافی طویل ہو گیا تھا اور ادھر جمعہ کا دن بھی تھا پھر مولانا کو ٹی پارٹی میں بھی شریک ہونا تھا اس لئے شعبہ کے صدر ڈاکٹر محمد افضل نے ان طلبہ اور طالبات سے معذرت کی اور جلسہ برخواست ہو گیا۔

شام کو انگریزی کتابوں کے مشہور ناشر شیخ محمد اشرف کی طرف سے مولانا کو ایک عشائیہ دیا گیا اس میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور علماء کی معقول تعداد کے علاوہ جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید

ابوالاعلیٰ مودودی، میاں محمد طفیل، آغا شورش کاشمیری، میاں امیرالدین اور پروفیسر عبدالحمید صدیقی بھی تھے۔ ڈنر تو خیر بہت پرتکلف اور شاندار تھا ہی لیکن اس مجلس میں مختلف موضوعات پر مولانا اکبرآبادی اور مولانا مودودی اور دوسرے حضرات میں جو مذاکرہ ہوا وہ بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز تھا۔ کبھی موقع ہوا تو اس کی روئداد مولانا اکبرآبادی ہی کے قلم سے سُن لیجئے گا۔

۱۲ رجولائی کو اردو کے مشہور ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" کے مالک اور ایڈیٹر صاحبان کی درخواست پر مولانا نے "اردو ڈائجسٹ" کے عملہ اور دفاتر کا معاینہ کیا اور ان حضرات کے ساتھ چائے پی اس کے بعد لاہور کے مشہور عربی مدرسہ جامعہ مدینہ میں تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ کے مختلف شعبوں کا معاینہ کرنے کے بعد اساتذہ اور طلبہ کے مجمع کو خطاب کیا اس خطاب کا موضوع تھا "علوم دینیہ کی تعلیم کیوں ضروری ہے" تقریر اس درجہ مؤثر ہوئی کہ جب مولانا نے موجودہ زمانے میں اسلام کی مظلومیت کا دردانگیز نقشہ کھینچا تو بہت سے اساتذہ بے ساختہ رو پڑے۔ چونکہ اگلے دن ۱۲ رجولائی کو لاہور سے علی گڈھ کے لئے روانہ ہونا تھا اس لئے مولانا کے داماد ڈاکٹر محمد اسلم نے جس طرح مولانا کے ورودِ لاہور کے دن سب سے پہلے استقبالیہ دیا تھا اسی طرح انھوں نے ۱۲ رجولائی کی شام کو مغرب بعد الوداعی ڈنر بھی دیا یہ ڈنر بھی بہت پرتکلف تھا۔ اس میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر علاءالدین صدیقی، آغا شورش کاشمیری، پروفیسر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، شیخ محمد اشرف، جناب محمد ادریس مینائی ڈائرکٹر نیشنل بینک آف پاکستان، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، سعیدالدین احمد ڈار، مولوی عبداللہ قریشی، جناب اشرف صبوحی، مولانا ابوبکر غزنوی صدر شعبہ اسلامیات انجینیرنگ یونیورسٹی پشاور اور دوسرے اور بعض ارباب علم وادب حضرات موجود تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد ان سب حضرات نے مولانا کو غایت درجہ محبت واخلاص کے ساتھ معانقہ کرکے الوداع کہا۔

ہم نے اس مضمون میں صرف مولانا کی ان سرگرمیوں اور مصروفیتوں کا تذکرہ کیا ہے جو پبلک حیثیت رکھتی ہیں اور جن کا تذکرہ پاکستان کے اخبارات میں فوٹو کے ساتھ یا بغیر فوٹو کے برابر ہوتا رہا ان خبروں

کے علاوہ مولانا اکبرآبادی پر پاکستان کے ممتاز اخبار "مشرق" کی اشاعت مورخہ ۱۱ر جولائی میں پاکستان کے مشہور کالم نویس انتظار حسین صاحب کے قلم سے مولانا کے فوٹو کے ساتھ ایک مقالہ بھی شائع ہوا۔ یہ مقالہ جلی سرخیوں کے ساتھ دو کالمی تھا۔ اور اس میں فاضل مقالہ نگار نے مولانا کی علمی اور تعلیمی خدمات خاص کر برہان کے بلند علمی معیار کو بہت زیادہ سراہا تھا اور "ندوۃ المصنفین" کے کاموں کی بڑی تعریف کی تھی۔

مندرجہ بالا مصروفیتوں اور سرگرمیوں کے علاوہ مولانا نے پاکستان میں اپنے کن کن دوستوں اور قدر دانوں سے ملاقات کی اور انھوں نے کس طرح مولانا کی پذیرائی کی، کیا کیا گفتگوئیں ہوئیں اور ڈیڑھ ماہ کے قیام پاکستان میں مولانا نے کیا کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا اس کی روداد اگر موقع ہوا تو مولانا خود اپنے قلم کی زبانی سنائیں گے بہرحال اس میں شبہ نہیں جیسا کہ حال میں پاکستان سے علی گڑھ آنے والے بعض حضرات سے معلوم ہوا پاکستان میں مولانا اکبرآبادی کا جو ہمہ جہتی اعزاز و اکرام ہوا وہ آج تک کسی ہندوستانی کا نہیں ہوا تھا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

قسط نمبر ۱۷

ہندو تہذیب اور مسلمان

از جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

رخصتی کے وقت رنگ پاشی نچلے طبقہ کے مسلمانوں میں آج بھی رخصتی کے وقت رنگ کھیلنے کا عام رواج پایا جاتا ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہ رسم عام تھی۔

"رنگ کھیلنے کا شادی کی دیکھا یہ عجب طور"

معلوم ہوا تب جو براتی ہیں اسکے غور رنگ کھیلنے کی جا انھیں میدان تھا رن کا[1]

جہیز[2] جہیز دولہن والوں کی حیثیت پر موقوف تھا۔ بعض لوگ ایک ہاتھی یا دو ہاتھی معہ نقرئی ہودج کے اور چار پانچ گھوڑے مع سنہری و روپہلی زین اور اسباب کے اور چند اونٹ جن پر عمدہ لباس اور برتن اور آفتابے مٹکے تانبے کے برتن اور چاندی کی ٹھلیاں اور عمدہ سامان سے بھرے ہوئے صندوق اور سونے یا چاندی کا چھپر کھٹ بھی جہیز میں دیتے تھے۔ یہ سب سامان دولہا کے گھوڑے اور دلہن کی پالکی کے آگے آگے روانہ کیا جاتا تھا۔[3]

۱ے کلیات سودا جلد دوم ص ۱۴۴، نیز ملاحظہ ہو Observations etc. vol. 1, P 388

۲ے حالانکہ ہندوؤں میں زوجین کے درمیان جہیز کا ذکر نہیں ہوتا تھا بلکہ حوصلے کے مطابق عورت کے ساتھ سلوک کیا جاتا اور جو کچھ اُسے دینا ہوتا تھا، اسی وقت دیدیا جاتا تھا جس کو واپس لینا جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کتاب الہند (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۲۳۴۔ یہ رسم ہندو اور مسلمان دونوں میں جاری تھی۔ مرزا قتیل کا بیان ہے یہ رسم ہندوستان کے تمام باشندوں میں جاری ہے کیا ہندو اور کیا مسلمان۔ اپنی حیثیت کے مطابق داماد کو جہیز دینا۔ ہفت تماشا ص ۱۵۰۔

۳ے ملاحظہ فرمایئے صفحہ ۲۰۴ پر

مگر کفوہ فرقے کے مسلمان (اس فرقے کے بارے میں ہم بعد میں تفصیلی گفتگو کرینگے) جہیز نہیں دیتے تھے اور عروس کے گھر ساچق بھی نہیں لاتے تھے اور نکاح میں بارشب عروسی کو باعما بندی کے موقع پر شربت پلانے کے بعد یہ انہوں سے نیوتہ یا نیگ بھی نہیں لیتے تھے۔ کیوں کہ یہ لوگ فرطِ غیرت سے ان کاموں کو مکروہ سمجھتے تھے۔ شادی کے بعد لاکھ دو لاکھ جو کچھ بھی ان کو میسر ہوتا تھا۔ نقد اور جنس کی صورت میں داماد کو پہونچا دیتے تھے لیکن داماد کے ساتھ جہیز نہیں بھیجتے تھے تاکہ دکاندار راہ گیر اور دوسرے تماشہ بیں گھروں کی چھتوں کے اوپر سے اس مال کو اوپر سے دیکھیں اس بات کو یہ لوگ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اور اسی طرح شربت پلانے کے بعد روپے اس وجہ سے نہیں لیتے تھے کہ بعض غریب اور نادار حاضرین شرمندہ ہوں گے یا بعض لوگ قرض لے کر دیں گے اور انھیں زیر بار ہونا پڑیگا۔ وہ لوگ حالانکہ ان رسموں کو مذموم سمجھتے تھے۔ مگر دوسروں کی شادی میں ان رسموں پر روپیہ بے دریغ صرف کرتے تھے۔ ؎

واپسی برات | جب برات واپس دولہا کے گھر پہونچتی تھی تو خوشی کے شادیانے بجتے تھے اور ڈومنیاں پہلے ہی پہنچ کر شرے گانے شروع کر دیتی تھیں۔ یہ گانے خاص شادی کے موقع کے گیت ہوتے ہیں۔ اس غل و شور میں دولہن پالکی سے اتاری جاتی تھی۔ بعض خاندانوں میں خود دولہا ہی اسے گود میں لے کر اتارتا تھا اور بعض گھرانوں میں دولہا کی ماں بہنیں آکے اتارتی تھیں الف۔ اندر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۳ ؎ ہفت تماشا ص ۱۵ جہیز کے سامان کی فہرست ملاحظہ ہو۔ رسوم دہلی ص ۱۲۶-۱۳۰

گذشتہ لکھنؤ ص ۲۵۹، ۲۰۰-۲۰۲ Tribes & Castes, I, P. 815 ; Observations etc P. 198-199-205

حاشیہ صفحہ ہذا ؎ ہفت تماشا مرزا قتیل صفحہ ۱۵۰-۱۵۱

؎ برائے تفصیل ملاحظہ ہو Observation etc PP 106-7

الف جب دلہن کی پالکی نئے گھر کے دروازے پر پہنچتی تھی تو دولھا اور دولہن کے دامن دوبارہ باندھ دیئے جاتے تھے دولھا کی بہن دروازہ روک کر کھڑی ہوتی تھی اور جب تک اسے نیگ نہیں دے دیا جاتا تھا اس وقت تک انھیں اندر نہیں جانے

باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۵ پر

لیجا کر اسے بٹھایا جاتا تھا اور دولہا اس کے دامن پر نماز شکرانہ پڑھتا تھا۔ دولہن کے پاؤں دھلا کر پانی مکان کے چاروں کونوں میں ڈال دیا جاتا تھا[۱]۔

رونمائی یہ رسم اب بھی ہوتی ہے۔ اس موقع پر تمام عورتیں اور عزیز مرد روپیہ یا زیور اور اس زمانے کے تحفے تحائف دے کر دولہن کا منھ دیکھتے تھے۔

ولیمہ ولیمہ کی شرعی حیثیت ہے مگر اس موقع پر کھلانے پلانے کے جو طریقے اختیار کئے جاتے تھے وہ سب کے سب ہندوانہ تھے اور دیہاتوں اور نچلے طبقے کے مسلمانوں میں اب بھی یہ طریقے رائج ہیں۔ مثلاً عام طور پر مہمانوں کو زمین پر بٹھایا جاتا ہے اور مٹی کے برتنوں میں کھانا کھلایا جاتا ہے ایک مرتبہ استعمال کے بعد وہ برتن پھینک دئے جاتے ہیں۔ یہی طریقہ ہندوؤں کا ہے کہ مہمانوں کو پتروں میں کھلاتے ہیں اور ایک پتل دوبارہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بیس پچیس[۲۵] سال پہلے تک شاہ تراب علی قلندر کاکوروی[۲] جو قلندریہ سلسلہ کے ایک بزرگ ہیں ان کے ہاں یہ رواج تھا کہ شادی کے موقع پر مٹی کے ایک بڑے طباق میں، جو تھال نما ہوتا تھا، اور سکوروں میں سالن نکال کر اس طباق میں ہر شخص کے لئے علیحدہ علیحدہ کھانا چنا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ کھانا کھلا کر اس طباق کو پھینک دیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ اودھ کے دوسرے قصبوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

چوتھی شادی کی رسموں میں چوتھی کی رسم آخری رسم سمجھی جاتی تھی۔ جب شادی کے چار دن گذر جاتے تھے تو دولہن کے گھر والے اسے واپس لینے آتے تھے۔ اس موقع پر مہمانوں کی خاطر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۴

دیتی تھی۔ اسکے بعد دو ایک اور رسمیں عمل میں آتی تھیں۔ اس کے بعد "سات سہاگ کا کونڈا" رسم ادا کی جاتی تھی اور اس کے مطابق سات عورتیں جن کے شوہر حیات ہوتے تھے چاول پکاتی تھیں جس کو وہ اور دولہن کھاتی تھی۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ Tribes and Castes PP 815

حاشیہ صفحہ ہذا [۱] گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۳۶۱ و صفحہ ۳۶۲

[۲] ایضاً صفحہ ۳۶۲ Tribes Castes, I, PP 831-32

تواضع ہوتی تھی، اور دونوں خاندانوں کی عورتیں بھی جمع ہوتی تھیں، اور فرطِ خوشی میں ایک دوسرے پر رنگین پانی چھڑکتی تھیں اور کپڑے رنگ دیتی تھیں۔ اس کے بعد پھولوں کے زیور مع چند ٹوکریوں کے جس میں ہری ترکاریاں مثلاً بیگن۔ شلجم اور دوسری ایسی ہی ترکاریاں اور پھل پھلار یا فصلی میوے مثلاً خربوزے ہوتے تھے، اور تربوز وغیرہ لے جاکر دولہا دلہن کو پہناتے تھے اور فریق ثانی کے زن و مرد متفق ہو کر یہی پھل اور ترکاریاں داماد اور دلہن کے اور ان کے قبیلے کی عورتوں کے ...... پھینک کر مارتے تھے اسی طرح دلہن والیاں بھی کرتی تھیں، دولھا بھی خوب زور سے پھل اور ترکاریاں ان پر پھینکتا تھا۔ یہ رسم چونکہ حرم سرا کی عورتوں میں ادا ہوتی تھی لہٰذا سوائے بچوں کے اور دولہن کے چھوٹے بھائیوں کے اور کوئی مرد وہاں بار نہیں پا سکتا تھا۔ ان ترکاریوں اور پھلوں کے علاوہ چوب گل بابا رنگ اور منقش زردوزی کا کام کئے ہوئے سیاہ یا سرخ لکڑی کے گولے یا زردوزی سے کڑھی ہوئی گیندیں بھی اس جنگ میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس جنگی کھیل میں بعض مرتبہ چوٹیں بھی لگ جاتی تھیں اور یہاں تک کہ پٹھانوں میں بینائی تک کھو بیٹھتے تھے۔ [۱]

شادی کے بعد ابتدائی زمانے میں دولہن بہت دنوں تک اپنی سسرال میں نہیں رہتی تھی بلکہ کبھی سسرال میں اور کبھی میکے میں رہتی تھی۔ [۲]

---

[۱] ہفت تماشا ص ۱۵۲-۱۵۲، نیز ملاحظہ ہو۔ مثنویاتِ میر حسن دہلوی ص ۱۲۸، کلیات سودا۔ جلد دوم ۱۴۴، ۱۶۰، ۱۹۲، ۲۲۰، ۳۶۲، ۳۶۳ مسائل ص ۱۵ الف، سیر المتاخرین (فارسی) ص ۵۵۲ گذشتہ لکھنؤ ص ۳۶۲-۳۶۲- رسوم دہلی ص ۱۳۵-۱۳۷- پنجاب میں چوتھی کی رسم "لین ہاری" کہلاتی تھی۔

Tribes and Castes, I, P, 815

[۲] ملفوظ رزاقی ص ۸۵- چالے چوتھی کے بعد چار چالے ہوتے تھے۔ پہلا چالا ماں کا، دوسرا خالہ یا پھوپھی کا، تیسرا نانی اور چوتھا دادی کا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ رسوم دہلی ص ۱۳۷-۱۳۸- گذشتہ لکھنؤ ص ۳۶۳ پنجاب میں کلادا یا چالا شادی کے ایک یا دو سال بعد عمل میں آتا تھا۔ اس موقع پر شوہر اپنی بیوی کو لے کر سسرال جاتا (حاشیہ باقی)

باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۷ پر ملاحظہ کریں

ایک اور رسم ہندو اور مسلمان دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی تھی۔ اکثر عزت دار لوگ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان جب اس شہر، قصبہ اور دیہات میں وارد ہوتے تھے جہاں ان کے شہر کی یا خود ان کی لڑکی بیاہی ہوتی تھی تو وہ اس شہر کے کسی فرد کے گھر پانی تک نہیں پیتے تھے [۱]

شاہ ولی اللہؒ نے شادی بیاہ میں غیر اسلامی رسموں کی مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہم لوگوں میں یہ ایک بدترین رسم ہے کہ شادی میں بڑے بڑے مہر باندھا کرتے ہیں جبکہ رسول اللہؐ نے اپنے اہل بیت کا ساڑھے بارہ اوقیہ مہر باندھا تھا" [۲]

مولانا شاہ محمد اسمٰعیلؒ شہید نے بھی شادی بیاہ میں مروجہ غیر اسلامی رسومات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"مہر زیادہ مقرر کرنا، شادیوں میں بے جا خرچ کرنا، شادی سے پہلے برادری کو کھانا دینا، دولہا کا لباس نارنجی یا سرخ یا زری تاش کا ہونا، ناچ رنگ مع باجے کے ہونا، نقارے، روشن چوکی، تاشے ڈھول ہونا، آتشبازی انار، اور ٹٹیاں وغیرہ ہونا، آرائش پھول کھٹولے، مٹکیاں وغیرہ ہونا، بہت سی روشنیاں اور مشعلیں وغیرہ ہونا، لڑکی کی طرف سے لڑکے کی طرف والوں کو جوڑے دینا، شادی کی شب میں اس لڑکے کا لڑکی کے گھر میں جانا، پھر وہاں جلوہ اور آرسی مصحف اور ٹوٹنے وغیرہ کا ہونا، شادی کے چوتھے دن شوہر کا اس لڑکی کے گھر جانا، اور چوتھی کھیلنا، لڑکی اور لڑکے دونوں کے ہاتھوں میں کنگنا باندھنا اور سہرا باندھنا وغیرہ" [۳]

بقیہ حاشیہ ص ۲۰۶

تھا اور اگر دولہن کا باپ صاحب حیثیت ہوتا تھا تو دولہا کو زیورات بطور تحفہ دئے جاتے تھے برائے تفصیل ملاحظہ ہو Tribes & Castes, I, P. 815-16

[۱] ہفت تماشا، ص ۱۲۱ نیز Tribes and Castes, I, P. 900

[۲] وصیت نامہ شاہ ولی اللہ (مطبوعہ دہلی) ص ۲۷

[۳] تقویۃ الایمان (نول کشور ۱۸۸۳ء) ص ۲۴۲

موت کی رسمیں[1]

جب کسی شخص کی روح کے پرواز کرنے کا وقت قریب آتا تو اس کو چارپائی سے اٹھا کر زمین پر لٹا دیتے تھے[2] وفات کے بعد بُری طرح سے سوگ منایا کرتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہید نے اس موضوع کو بڑی وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب کوئی مرجاتا تھا تو لوگ خصوصاً اس کے رشتہ دار چلا چلا کر روتے تھے اور عورتیں سر پیٹتی اور آہ و بکا کرتی تھیں۔ پھر جو عورت ماتم پرسی کو آتی وہ بھی اس کے ساتھ رونے پیٹنے میں شریک ہوجاتی۔ پھر کسی کے ہاں تین دن تک، کسی کے ہاں سات دن تک، کسی کے ہاں چالیس دن تک اور کسی کے ہاں چھ چھ ماہ تک یہی معمول رہتا تھا کہ عورتیں حلقہ بنا کر کھڑی ہوتیں اور ایک عورت اس مرحوم کے اوصاف حمیدہ بیان کرتی جاتی کہ فلاں ایسا تھا اور ایسا تھا تو وہ سب عورتیں اپنے زانوؤں اور اپنے مُنہ پر طمانچے مارتیں اور ہائے ہائے کرتیں اور بعض کے یہاں تو اس قدر ہوتا تھا کہ ہر صبح و شام عورتیں اکٹھا بیٹھ کر چلا کر روتیں۔ پھر کسی کے یہاں چالیس دن تک، کسی کے یہاں چھ ماہ تک، کسی کے یہاں برس روز تک اور کسی کے ہاں دو برس تک یہی بات جاری رہتی تھی[3]۔

---

[1] ہندوؤں کے ہاں موت کے وقت اور بعد کے سوگ اور غم کے لیے ملاحظہ ہو۔ آئین اکبری (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۲۹۲۔ ۲۹۶۔ کھتریوں میں سوگ کے طریقے کا ذکر کرتے ہوئے مرزا قتیل نے لکھا ہے "ایک جوان آدمی کی موت پر حجامی کی بیوی اس متوفی کے گھر کی عورتوں یعنی ماں، بہن، چچی، دادی، اور خالہ کے مجمع میں آکر اُن کو ماتم کے لیے کھڑی کرتی ہے اور گریہ وانددوگیں آواز میں نوحہ خوانی کرتی ہے تاکہ عورتیں بھی اس کے ساتھ خود وہ الفاظ کہہ کر سر و سینہ پیٹیں۔" ہفت تماشا ص ۱۱ نیز ملاحظہ ہو ص ۱۰۹

[2] تقویۃ الایمان ص ۲۵۴۔ ۲۶۲، ہفت تماشا ص ۱۶۹۔ ۱۷۰، رسوم دہلی ص ۱۴۱۔ ۱۵۶

Tribes and Castes, I, PP 875-891

[3] مرثیوں میں بھی ماتم کا یہی طرز اور انداز اختیار کیا گیا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۹ پر ملاحظہ فرمایئے)

جس عورت کا شوہر مرجاتا تھا، پھر وہ بقیہ زندگی رنگین سرخ کپڑے اور نتھ وغیرہ زیور جو سہاگ کی نشانی ہوتی تھی، نہیں پہنتی تھی[الف] اور خوشبو کا بھی استعمال نہیں کرتی اور اس گھر میں بوریا فرش وغیرہ بچھا کر عورتیں اس پر رہا کرتی تھیں۔ پھر بعضوں کے ہاں چالیس دن تک اور بعضوں کے ہاں چھ ماہ تک اور بعضوں کے ہاں برس روز تک وہ فرش بچھا رہتا اور گویا لوگ اس کو سوگ اور غم کی علامت سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں ان دنوں میں کسی کا نکاح یا ختنہ نہیں کرتے تھے۔ عورت اور مرد مدتوں تک سوگ میں رہا کرتے۔ کوئی سرخ کپڑا نہ پہنتا، سرمہ نہ لگاتا، پان نہ کھاتا، خوشبو نہ لگاتا، عورتیں چوڑیاں نہ پہنتیں، کپڑے نہ سیتیں۔ گھر یا رشتہ داروں میں کسی کے ہاں شادی نہ ہوتی۔ جب کوئی مرجاتا تو اس کے گھر میں کڑاہی نہ چڑھتی، پکوان نہ پکتے، اور دنوں تک گوشت نہ پکتا۔ کوئی چارپائی پر نہ سوتا۔ برس روز تک گھر میں سرکے کا اچار نہ پڑتا۔ بڑیاں اور سوتیاں نہ بنتیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۸) ملاحظہ ہو مراثی سودا، مراثی انیس، مراثی دبیر۔ سودا کے ایک مرثیہ کا ایک بند ملاحظہ ہو:

کیسی کری وہ لول بیاہی دکھ سہتی ہے ہے ہے ہے
لوہو کی ندی اس کے نین سے اب بہتی ہے ہے ہے ہے
پیٹتی ہے سر اپنا ہر دم رکھتی ہے ہے ہے ہے
بیوہ ہو کر یاد میں تیری یوں کہتی ہے ہے ہے ہے

کلیات سودا جلد ۲ ص ۱۹۱

اور محرم میں تعزیہ دار اسی طرح ماتم کرتے تھے جس طرح کسی کے ہاں موت کے موقع پر سوگ منایا جاتا تھا

برائے تفصیل دیکھئے Observation etc, PP 24-27

[الف] کلیات سودا۔ جلد دوم

بینا نتھ یہ سنگار سب پل میں دیو گنوائے چادر اوڑھے ملگجی بیٹھی سیس نوائے
ص ۱۹ Observation etc, P 26

مندرجہ بالا رسموں کے علاوہ تیجا، دسواں، چالیسواں، چھ ماہی، برسی اور عید اور شب برات

لہ سید احمد دہلوی کا بیان ہے "مثلاً رسم تیجا ہندوؤں میں فاتحہ سوم یا پھول مسلمانوں میں۔ اگرچہ پھول کا لفظ یہاں بھی مشترک ہے کیوں کہ ہندوؤں میں پھول مردوں کی جلی ہوئی ہڈیوں کو کہتے ہیں جو تیسرے روز مرگھٹ سے چن کر گنگاجی لے جانے کے واسطے جمع کرتے ہیں۔ عام مسلمانوں نے اس رعایت کی غرض سے اس روز مردے کی قبر پر ارگجا اور پھولوں کی چادر بھیجنا ایک لازمی امر سمجھ کر فاتحہ سوم کا نام پھول رکھ لیا۔ ارگجا ٹھیٹ ہندی لفظ بمعنی خوشبو مستعمل ہے۔ مسلمانوں نے برادۂ صندل، مشک، کافور، عنبر، عرق گلاب وغیرہ کو ملا کر ایک مرکب خوشبو کا نام ارگجا رکھ لیا جسے خاص تیجے کے روز ایک پیالہ بھر کر اور اس پیالہ کو ایک پھولوں کی بھری رکابی میں رکھ کر ہر ایک فاتحہ خواں کے سامنے لے جاتے ہیں۔ وہ ایک پھول قل ہو اللہ پڑھ کر اس پیالے کے اندر ڈال دیتا ہے اور پیالہ مردے کی قبر پر بھیج کر مع چادر رکھ دیا جاتا ہے۔ رسوم دہلی ص ۲۷-۲۸

مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے:

"سوم اور چہلم کی فاتحوں نے عوام میں عجب شان پیدا کر لی ہے۔ اصلیت تو اسی قدر ہے کہ جہاں تک ہو سکے غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے اور اس کا ثواب مرنے والے کو پہونچا دیا جائے۔ ہندوستان میں ہندوؤں میں مردوں کی تیرہویں اور برسی ہوتی دیکھ کر مسلمانوں کا جی چاہا کہ ہم بھی اس قسم کے کام ناموری اور دھوم دھام سے کریں۔ اس شوق کے تقاضے نے تیجے، دسویں، بیسویں، چہلم، ... غمی کی تقریبیں پیدا کر دیں"۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ گذشتہ لکھنؤ ص ۷۰

برائے تیجا کے پھول۔ ملاحظہ ہو۔ کلیات سودا۔ جلد دوم ص ۱۶۵، ۱۸۰، ۲۲۰

اہلیہ میر حسن علی نے لکھا ہے کہ جب کسی مسلمان خاندان میں کسی فرد کا انتقال ہو جاتا تھا تو وہ لوگ چالیس دن تک سوگ مناتے تھے اور داڑھی وغیرہ نہیں بنواتے تھے مگر عام طور پر تیسرے دن سوگ کی مدت ختم ہو جاتی تھی اور لباس سوگ اتار ڈالتے تھے اور داڑھی بنوانے لگتے تھے۔ دوسری رسم یہ تھی کہ متوفی کی یاد میں تیجا، ساتواں اور چالیسواں وغیرہ کو کھانا دیتے تھے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۱۱ پر)

کے دنوں میں متوفیوں کے غم کو تازہ کیا جاتا تھا اور ان کے نام کی فاتحہ دلوائی جاتی تھی[1]۔

(باقی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۰) یہ کھانا طشتوں میں لگا کر رشتہ داروں اور دوستوں کو بھیجا جاتا تھا۔ ایک اور رسم یہ تھی کہ جب تک جنازہ گھر سے نہیں اُٹھ جاتا تھا اس گھر میں کھانا نہیں پکتا تھا بلکہ رشتہ دار یا دوست انھیں کھانا بھیجتے تھے۔ Observances etc, PP 56-57

حاشیہ صفحہ ہذا

[1] تقویۃ الایمان ص ۲۶۲، وصیت نامہ شاہ ولی اللہ ص ۴۷، کلیات سودا جلد دوم ص ۱۹۲

Tribes & Castes PP 875-91

ادبیات

غزل

جناب اکمل مظفر نگری

(۱)

صبح آتی ہے لئے خندۂ شوخ و بیباک — اور ہے شام کے چہرے پہ نقابِ صد چاک
خامشی رات کی ہے ایک سکوتِ مادر — اور دن کی ہے یہ شورش کوئی طفلِ چالاک

(۲)

وہ خیالات جو لفظوں سے حیا کرتے ہیں — دل کے نغمات میں یوں رقص کیا کرتے ہیں
جس طرح باغ میں بادِ سحری کے جھونکے — ہمرہ سایۂ گل ناچ لیا کرتے ہیں

(۳)

اوس نے جب کششِ ذوقِ تجلی دیکھی — وقتِ پرواز گلستانِ جہاں سے بولی
پھول بن کر ہوں مرے خواب کبھی تا زینتِ باغ — اس لئے کرتی ہوں سورج سے محبت میں بھی

(۴)

قطرۂ شبنمِ تر پھول پہ جو رقصاں ہے — دُرِّ خوش آب ہے یا انجمِ سحر تاباں ہے
چشمِ تحقیق سے دیکھا تو ہوا یہ معلوم — انقلابوں کا جو خالق ہے یہ وہ طوفاں ہے

(۵)

مئے گلرنگ سے لبریز ہیں پھولوں کے ایاغ — بوئے گل مرکزِ خوشبو کا لگاتی ہے سراغ
کعبۂ عشق کی ہر شام اسی فکر میں ہے — مردِ مومن کوئی لے آئے یہاں اپنا چراغ

(۶)

صبح دم ہنس کے یہ سورج سے گلِ تر نے کہا — کونسا میں ترے جلوؤں کو سناؤں نغما
سن کے سورج نے کہا اس سے کہ اے جانِ چمن — تیری خاموشی ہی نغمہ ہے اسے گائے جا

تبصرے

وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت از ڈاکٹر محمد طیب ابدالی تقطیع کلاں ضخامت ۲۲۰ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد /6۔ پتہ: کتاب منزل سنہری باغ، پٹنہ ۴۔

مرزا غالب کے شاگردوں میں ایک بزرگ تھے سید فرزند علی صوفی منیری۔ انھوں نے ۱۳۱۱ھ میں حضرت مخدوم جہاں شرف الدین منیری اور آپ کے خلفا کا ایک تذکرہ اُردو زبان میں مرتب کیا تھا۔ جو متعدد بار شائع ہو چکا ہے لیکن اب فاضل مرتب نے بڑی محنت اور کاوش سے اسے اپنی تصحیح اور تحشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے تحشیہ کا یہ عالم ہے کہ کتاب میں ضمنی طور پر جن جن علمائے کرام اور مشائخ و صوفیا یا کتابوں کے نام آئے ہیں ان پر معلومات افزا حواشی لکھے ہیں اور جن واقعات میں کچھ ابہام تھا یا کوئی تلمیح تھی اس کی وضاحت کی ہے۔ آخر میں حواشی کے مضامین کی فہرست اور ان کے مضامین کے مآخذ کی فہرست الگ الگ ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف مزارات کے ایک درجن فوٹو بھی ہیں۔ غرض کہ کتاب علمی، تاریخی اور ادبی تینوں حیثیت سے بہت مفید اور لائقِ مطالعہ ہے۔ البتہ مرتب نے دیباچہ میں صاحب تذکرہ صوفی منیری کے حالات و تصنیفات کے ذکر پر مشتمل ایک مقدمہ کا ذکر کیا ہے لیکن وہ مقدمہ کہاں ہے؟ اس کتاب میں تو کہیں نہیں ہے۔

تین تذکرے از جناب نثار احمد فاروقی، تقطیع متوسط، ضخامت ۳۴۷ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد /6۔ پتہ: مکتبہ برہان اردو بازار دہلی ۶۔

ہندوستان کے شعرائے اردو و فارسی کے حالات میں شاہ محمد کمال کا تذکرہ "مجمع الانتخاب"، قدرت اللہ شوق کا تذکرہ "طبقات الشعراء" اور رائے لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا "گلِ رعنا"

یہ تینوں تذکرے جس درجہ اہم ہیں اتنے ہی کمیاب بھی ہیں۔ پھر مشکل یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اتنا ضخیم ہے کہ اس کو اڈٹ کرکے چھاپنا بھی آسان نہیں ہے۔ اس بنا پر فاضل مرتب نے جو اردو زبان وادب کے نامور محقق ہیں اور مخطوطات کا خاص ذوق رکھتے ہیں ان تینوں کی تلخیص کردی ہے اور اس میں اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ جو معلومات مطبوعہ تذکروں میں موجود نہیں ہیں یا ہیں مگر کسی قدر کے اختلاف کے ساتھ ان کو ہی تلخیص میں شامل کریں۔ ظاہر ہے یہ تلخیص بجائے خود بڑی قابلِ قدر علمی خدمت ہے لیکن موصوف نے صرف اس پر قناعت نہیں کی بلکہ شروع میں ستر صفحات کا ایک طویل مقدمہ اور اختتام بھی لکھا ہے جس میں بڑی بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ مذکورہ بالا تینوں تذکروں کے مختلف نسخوں اور ان کی خصوصیات واہمیت اور ان کے مصنفین کے حالات و سوانح پر سیر حاصل کلام کیا ہے۔ اس طرح یہ مقدمہ خود ایک مستقل افادیت کا حامل ہے اور اردو زبان وادب کا کوئی طالب علم اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

ادب اور تنقید از پروفیسر اسلوب احمد انصاری تقطیع متوسط، ضخامت ۲۴۸ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد/ 8 پتہ: سنگم پبلشرز، الہ آباد ۳

لائق مصنف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انگریزی کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں اور ساتھ ہی مشرقی ادبیات خصوصاً اردو زبان وادب پر بڑی گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں، اس علمی اور ادبی جامعیت کے ساتھ طبیعت میں بڑی سلامت روی اور میانہ پسندی ہے، اور زبان و بیان پر قدرتِ کاملہ بھی حاصل ہے۔ ان وجوہ سے ان کے تنقیدی مضامین و مقالات ان کی فنی بصیرت و مہارت، ادبی ژرف نگاہی تنقیدی شعور کی پختگی اور حسن اظہار و ابلاغ کے آئینہ دار ہوتے ہیں، چنانچہ یہ کتاب بھی جو موصوف کے سترہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان سب خصوصیات کی حامل ہے اس مجموعہ میں شروع کے سات مقالات میں تو شعر اور تنقید وادب کے بعض اہم اور اصولی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے۔ باقی دس مضامین میں بعض نامور ادبا اور شعرا مثلاً غالب، حسرت، فراق، ابوالکلام آزاد، عبدالحق اور رشید احمد صدیقی وغیرہم کے فن پر الگ الگ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے

شعر و ادب کے معاملے میں کسی بھی مصنف اور نقاد کے ہر خیال اور ہر نظریہ سے اتفاق کرنا محال ہے۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فاضل مصنف نے جو کچھ لکھا ہے مضمون پر پوری طرح حاوی ہو کر بڑے غور و فکر اور وسیع و عمیق مطالعہ کے بعد بڑے رکھ رکھاؤ اور رچاؤ کے ساتھ لکھا ہے جو معلومات آفریں بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ ہمارے خیال میں اس کتاب سے اردو میں فن تنقید کے وسیع ذخیرہ میں ایک بڑا قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ جناب عابد رضا صاحب بیدار تقطیع کلاں ضخامت ۴۹۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت مجلد /۲۵

مولانا سے متعلق انگریزی اور اردو میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مقالات کا تو کوئی شمار ہی نہیں لیکن یہ کتاب سب سے نرالی اور اپنی سج دھج کی ایک ہی ہے۔ اس میں لائق مرتب نے مولانا کی شخصیت، سوانح حیات، صحافت اور علمی و ادبی اور سیاسی کارناموں کی داستان خود مولانا کی زبان سے سنا کر مرحوم کی ایک ایسی جامع تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں چہرہ کی آب و تاب کے ساتھ اس کی چھائیاں اور داغ بھی آ گئے ہیں۔ مولانا کے عقیدت مندوں کو اس کتاب کے بعض حصوں سے سخت صدمہ ہوگا۔ اور یہ واضح رہے کہ مصنف بھی عقیدت مند ہی ہیں ــــــ لیکن مورخ اور سوانح نگار کے قلم پر کون پابندی لگا سکتا ہے۔ بہرکیف اس میں شبہ نہیں کہ کتاب بڑی محنت اور عرق ریزی سے مرتب کی گئی ہے اور اس بنا پر اس میں ایسی متعدد مولانا کی تحریریں اور معلومات شامل ہیں جو کہیں اور کسی جگہ دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ البتہ مصنف نے عجیب و غریب انداز میں کتاب کا "انتساب" لکھ کر اپنی حق گوئی اور راست پنداری کا وہ بھرم مجروح کر دیا ہے جو وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق قائم کرنا چاہتے تھے۔

یادگار نظر از جناب جگر بریلوی تقطیع متوسط ضخامت ۲۹۵ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت 6/50 پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی متوفی ۱۹۲۳ء اردو زبان کے مشہور شاعر، ادیب اور

صحافی ہونے کے علاوہ لکھنؤ کی قدیم تہذیب و شرافت کا نمونہ بھی تھے۔ موصوف نے نثر اور نظم دونوں میں بہت کچھ لکھا لیکن وہ سب یکجا نہیں تھا اس لئے جناب جگر بریلوی نے اس کتاب میں حتی المقدور اس کو جمع کر کے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ اس مجموعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب نظر کو غزل اور نظم دونوں پر بڑی قدرت تھی اور وہ صاحب فن ہونے کے علاوہ زبان اور اسلوب بیان کے بھی نکتہ شناس تھے۔ حصہ نثر میں ان کے تنقیدی مقالات جو مولانا شبلی کے موازنہ "انیس و دبیر، گلزار نسیم" اور "میر انیس" پر ہیں وہ ان کے عمیق تنقیدی شعور اور وسیع مطالعۂ ادب کی دلیل ہیں۔ شروع کے سو صفحات میں لائق مرتب نے نظر کے سوانح حیات، لکھنؤ کی اس زمانہ میں تہذیب اور نظر کی شاعری اور ان کی انشا پردازی پر جو گفتگو کی ہے وہ معلومات افزا بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ اس لئے اردو زبان کے طلبا کے لئے خاصہ کی چیز ہے۔

(۱) **اسلام اور اس کا آئین حکومت** صفحات ۱۲۴ (۲) **اسلام اور اشتراکیت** صفحات ۸۸	از غلام محمد صاحب، تقطیع خورد قیمت 2/50 و 1/50 علی الترتیب پتہ: ۲۳۔ مسیح گڑھ۔ ڈاک خانہ جامعہ نگر نئی دہلی ـ ۲۵

یہ دونوں رسالے جن کا موضوع ان کے نام سے ظاہر ہے اگرچہ بقامت کہتر ہیں مگر بقیمت بہتر بھی ہیں۔ مصنف نے اپنی بحث کا دار و مدار زیادہ تر قرآن مجید پر ہی رکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے شستہ اور شگفتہ زبان میں منطقی استدلال کے ساتھ لکھا ہے۔ البتہ کہیں کہیں بے اعتدالی ہو گئی ہے مثلاً پہلی کتاب کے ص ۹ پر صوفیا اور علما کے متعلق عمومی طور پر یہ کہنا غلط ہے کہ ان حضرات کے نزدیک شریعت، اسلام اور امور سلطنت ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہر حال دونوں کتابیں دلچسپ اور مفید ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اُردو زبان میں

ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ

قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار اردو کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السّلام کے حالات اور اُن کے دعوتِ حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۱۷۸۴ ہیں۔

حصہ اوّل:- حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السّلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم:- حضرت یوشع علیہ السّلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السّلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور اُن کی دعوتِ حق کی محققانہ تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم:- انبیاء علیہم السّلام کے واقعات کے علاوہ: اصحاب الکہف والرقیم اصحاب القریۃ اصحاب السبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور ربوہ، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، اصحاب الجنۃ، ذوالقرنین اور سدِ سکندری، سبا اور سیل عرم وغیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و محققانہ تفسیر۔

حصہ چہارم:- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اوّل دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے

قیمت مکمل سٹ اکتیس روپے۔ اُجرت فی جلد فی پارچہ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

ملنے کا پتہ **مکتبہ برہان اُردو بازار۔ جامع مسجد دہلی ۶**

Registerd No. D. 183 SEPTEMBER 1969

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

برہان

جلد (۶۳) | رجب المرجب و شعبان ۱۳۸۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۹ء | شمارہ (۴)

فہرست مضامین

نظرات

سمجھ میں نہیں آتا کہ پچھلے دنوں احمد آباد۔ اس کے مضافات اور بڑودہ وغیرہ میں جو نہایت ہولناک اور حد درجہ درد انگیز فسادات ہوئے ہیں ان پر کن لفظوں سے ہم اپنے رنج والم، حزن وملال اور غم و غصہ کا اظہار کریں۔ ہر بڑے فساد کے بعد چیخ و پکار ہوتی ہے۔ لیڈروں کے بیانات میں ان کی مذمت کی جاتی ہے۔ قومی یکجہتی کونسل کی میٹنگ ہوتی ہے اور حکومت بھی فسادات کو روکنے کے لیے اپنے عزم و حوصلہ کا اعلان کرتی ہے اور نیک ارادوں کے ان سب مظاہر کو دیکھ کر توقع یہ ہوجاتی ہے کہ چلو جو کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب آئندہ آگ اور خون کا یہ کھیل نہیں کھیلا جائے گا اور اقلیت کو ایک با عزت شہری کی طرح زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے گا لیکن اس توقع کے برخلاف ہوتا یہ ہے کہ سال چھ مہینہ کے بعد ہی اچانک کبھی یہاں اور کبھی وہاں فسادات کا لاوا اس شدت سے ساتھ پھٹ پڑتا ہے کہ سابقہ فسادات بھی فراموش ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ گجرات کا فساد سب پر سبقت لے گیا ہے اور خود وزیر داخلہ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک کوئی فساد اتنے بڑے پیمانہ پر نہیں ہوا۔ یہ ڈرامہ کوئی آج نیا نہیں بلکہ گزشتہ بائیس برس سے بڑی یکسانیت اور تسلسل کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے اور اس ڈرامہ کا ہر شو اس درجہ ہولناک ہوتا ہے کہ پچھلے تمام شو اس کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ "تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"

یہ فسادات کیوں ہوتے ہیں؟ کس طرح ہوتے ہیں؟ ان میں کیا کیا ہوتا ہے کون لوگ ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور کیوں لیتے ہیں؟ ان میں عظیم جانی اور مالی نقصانات کس فرقہ کے ہوتے ہیں؟ اب ان پر گفتگو کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چند بد طینت اور ننگ انسانیت قسم کے لوگ خواہ کہیں دنیا کی آنکھوں میں خاک نہیں جھونک جاسکتے مشرق و مغرب کا ہر انسان اپنے اور پرائے سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اور اس کی ذمہ دار کون سی پارٹی اور جماعت ہے۔ اس لیے اب سوچنا صرف یہ ہے

کہ کیا کیا جائے۔ اور ملک و قوم کی اس عظیم۔۔۔ بدقسمتی کو کہ جو اگر یونہی مسلط رہی تو ملک کی سالمیت اور اس کے استحکام کو ایک روز یقیناً کسی دیوانہ کا خواب بنا کر رکھ دے گی، کیونکر دور کیا جائے۔ ایک مہذب اور ایک وحشی اور غیر مہذب قوم میں فرق کیا ہے؟ یہ فرق بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ مہذب قوم کی ایک حکومت اور ان کا ایک دستور ہوتا ہے اور سب افراد اس کے پابند رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف وحشی قوم کے افراد اپنے اغراض اور خواہشات کے غلام ہوتے ہیں۔ ان میں ڈسپلن اور نظم و ضبط نہیں ہوتا۔ انہیں حکومت اور قانون کی بالکل پروا نہیں ہوتی انسانیت اور شرافت کا ان کے ذہن میں کوئی تصور نہیں ہوتا اپنی خواہشات کی تکمیل اور حظ نفس کی خاطر بے گناہ انسانوں عورتوں اور مردوں بوڑھوں اور بچوں کے خون سے ہولی کھیلنا ان کے لیے ایک دلچسپ و دلآویز مشغلہ حیات ہوتا ہے کشتگان ظلم و ستم کی چیخ و پکار اور ان کی آہ و زاریاں ان ظالموں کے دل میں انسانی ہمدردی کا کوئی ادنیٰ جذبہ بھی پیدا کرنے کے بجائے ان کے لیے رقص نشاط اور پندارِ کامرانی کی دعوت ہوتی ہیں۔ غور کیجئے۔ آج فسادات میں کیا یہی سب کچھ نہیں ہو رہا ہے؟ اگر ہو رہا ہے تو جو سماج اور جو سوسائٹی اس ماحول اور فضا میں پرورش پا رہی ہے وہ موجودہ سائنس اور ٹکنالوجی اور بین الاقوامی علائق و روابط کی دنیا میں کب تک آزادی اور سالمیت کی زندگی بسر کر سکتی ہے؟ اس کا جواب معلوم کر لینا ذرا مشکل نہیں ہے۔

آج حال یہ ہے کوئی نہیں بتا سکتا کہ کل کیا ہوگا تاہم سر دست یہ علامت اچھی ہے کہ احمد آباد وغیرہ کے حالیہ فسادات کی تیزی اور شدت نے گورنمنٹ اور اکثریت کے مُردہ ضمیر کو بھی جھنجوڑ دیا اور ہلا دیا ہے چنانچہ ایک طرف صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم نے اپنے بیانات اور تقریروں میں ان واقعات پر نہایت صاف لفظوں میں اپنے عمیق رنج و غم اور شدید اضطراب و تشویش کا اظہار کیا ہے اور وزیر داخلہ نے ان کی سخت مذمت کرنے کے ساتھ تمام ریاستوں کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی ہے اور دوسری جانب مرارجی ڈسائی اور بعض دوسرے قومی کارکنوں نے برت رکھ کر اپنے گہرے دکھ اور غم کو ظاہر کیا ہے اگر ہمارا یہ اندازہ صحیح ہے کہ اس وقت حکومت اور اکثریت میں ضمیر کی بیداری اور فسادات کے سدباب کا عزم پایا جاتا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت کچھ ہو بھی سکتا ہے ایک وقت تھا جبکہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ

شریمتی اندرا گاندھی کا اقتدار دوسروں کا مرہون کرم ہے لیکن اب حالات بالکل دوسرے ہیں اور ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ بڑے بڑے با اقتدار اور با اثر سیاست کے پیرائے شاطر اپنے تحفظ و بقا کے لیے اندرا گاندھی کے رحم و کرم کے محتاج ہیں، اسی بنا پر آج وزیراعظم اور ان کی حکومت ملک اور قوم کے فائدہ کے لیے جو کچھ بھی کرنا چاہیں بے جھجک کر سکتے ہیں اور پورا ملک اسی کی تائید کرے گا اس سلسلہ میں ہم چند ضروری تجاویز پیش کرتے ہیں۔ اگر ان کو ایمانداری کے ساتھ عملی جامہ پہنایا گیا تو ملک سے اس نحوست کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ تجاویز یہ ہیں۔

(۱) مرکز میں خاص اقلیتوں کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کو سر انجام دینے کے لیے ایک وزارت قائم کی جائے (۲) مرکز کے محفوظ پولیس دستوں کی طرح خاص فسادات کی روک تھام کے لیے RIOT POLICE FORCE کے نام سے پولس کے دستے متعین کئے جائیں اور ان دستوں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا تناسب پچاس پچاس فی صد ہو (۳) ان دستوں کے لیے جن نوجوانوں کا انتخاب ہو ان کے متعلق اس بات کا پورا اطمینان کر لیا جائے کہ ان کا تعلق کبھی کسی جارحیت پسند (MILITANT) تنظیم یا جماعت سے تو نہیں رہا ہے (۴) ان جوانوں کو ٹریننگ کے زمانہ میں مذہب اور اخلاقیات کا درس دیا جائے اور سکولرزم اور جمہوریت کی قدریں ان کے ذہن نشین کی جائیں۔ (۵) جارحیت پسند جماعتوں کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان کی سرگرمیوں اور ان کے لیڈروں کی تحریروں اور تقریروں پر کڑی نظر رکھی جائے (۶) جہاں کہیں فساد ہو اس کے لیے وہاں کے حکام کو ذمہ دار قرار دے کر ان کے ساتھ تادیبی کارروائی کی جائے (۷) جو لوگ فساد کے بانی اور شورش پسند ثابت ہوں ان کو عبرت انگیز سزائیں دی جائیں اور اس سلسلہ میں مجسٹریٹوں کے نام خاص قسم کی ہدایات جاری کی جائیں (۸) اسکولوں میں تاریخ اور زبان پر جو کتابیں پڑھائی جاری ہیں ان کی خاص طور پر نگرانی کی جائے کہ کہیں ان کے ذریعہ بچوں کے دماغ کو مسموم کرنے کی کوشش تو نہیں کی جارہی ہے اگر ان تجاویز پر ایمانداری اور مضبوطی کے ساتھ عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ملک کے لیے آئے دن کی اس مصیبت کا خاتمہ نہ ہو۔

اُنیسویں صدی کے ہندوستان کی ہیئت شرعی

(شاہ عبدالعزیزؒ کے فتاوائے دار الحرب کا ایک علمی تجزیہ)

ڈاکٹر مشیر الحق ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی (میکگل)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آخر اٹھارہویں صدی تک ہندوستان کے مغل حکمران اپنی اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اس ملک کے شہنشاہ سمجھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے کم سے کم ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں یہ ملک اصولی طور پر دارالاسلام کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ۱۸۰۳ء میں دلی پر انگریزوں کا سیاسی تسلط ہو جانے کے بعد صورت حال میں تبدیلی آگئی اور لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونے لگا کہ دارالسلطنت پر انگریزوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان کو دارالاسلام ہی سمجھا جائے یا اسے دارالحرب کہا جائے۔ یہ سوال ذہنوں میں آیا ہی کیوں اور اس سوال کے پوچھنے کا مقصد کیا تھا۔ اس پر ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب شاہ عبدالعزیزؒ (۱۱۵۹ = ۱۷۴۶ / ۱۲۳۹ = ۱۸۲۳) سے ہندوستان کی ہیئت شرعی کے بارے میں سوالات کئے گئے تو انہوں نے ہندوستان کو دار الحرب ہونے کا فتوے دیا۔

شاہ صاحب کے فتوے دینے کے تقریباً سو سال کے اندر اندر ہندوستان کی سیاسی صورت میں نمایاں تبدیلیاں آگئیں۔ وہی ہندوستانی جنہوں نے ۱۹ ویں صدی میں انگریزوں کو بجبر یا برضا اس ملک کا مطلق العنان حاکم تسلیم کر لیا تھا۔ بیسوں صدی میں آزادی کی

خاطر ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ آزادی کی اس جنگ میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ درحقیقت یہ جنگ تھی ملکی اور غیر ملکی کے درمیان۔ انگریز غیر ملکی تھے انہیں ملک بدر کرنے کے لئے ہر ملکی کو، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو۔ متحد ہونا تھا۔ نہ صرف یہ کہ انہیں متحد ہونا تھا بلکہ جنگِ آزادی کی فوج میں نئے سپاہیوں کو بھرتی کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ لیڈر عوام میں یہ احساس پیدا کریں کہ ان کی انگریز دشمنی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے وقت ہی سے ان کے بزرگ انگریز دشمن رہے ہیں مسلمانوں میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان علماء نے جو جنگ آزادی میں پیش پیش تھے۔ شاہ صاحب کے فتوائے دارالحرب سے کام لیا۔ عام طریقہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک دارالاسلام جب دارالحرب ہو جاتا ہے تو وہاں کے مسلمانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس ملک کو پھر سے دارالاسلام بنانے کے لئے اپنی ہر ممکنہ قوت استعمال کریں۔ اور اگر پوری کوشش کے باوجود انہیں کامیابی نہ ہو تو پھر ایسے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس پس منظر میں جب شاہ صاحب کے فتوی کی اشاعت کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ لوگوں نے یہی نکالا کہ انہیں ہندوستان کی آزادی کی خاطر انگریزوں سے جنگ کرنی ہے اور اگر اس جنگ میں انہیں شکست ہو تو پھر ملک سے ہجرت کر جانا ضروری ہے کیوں کہ ان کے بزرگ شروع سے یہی کرتے (یا کہتے) آئے ہیں۔

۲۰ ویں صدی کا ابتدائی حصہ ہندوستان میں سیاسی حیثیت سے تاریخ کی حسب منشا تعبیر و تشریح کے لئے بہت مناسب تھا۔ اس لئے جب کہنے والوں نے یہ کہا کہ شاہ صاحب نے اپنے فتوی کے رو سے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ ضروری قرار دیا تھا کہ وہ یا تو انگریزوں سے جنگ کریں یا بدرجۂ مجبوری اس ملک سے ہجرت کر جائیں، تو کسی کو بھی اس میں کوئی عجوبہ نظر نہ آیا۔ کسی نے بھی یہ سوچنے کی اتنی زحمت گوارا نہ کی کہ اس تشریح و تعبیر میں حقیقت کا شائبہ کہاں تک ہے۔ اس وقت چونکہ ہندوستان میں انگریز دشمنی کا رجحان عام تھا۔ اس لئے کسی نے

بھی یہ سوال نہیں کیا کہ اگر شاہ صاحب نے جہاد یا ہجرت کا حکم دیا تھا تو پھر ان کی زندگی میں لوگوں نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا۔ اور اگر اس فتویٰ پر عمل کرنا مقصود نہ تھا۔ تو پھر لوگ خواہ مخواہ یہ سوال پوچھ ہی کیوں رہے تھے۔ اس کے برعکس دارالحرب میں فریضۂ جہاد و ہجرت کے مسئلہ پر بار بار زور دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص تسلیم کرنے لگا کہ کسی ملک کے دارالحرب ہو جانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ مسلمان یا تو جہاد کریں یا ہجرت، اب اگر کسی زمانے یا کسی ملک کے مسلمان اپنے اس فریضے کو ادا نہیں کرتے تو یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے، ان کی اپنی بے عملی، شریعت کے عائد کردہ فریضہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ شریعت کے احکام کو ناپنے کا پیمانہ مسلمانوں کا عمل یا ان کی بے عملی نہیں ہے۔ لیکن اس مفروضہ ہی میں کہاں تک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں پر جہاد یا ہجرت کا فریضہ عائد کیا تھا۔

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیکر مسلمانانِ ہند پر جہاد یا ہجرت کا فریضہ عائد کیا تھا۔ وہ بھی کھل کر یہ بات نہیں کرتے کہ شاہ صاحب نے واضح الفاظ میں جہاد یا ہجرت کا حکم دیا تھا۔ بلکہ درحقیقت یہ مطلب وہ فتویٰ کے بین السطور سے نکالتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سیاسی صورت حال کے باعث شاہ صاحب کھل کر نہ تو جہاد کا حکم دے سکتے تھے اور نہ ہجرت کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک شرعی اصطلاح کا سہارا لے کر اپنے مافی الضمیر کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ذاتی پسندیدگی اور سیاسی مصلحتوں سے بلند ہو کر اگر ہم اس مسئلہ پر نظر ڈالیں تو اس تشریح کی حیثیت ایک علمی مغالطہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ سب سے پہلے تو ہمیں فتویٰ اور سیاسی بیان کے فرق کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ ایک سیاسی لیڈر جب کوئی بیان جاری کرتا ہے۔ (خواہ وہ فتویٰ ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو) اس کے پیش نظر وقت کی سیاسی مصلحت ہوتی ہے۔ سیاسی لیڈر اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ لوگ اس سے سوال کریں پھر وہ کوئی بیان دے۔ بلکہ صورت حال کا مطالعہ کر کے

خود ہی اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک مفتی اس وقت فتویٰ دیتا ہے جب اس کے سامنے کسی متعین مسئلہ کو پیش کر کے اس سے شریعت کا حکم معلوم کیا جاتا ہے[1] چوں کہ اس دوسری قسم میں مجیب کے علاوہ سائل بھی ایک اہم کردار ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ہمیں کسی فتویٰ میں سوال کی غرض و غایت کا پتہ چل جائے تو پھر فتویٰ کے بین السطوری مفہوم کی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

دارالحرب کے سلسلے میں ایک بہت ہی اہم بات جو عام طور پر نظر انداز کر دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک دارالاسلام، دارالحرب میں تبدیل ہو جانے کے بعد وہاں کی مسلمان آبادی پر صرف "فرائض" ہی عائد نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں چند ایسے حقوق بھی عطا کرتا ہے جو اس سے قبل مسلمانوں کو دارالاسلام میں حاصل نہیں تھے۔ مثلاً دار کی تبدیلی اگر مسلمانوں پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ دارالحرب کو دوبارہ دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ تو دوسری طرف انہیں یہ حق بھی عطا کرتی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے سودی لین دین کر سکیں۔ جس کی انہیں پہلے اجازت نہیں تھی۔ اس کلیہ کو ذہن میں رکھ کر جب ہم شاہ صاحب کے ان تمام فتووں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہندوستان کی ہیئت شرعی کے متعلق ہیں، تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس وقت جن لوگوں کو بھی دارالحرب کے مسئلہ سے دلچسپی تھی انہیں اپنے "فرض" سے زیادہ اپنے "حق" کی فکر تھی۔

مجموعہ فتاویٰ عزیزی[2] میں ہندوستان کی ہیئت شرعی سے متعلق ہیں کئی ایک فتاویٰ ملتے ہیں۔ سب سے پہلا فتویٰ اس اصولی اور علمی سوال کے جواب میں ہے کہ ایک دارالاسلام کبھی دارالحرب میں تبدیل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حسب ذیل باتیں دارالاسلام کو دارالحرب میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

۱۔ دارالاسلام میں غیر مسلموں کے احکام کا جاری ہو جانا۔

۲۔ قبضہ کرنے والے دارالحرب اور مقبوضہ دارالاسلام کے درمیان کسی دوسرے دارالاسلام

کا واقع نہ ہونا۔

۳۔ امان اول کا ختم ہو جانا۔

اگر ان تینوں شرطوں کو ضروری سمجھا جائے، تو پھر شاہ صاحب کے زمانے میں ہندوستان کو دارالحرب کہنا ممکن نہ تھا۔ کیوں کہ ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان ایک دوسرا دارالاسلام (خلافت عثمانیہ) کا وجود تھا۔ شاید اسی دشواری کے پیش نظر شاہ صاحب نے دارالحرب کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ درحقیقت دارالاسلام وہ ملک ہے جہاں امام المسلمین کے احکام جاری و ساری ہوں۔ اور دارالحرب وہ ملک ہے جہاں حربیوں (غیر مسلموں) کے احکام چلتے ہوں۔ اس تشریح کے مطابق ہندوستان دارالحرب تھا۔ کیوں کہ اس وقت کے ہندوستان پر مغلوں کی نام نہاد حکومت کے باوجود سکہ انگریزوں کا چلتا تھا، جیسا کہ اسی فتویٰ میں مذکور ہے:

" اس شہر (دہلی) میں امام المسلمین کے بجائے عیسائی حکام کا اقتدار ہے۔ اقتدار کا مطلب یہ ہے کہ امور مملکت، ٹیکسوں کی وصولیابی، مجرموں کی سزائیں، مقدمات کے فیصلے، سب کچھ ان کی مرضی سے طے کئے جاتے ہیں۔ ہاں چند اسلامی شعائر ایسے ہیں جن سے وہ تعارض نہیں کرتے۔ مثلاً جمعہ و عیدین کی نمازیں، اذان اور قربانی وغیرہ لیکن یہ آزادی مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ عیسائیوں کی سیاسی مصلحت کی بنا پر ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ مساجد کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں اور ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان کا دبدبہ اس قدر ہے کہ انکی اجازت کے بغیر کوئی بھی مسلمان یا ذمی اس شہر بلکہ اس شہر کے مضافات میں بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ تاجروں اور اس قسم کے بے ضرر مسافروں کی آمد و رفت پر انہوں نے کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس میں خود انہیں کا فائدہ ہے۔ لیکن سیاسی حیثیت سے معروف لوگ مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم[4] اس شہر میں ان کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔ اس شہر سے لے کر کلکتہ تک عیسائیوں کی

حکومت ہے۔ دائیں بائیں اور درمیان کی چند ریاستوں مثلاً لکھنؤ، رام پور اور حیدرآباد میں انہوں نے اپنے احکامات جاری نہیں کیے ہیں۔ کیوں کہ یہاں کے نوابوں نے ان سے معاہدے کر رکھے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہندوستان کو دارالحرب ہی کہنا پڑے گا۔ جیسا کہ ہمیں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بنی یربوعؓ کے علاقہ کو دارالحرب قرار دے کر مانعین زکوٰۃ سے جہاد کیا تھا۔ حالاں کہ وہاں اذان و نماز سب جاری تھیں:...“(۵)

مذکورہ بالا سوال وجواب سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا لیکن استفتا اتنا مختصر ہے کہ اس سے ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ پوچھنے والے نے یہ سوال اٹھایا ہی کیوں تھا۔ سوال صرف اتنا تھا کہ ایک دارالاسلام کبھی دارالحرب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب اصول فتویٰ نویسی کے مطابق ہاں یا نہیں میں ہونا چاہئے تھا۔ ہندوستان کی تفصیلی صورت حال کا تذکرہ مذکورہ بالا استفتا کے جواب میں غیر ضروری معلوم ہوتا ہے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یا تو مرتبین فتاویٰ کو سوال کا پورا متن نہیں ملا یا پھر جواب کا مذکورہ بالا ٹکڑا کسی دوسرے سوال کے جواب کا ہے۔ جسے مرتبین نے غلطی سے اس جگہ لگا دیا ہے۔(۶) بہر حال اس سے قطع نظر کہ مذکورہ بالا ٹکڑا اسی سوال کے جواب کا حصہ ہے یا نہیں، یہ بات بلاشبہ طے ہو جاتی ہے کہ ہندوستان شاہ صاحب کی نظر میں دارالحرب تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو ہندوستان کے دارالحرب یا دارالاسلام ہونے کی فکر تھی، انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہی کیوں تھا اور پھر یہ جان لینے کے بعد کہ ہندوستان دارالحرب ہے انہوں نے اگلا قدم کیا اٹھایا؟ اس سوال کا جواب جب تک ہمیں واضح طور پر نہ مل جائے اس وقت تک ہماری یہ بحث نامکمل رہتی ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب کیوں قرار دیا تھا۔ ”فتاوے عزیزی میں ہمیں مختلف جگہوں پر دارالحرب اور اس سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل سے متعلق چند اور بھی سوال وجواب ملتے ہیں۔ جسے عام طور سے آج کل مورخین نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب

تک ہم ان تمام فتاویٰ کا ان کے سیاق و سباق کے ساتھ مطالعہ نہ کرلیں، کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا سوال جو ہمیں فتاویٰ عزیزی میں ملتا ہے، وہ دار الحرب میں حربی غیر مسلموں کو سود دینے سے متعلق ہے۔ شاہ صاحب کا جواب سننے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی معاشی حالت اس درجہ کو پہنچ چکی تھی کہ وہ اپنی غیر ضروری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے سود پر عام طور سے قرض لیا کرتے تھے۔ اس زمانے کی سماجی تاریخوں کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سود کے شکنجے میں نہ صرف عوام بلکہ بڑے بڑے امراء حد یہ ہے کہ خود بادشاہ بھی جکڑے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ سودی قرض لینے والے مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی رہے ہوں گے جو سودی لین دین کو حرام سمجھنے کے باوجود مجبوراً سود پر قرض لیتے رہے ہوں گے اور انہیں اس کی فکر بھی رہی ہوگی کہ کسی صورت سے ان کا یہ فعل 'گناہ' کے زمرے سے نکل جائے۔ اس گناہ سے بچنے کی سب سے بہترین صورت تو یہ تھی کہ وہ ہر قسم کی تکالیف برداشت کرتے مگر سود پر قرض نہ لیتے۔ لیکن یہ آسان کام نہ تھا۔ زندگی میں ایسے بے شمار نمائشی مواقع آتے ہیں۔ جب عوام و خواص کی اکثریت آخرت کی جوابدہی کے مقابلے میں ہم چشموں کے طنز و تعریض کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ سود پر روپیہ قرض لے کر سماجی اور رواجی تقریبات میں اپنے کو دوسروں سے برتر ثابت کرنا انہیں مواقع میں سے ایک ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی شرعی صورت نکل آتی ہے جس کی رو سے کوئی گناہ از روئے شرع گناہ کے زمرے سے نکل جاتا ہے۔ تو پھر ہم خرما و ہم ثواب کے پیش نظر کون اس سے واقفیت حاصل کرنا نہیں چاہے گا۔ سودی لین دین سے متعلق جو سوال اوپر نقل کیا گیا ہے وہ اس ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شاہ صاحب اس نکتہ کو نہ سمجھ رہے ہوں گے۔ لیکن وہ ایک مفتی کی حیثیت سے اس بات پر مجبور تھے کہ سوال کا وہی جواب دیں جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہو۔ خواہ اس کے اثرات سوسائٹی پر کیسے ہی پڑتے ہوں۔ چوں کہ شریعت میں سود لینے اور دینے میں کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے صرف 'سود دینے' کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اصولی بحث

شروع کی اور کہا کہ کتب فقہ کی رو سے سود دینے اور سود لینے کا حکم یکساں ہے۔ شریعت نے دونوں کو منع کیا ہے لیکن اس ممانعت کا اطلاق دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان باہمی سودی لین دین پر نہیں ہوگا ... واضح رہے کہ حربیوں سے دارالحرب میں سود لینا تو اس وجہ سے جائز ہے کہ ان کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے بشرطیکہ مال کا حصول کسی بدعہدی یا بے ایمانی کے ذریعہ نہ ہو۔ سودی لین دین میں ایک حربی چونکہ اپنی مرضی سے خوشی خوشی سود ادا کرتا ہے اس وجہ سے اس کا لینا مسلمانوں کے لئے بالکل جائز ہے دوسری طرف حربیوں کو سود دینا اس وجہ سے جائز ہے کہ سود کی حیثیت مال حرام کی سی ہے۔ اور چونکہ حربی مسلمانوں کے برخلاف، حرام چیزیں کھاتے ہیں اس لئے اگر انہیں سود دیا جائے تو اسکی حیثیت اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہوگی کہ انہیں مال حرام کھلایا گیا۔ اور یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ حکم دارالاسلام میں رہنے والے غیر مسلموں کے لئے نہیں ہے۔ ایسے غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان سودی لین دین ناجائز ہے۔ کیوں کہ اس طرح دارالاسلام میں سودی کاروبار ترویج پا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو ایک مسلمان دارالاسلام میں بھی بحالت مجبوری کسی غیر مسلم سے سودی قرض لے سکتا ہے۔ (۷)

مذکورہ بالا جواب اس بات پر خاصی روشنی ڈالتا ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے مسلمان ہندوستان کی ہیئت شرعی کو معلوم کرنے کے لئے بے چین کیوں تھے۔ بایں ہمہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا سوال ایک مسئلہ کی علمی تشریح و تعبیر سے متعلق تھا اور اس کا تعلق ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے عمل سے نہیں تھا۔ مگر یہ مفروضہ اس وقت ختم ہو جاتا ہے، جب ہم اگلے سوال وجواب پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس استفتا میں حسب ذیل سوالات پوچھے گئے تھے۔

۱۔ ہندوستان کے وہ علاقے جو عیسائیوں کے قبضہ میں ہیں دارالحرب ہیں یا دارالاسلام؟ اگر یہ علاقے دارالحرب ہیں تو کیا یہاں کے مسلمان عیسائیوں سے سود لے سکتے ہیں؟

۲۔ کیا دارالحرب میں جمعہ کی نماز پڑھ لینے سے ظہر کی [illegible] ساقط ہو جاتی ہے؟ (۸)

۳۔ کیا بوقت ضرورت مسلمان غیر مسلموں سے سودی لین دین کر سکتے ہیں؟

ان سوالات کے جواب میں شاہ صاحب نے یہ اصولی بات بتائی کہ کسی ملک کے دارالحرب ہونے کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنا چاہیئے، اور دیکھنا چاہیئے کہ وہ صورتیں عیسائیوں کے مقبوضہ علاقوں میں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ صورتیں پائی جاتی ہیں تو پھر یہ علاقے دارالحرب ہوں گے۔ اور مسلمانوں اور حربیوں کے درمیان سودی لین دین از روئے شرع جائز ہوگا۔ بہرحال مسلمانوں کو یہ چاہیئے کہ وہ غیر مسلموں کو سود دینے میں احتیاط برتیں۔ اور بے ضرورت سود نہ دیں۔

اقامت جمعہ کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر کسی دارالحرب کے والی نے اپنی طرف سے کسی شہر میں مسلمان حاکم مقرر کر دیا ہے تو اس مسلمان حاکم کی اجازت سے جمعہ قائم کیا جائے گا۔ لیکن اگر ایسی صورت موجود نہ ہو تو پھر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ باہمی مشورہ سے کسی امین اور متدین شخص کو اپنا رئیس (امام) مقرر کر لیں اور اس کی اجازت سے شرعی امور مثلاً اقامت جمعہ و عیدین اور بے والی وارثوں وغیرہ کے نکاح کا انتظام کیا کریں۔ لیکن واضح رہے کہ یہ امام صرف شرعی معاملات پر نظر رکھے گا۔ ملک کی سیاسیات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو پھر مناسب یہ ہے کہ مسلمان جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد احتیاطاً چار رکعت نماز ظہر کی بھی پڑھ لیا کریں۔ تاکہ اگر جمعہ کی نماز سے فرضیت ادا نہیں ہوئی ہے تو پھر ان چاروں رکعت سے ظہر کی فرضیت ادا ہو جائے۔

سوال کی تیسری شق کے متعلق شاہ صاحب نے دارالحرب کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ سودی لین دین جائز ہے۔ (۹)

ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے یہ جوابات آپ کے ہم عصروں کے علم میں ضرور آئے ہونگے۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی رہے ہوں گے جنہیں یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ اگر ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں باہمی سودی لین دین کی کھلی چھٹی دے دی گئی تو پھر

مسلمانوں میں سود کے خلاف تھوڑی بہت جو جھجک باقی رہ گئی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔
حسب ذیل سوال اسی فرضیت کی غمازی کرتا ہے۔ اگرچہ سوال کرنے والے کا نام نہیں معلوم
لیکن عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سائل کی نظر مسائل فقہیہ پر اچھی خاصی ہے اور سوال
کے پردہ میں وہ شاہ صاحب کے خیالات پر اعتراض کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے:

"ہدایہ میں لکھا ہوا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے دار الحرب میں غیر مسلموں سے سود لینا جائز قرار دیا ہے۔ لیکن امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی اس رائے کے خلاف ہیں۔ قرآن و حدیث میں بھی سود کے بارے میں جو احکام مذکور ہیں ان کو دیکھتے ہوئے سود کا جواز (دار الحرب میں بھی) مستبعد العقل معلوم ہوتا ہے ـــــ اور ہاں کیا آپ انگریزوں کے علاقوں کو بھی دار الحرب سمجھتے ہیں؟" (۱۰)

اس سوال کے جواب میں بھی شاہ صاحب نے اپنے موقف میں تبدیلی نہیں
کی۔ انہوں نے کہا کہ سود کے مسائل بہت پیچیدہ ہیں، مختصراً یہ سمجھنا چاہیئے کہ دار الحرب میں
مستامن مسلمان کے لئے یہ تو جائز نہیں ہے کہ وہ غیر مسلموں کے مال پر زبردستی قبضہ کرلے
لیکن اگر کوئی غیر مسلم اپنی خوشی سے کچھ دے تو اس کا لینا جائز ہے۔ خواہ یہ ادائیگی کسی شرط
فاسد ہی کے تحت کیوں نہ ہو رہی ہو۔ رہ گئی یہ بات کہ انگریزی علاقے دار الحرب ہیں یا نہیں
اس کا پتہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ حالات کی
تبدیلی سے ایک دار الاسلام دار الحرب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تبدیلی لانے والے حالات کے
تعین میں اختلاف رائے ہے۔ کچھ فقہا کا خیال ہے کہ شعائر اسلام میں سے اگر ایک شعار میں بھی
تبدیلی آجائے تو دار کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ مثلاً حکماً اذان اور نماز بند کر دی جائے یا ختنہ
ممنوع قرار دے دیا جائے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ دار کی تبدیلی صرف شعائر اسلام
کے محو ہو جانے پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اگر تمام شعائر کی اجازت کے باوجود دار الاسلام میں
شعائر کفر کھلم کھلا رواج پا جائیں اور مسلمانوں کو ان کے روکنے پر قدرت حاصل نہ ہو تو

پھر ایسا دار الاسلام دار الحرب ہو جاتا ہے، تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ دار الاسلام صرف اس وقت دار الحرب ہو جاتا ہے جب وہاں کوئی مسلمان یا ذمی امان اول پر باقی نہ رہ جائے، خواہ شعائرِ اسلام ترک ہوتے ہوں، یا نہ ہوتے ہوں، اور خواہ شعائرِ کفر کا رواج ہوا ہو یا نہ ہو۔ اس تیسری رائے کو محققین اور اہل علم صحیح سمجھتے ہیں۔ اور اس کے مطابق انگریزی علاقے بلا شبہ دار الحرب ہیں۔ (۱۲)

حاصل مدعا یہ ہے کہ شاہ صاحب کے مجموعہ فتاویٰ میں، ہمیں جتنے بھی سوالات دار الحرب سے متعلق ملتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک سوال بھی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ پوچھنے والے کو اس بات کی فکر تھی کہ اگر ہندوستان جو اس وقت تک کم از کم نظری طور پر دار الاسلام تھا دار الحرب ہو گیا ہے تو پھر اسے سابقہ حالت پر لانے کے لئے مسلمانوں کو کیا کرنا ہوگا۔ اس کے برعکس ہر سوال اس وقت کے مسلمانوں کی معاشی اور سماجی حالت کی غمازی کرتا ہے۔ خواہ ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ سودی لین دین اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں گہری جڑ پکڑ چکا تھا۔ معاملہ صرف مسلمانوں اور غیر مسلموں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فتاویٰ عزیزی میں شاہ صاحب کا ایک ایسا بیان بھی ہمیں ملتا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ خود مسلمان باہم ایک دوسرے سے سودی لین دین کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل بیان جو کسی سوال کے جواب میں نہیں، بلکہ ایک مسئلہ کی حیثیت سے مجموعہ فتاویٰ میں مذکور ہے۔ اس معاملہ پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔ شاہ صاحب کے قول کے مطابق "احادیث کی رو سے سودی لین دین قطعاً حرام ہے، سوائے اس کے کہ کوئی چارہ کار باقی نہ رہ جائے"، ایسے مواقع پر قانون استثنیٰ پر عمل ہوگا، جیسا کہ قرآن نے اشد ضرورت کے موقع پر مردار کا کھا لینا بھی جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ سودی لین دین عام ہو جائے جس طرح کہ ہندوستان میں ہے، تو وہاں پر اس ناجائز کام کو قانون عموم بلویٰ (۱۳) کے تحت جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ عموم بلویٰ کا قانون طہارت و نجاست کے مسئلہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس قانون کی رو

سے حرام کو حلال یا حلال کو حرام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ (۱۴)

مذکورہ بالا بیان میں اگرچہ یہ واضح طور سے نہیں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں باہم سودی لین دین عام ہو گیا تھا۔ لیکن اگر ہم پچھلے فتووں کو ذہن میں رکھیں تو پھر اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ عبارت ایسے موقع کے لئے ہے جہاں دونوں پارٹیاں مسلمان ہیں۔ ورنہ جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سودی لین دین کا مسئلہ تھا، اسے تو شاہ صاحب نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا تھا کہ ہندوستان کے دار الحرب ہو جانے کے باعث اس میں کوئی قباحت نہیں رہ گئی تھی لیکن یہاں پر جو لوگ عموم بلوی کی آڑ لے کر سودی لین دین کو جائز قرار دینا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب اسے غلط قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عموم بلوی کی آڑ انہیں مسائل میں لی گئی ہو گی جہاں دونوں پارٹیاں مسلمان ہوں گی۔ یہ صرف ایک خیال ہی نہیں ہے کہ مسلمان باہم بھی سودی لین دین کرتے تھے۔ بلکہ ہمیں چند اور ایسے ہی سوالات مجموعہ فتاویٰ میں ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بعض مسلمانوں کو یہ ڈر تھا کہ اگر دار الحرب کے مسئلہ کی بنا پر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سودی لین دین کو جائز ٹھہرایا گیا تو ایک نہ ایک دن مسلمان خود ایک دوسرے سے کھلم کھلا سودی لین دین شروع کر دیں گے۔ ان خطوط پر سوچنے والے یہ چاہتے تھے کہ سود کو بالکلیہ حرام سمجھا جائے، لیکن شاہ صاحب نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اس طرح اندیشۂ فردا کے تحت ہر مسئلہ کو حل کیا جائے گا تو پھر جہاد کو بھی ممنوع قرار دینا پڑے گا۔ کیوں کہ جہاد میں بظاہر تباہی و بربادی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہوتا ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں میں جنگ جوئی کی عادت باقی رہی تو اگر وہ کبھی غیر مسلموں کو نہ پائیں گے تو خود باہم ایک دوسرے سے جنگ و جدال شروع کر دیں گے۔ یہ کہنے کے بعد شاہ صاحب پوچھتے ہیں کہ کیا اس اندیشہ کی وجہ سے جہاد کو ناجائز قرار دے دیا جائے؟ (۱۵)

اوپر کے صفحات میں دارالحرب میں سودی لین دین کے جواز کے سلسلے میں جو سوالات وجوابات پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ شاہ صاحب یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے سودی لین دین کو حرام کے درجہ سے نکال کر حلال قرار دے دیں۔ درحقیقت یہ مسئلہ جیساکہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس زمانے کے حالات کی پیداوار تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط سے قبل جب تک مسلمانوں کی مضبوط حکومت قائم رہی اور کم از کم نظری طور حکومت یا اہلِ حکومت کا مذہب اسلام رہا۔ اس وقت تک عوام یہ سمجھتے رہے کہ ان کی معاشی ذمہ داریاں حکومت کے سر ہیں۔ مددِ معاش، جاگیرات اور اسی قسم کے دوسرے وظائف سے حکومت لوگوں کی مدد کرتی رہتی تھی۔ لیکن نظامِ حکومت کے بدل جانے کے بعد ہر شخص کی معاشی ذمہ داری اس کے اپنے سر آپڑی۔ خرچ کے سلسلے میں بگڑی ہوئی عادتوں کو سنبھالنا آسان نہ تھا۔ آسان صورت یہی رہ جاتی تھی کہ مستقبل کا خیال کئے بغیر حال کی ذمہ داریوں کو سودی قرض لے کر یا غیر مسلم حکومت سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر کے پوری کی جائیں۔ اور اس سلسلے میں شریعت کی طرف سے اگر کوئی رکاوٹ پڑتی ہو تو اسے شریعت کی روسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ رویہ بہ ظاہر خواہ کتنا ہی معیوب ہو۔۔۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب کسی بھی مذہب کی شریعت ایک "قانون" کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو پھر ایک نہ ایک دن اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ یہ رجحان ہمیں صرف ۱۹ ویں صدی کے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ماضی میں بھی نظر آتا ہے فقہ کی ہر اہم کتاب میں "حیلوں" کا ایک باب بھی ہوتا ہے۔ جن میں وہ صورتیں درج ہوتی ہیں جن پر عمل کر کے ایک شخص بظاہر شریعت کی روح کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی شریعت کی پابندی کرتا رہتا ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے مجموعہ فتاویٰ عزیزی سے صرف ایک مثال پیش کر دینی کافی ہوگی۔

ہنڈی یا آج کل کی اصطلاح میں بنک ڈرافٹ کے ذریعہ روپیہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا جو طریقہ ہے اس سے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ناواقف ہو۔ شاہ صاحب سے

جب اس طریق کار کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے اسے ناجائز قرار دیا۔ کیوں کہ شریعت کی رو سے ہم جنس اشیاء کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ نہیں ہوسکتا لیکن اگر جنس بدل جائے تو پھر ہر قسم کی کمی بیشی جائز ہے۔ مثلاً ایک سیر چاول کے بدلے سوا سیر چاول نہ تو لئے جاسکتے ہیں اور نہ دئے جاسکتے ہیں۔ لیکن اسی ایک سیر چاول کا تبادلہ من دو من گیہوں سے ہوسکتا ہے کیوں کہ چاول اور گیہوں مختلف الجنس ہیں۔ اس طرح ایک جگہ زائد روپے دے کر دوسری جگہ کم روپے نہیں لئے جاسکتے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص یا ادارہ ہنڈی کا کام کرتا ہے۔ وہ حق المحنت کے نام سے کچھ زیادہ روپیہ ادا کرتا ہے۔ زبان سے اس طریقہ کو ناجائز قرار دیدینا تو آسان ہے۔ لیکن عملی زندگی میں اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ یا تو پوری قوم کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ گناہ کا ارتکاب کرتی رہے۔ یا پھر کوئی ایسی صورت نکالی جائے جس سے گناہ گناہ نہ رہے۔ اس نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاہ صاحب نے ہنڈی کو جائز کرلینے کی ترکیب ("طریق حلال کردن ایں وبا...") بھی بتا دی۔ آپ نے کہا کہ ہنڈی کی ممانعت صرف اس وجہ سے ہے کہ روپے کی جنس ایک ہے، اس لئے اس کے تبادلہ میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ لیکن روپیوں کے ساتھ اگر کچھ ریزگاری بھی دی جائے اور اس کے بدلے صرف روپے لئے جائیں تو چوں کہ روپے اور ریزگاریاں مختلف الجنس ہیں اس لئے ان کے تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہو جائیگی۔[۲]

یہ مثال جملہ معترضہ کے طور پر یہاں آگئی ہے اور اس کے بیان کرنے کا مقصد اگر ایک طرف یہ دکھانا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ۱۹ ویں صدی کی ابتدا میں ایک نئے نظام سے روشناس ہورہے تھے اور ایک ایسی رہنمائی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو ان میں شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے نئے حالات سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرے۔ تو دوسری طرف یہ سوالات ہمیں ان مسائل کے سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ جن سے اس وقت کے مسلمان دوچار ہو رہے تھے۔ سودی لین دین کے علاوہ دوسرے اہم مسائل جو اس وقت مسلمانوں کو درپیش تھے وہ بظاہر سیاسی لیکن درحقیقت معاشی تھے۔ قرآن کی آیت ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (گناہوں اور برائیوں

میں تم شریک کار نہ بنو) کی موجودگی میں اکثر مسلمانوں کو .... یہ خیال آتا رہا ہوگا کہ وہ انگریزوں سے تعاون نہ کریں کیوں کہ ان کی وجہ سے دارالاسلام کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ اگر وہ تعاون نہ کرتے تو کھاتے کہاں سے۔ کہنے کو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندہ رہنے کیلئے انگریزوں سے تعاون کرنا کچھ ضروری نہیں تھا کیوں کہ مسلمان آزادانہ طور سے صنعت وحرفت کے پیشے کو اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن اس قسم کی بات درحقیقت وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے مسلم سماج کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ملازمت کو ذریعہ افتخار سمجھا ہے اور زراعت وتجارت وغیرہ کو دوسرے درجہ پر جگہ دی ہے۔ ۱۹ ویں صدی کی پہلی دہائی میں بھی یہی ذہنیت ہندوستانی مسلم سماج میں کارفرما تھی۔ ۱۲۲۹ھ یعنی ۱۸۱۳ء میں پوچھے گئے اس سوال کے جواب میں کہ حلال روزی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ شاہ صاحب نے ذرائع معاش کو چار درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں ملازمت سب سے اوپر ہے اس کے بعد زراعت پھر تجارت ہے۔ اور سب سے نیچے صنعت وحرفت ہے (۱۷) ظاہر ہے کہ جس سماج کے معاشی ڈھانچہ میں ملازمت اور زراعت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو وہ سماج حکومت سے عدم تعاون کس طرح کر سکتا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب کے سامنے جب بھی یہ سوال رکھا گیا کہ مسلمان انگریزوں کی ملازمت کریں یا نہ کریں؟ تو ہر بار آپ نے یہی کہا کہ انگریزوں کی ملازمت جائز ہے بشرطیکہ اس ملازمت میں خلاف شرع کوئی کام نہ کرنا پڑے (۱۸) ظاہر ہے کہ یہ شرط انگریزوں کے ساتھ مخصوص نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ کسی بھی ملازمت میں اگر خلاف شرع کوئی کام کرنا پڑے تو وہ ملازمت جائز نہ ہوگی۔ خواہ ملازمت دینے والا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ نہ صرف یہ کہ شاہ صاحب نے ملازمت کے جواز کا فتویٰ دیا بلکہ جب خود آپ کے بھتیجے اور داماد مولانا عبدالحی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے میرٹھ کے مفتی کا عہدہ پیش کیا گیا تو شاہ صاحب نے انہیں ملازمت قبول کر لینے کی اجازت بخوشی دے دی۔ آپ کے اس فیصلہ کو اس وقت کے مشہور نقشبندی صوفی شاہ غلام علی نے پسند نہیں کیا اور شاہ عبدالعزیز کے نام ایک خط میں لکھا کہ انگریزوں کی ملازمت سے رزق حاصل کرنے

کی بجائے مولانا عبدالحی کو چاہیئے کہ وہ فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کریں۔ لیکن شاہ صاحب۔ نے اس خط کے جواب میں اپنے خیالات کو بہت ہی تفصیل سے پیش کرتے ہوئے اپنے اور مولانا عبدالحی کے طرز عمل کو شریعت کی نظروں میں بہتر اور پسندیدہ ثابت کیا۔ (۱۹)

ملازمت پیشہ مسلمانوں کے برخلاف زراعت پیشہ مسلمان دہری مشکلات سے دوچار تھے انگریزوں کے اقتدار کے بعد زراعت کے لئے زمینیں انگریزوں ہی کے ذریعہ مل سکتی تھیں۔ اور یہ زمینیں وہی تھیں جو انگریزوں نے مسلمان بادشاہ یا مسلمان زمین داروں سے چھینی تھیں۔ اب اگر ان چھینی ہوئی زمینوں کو مسلمان انگریزوں سے لے کر کاشت کرتے تو سب سے پہلے انہیں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت تھی کہ ان کا یہ فعل "تعاون علی الاثم والعدوان" کے زمرہ میں نہیں آتا اور دوسری طرف اس خدشہ کو بھی دور کرنا تھا کہ اب جن (انگریز) بادشاہوں سے وہ زمین حاصل کر رہے ہیں دار الاسلام پر ان کا قبضہ شرعاً تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کیوں کہ ان کا قبضہ اگر عندالشرع نہ ہو تو اس بات کا پورا امکان تھا کہ انگریزوں کے کسی وقت بھی ملک سے چلے جانے کے بعد سابقہ مالکان ازروئے شرع زمینوں کے دعویدار ہو جائیں گے۔ اس اندیشہ کی وجہ یہ تھی کہ بعض فقہا کے خیال میں دار الاسلام ہمیشہ دار الاسلام ہی رہتا ہے اور اگر کبھی اس پر حربیوں کا قبضہ ہو بھی جائے تو اس کیفیت کو عارضی سمجھا جائے گا۔ اگر اس فتویٰ پر عمل کیا جاتا تو پھر ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ اور ان سے کئے ہوئے ہر قسم کے معاہدات ازروئے شرع عارضی ہوتے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ایک زراعت پیشہ شخص انگریزوں سے حاصل کی ہوئی زمین پر محنت اور سرمایہ لگانے سے ہچکچاتا، کیوں کہ اس کو اپنی ملکیت کا اطمینان نہ ہوتا۔ شاہ صاحب نے زمینوں کے مسئلہ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اسی لئے جب ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ خیال بے بنیاد ہے کہ ایک دار الاسلام دار الحرب نہیں ہو سکتا۔ یہ تبدیلی ممکن ہے، کیونکہ جب کبھی بھی حربی کسی دار الاسلام ... پر اس طرح قابض ہو جائیں کہ مسلمان اپنی سیاسی قوت کھو دیں، تو وہ ملک دار الحرب ہو جاتا ہے۔ شریعت حربیوں کے قبضہ کو تسلیم کر لیتی ہے۔ اور انہیں یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی

رعایا سے جس قسم کے معاہدات چاہیں کریں۔ اس نظریہ کے مطابق ہندوستان کی آراضیات پر انگریزوں کا قبضہ عارضی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے جو لوگ ہندوستانیوں کی ضبط شدہ آراضیات انگریزوں سے قیمتاً یا تحفتاً قبول کر کے اپنے تصرف میں لائیں گے۔ وہی لوگ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی شرعاً مالک شمار ہوں گے۔ پرانے مالکان ان زمینوں کو واپس لینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ (۲۰)

یہ صحیح ہے کہ مجموعہ فتاویٰ میں ایسا کوئی سوال ہمیں نہیں ملتا، جس میں یہ پوچھا گیا ہو کہ ہندوستان کے دار الحرب ہو جانے کے بعد مسلمانوں پر ہجرت یا جہاد کا فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن ہمیں ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ بات آرہی تھی کہ ہندوستان کے دار الحرب ہو جانے کے بعد وہاں سے ہجرت کر جانا ضروری تھا۔ ہمیں اسکی شہادت تو نہیں ملتی کہ شاہ صاحب کی زندگی میں کسی بھی عالم نے ہجرت کے مسئلہ پر عمل کرتے ہوئے اجتماعی ہجرت کی کوئی تحریک چلائی ہو۔ لیکن مجموعہ فتاویٰ عزیزی میں ہمیں کسی شخص کا ایک اعتراض شاہ صاحب کے اس طرزِ عمل پر ملتا ہے کہ وہ ہندوستان کو دار الحرب سمجھتے ہوئے بھی وہاں قیام پذیر تھے۔ یہ طرزِ عمل معترض کی نظروں میں خلاف شریعت تھا۔ شاہ صاحب نے اس اعتراض کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ آپ کے خیال میں اس دار الحرب سے ہجرت فرض تھی۔ جہاں مسلمانوں کو اپنے شعائر دینی ادا کرنے کی ممانعت ہو۔ ہندوستان میں مسلمان چوں کہ اپنے شعائر دینی مثلاً اذان، نماز قربانی وغیرہ کی ادائیگی میں آزاد تھے۔ اس لئے ہندوستان دار الحرب ہوتے ہوئے بھی اس زمرہ میں نہیں آتا تھا جہاں سے ہجرت کرنی ضروری ہوتی۔ (۲۱) یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رہنی چاہیئے کہ شاہ صاحب دار الحرب سے ہجرت اس وقت تک ضروری قرار نہیں دیتے جب تک کہ شعائر مذہبی کو ادا کرنا حکومت کی طرف سے باقاعدہ ممنوع قرار نہ دے دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ "ممانعت" کا عدم "قدرت" کے مترادف نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی حکومت (جو) بے تعصبی اور سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر مسلمانوں کے شعائر دینی میں دخل اندازی نہ کرے۔ لیکن اگر مسلمانوں میں سیاسی قوت نہیں ہے

تو پھر ان شعائر پر عمل در آمد " مرحمت خسروانہ " ہے " ہمت مرداں " نہیں۔ اس نقطہ نظر سے ہندوستان دار الحرب نہیں تھا۔ کیوں کہ انگریزوں کی بے تعصبی یا ان کی اپنی سیاسی مصلحتوں کے باعث مسلمان اپنے روز مرہ کے فرائض ادا کرنے میں بالکل آزاد تھے۔ اس لئے فریضہ ہجرت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر دار الحرب کی ہمیشہ یہی تعریف کی جاتی تو پھر اسی زمانہ میں سودی لین دین یا اسی قسم کے دوسرے مسائل معاشیات پر بھی نظر ثانی کرنی پڑتی کیونکہ جب ہندوستان دار الحرب تھا ہی نہیں، تو پھر سودی لین دین کا جواز کہاں سے پیدا ہوتا۔ غالباً اسی دشواری کو دور کرنے لئے شاہ صاحب نے جہاں پر انگریزوں کی دی ہوئی زمینوں اور دوسرے عطیات کو قبول کرنے کی بحث کی ہے وہاں پر آپ نے " سیاسی قوت " کی شرط کو نظر انداز کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر کسی ملک میں مسلمان اپنی سیاسی قوت کی بناء پر نہیں بلکہ حکومت کی بے تعصبی کی وجہ سے شعائر دینی ادا کرتے ہوں تو ایسے ملک کو دار الحرب کہا جائے گا۔ اور وہاں غیر مسلموں سے سودی لین دین جائز ہوگا۔ نیز غیر مسلم حکومت کی عطا کردہ زمینوں پر حق ملکیت باقی رکھنے کا حق بھی ہوگا۔ (۲۲)

رہ گئی جہاد کی بات تو مجموعہ فتاویٰ میں ہمیں اس موضوع پر کوئی سوال نہیں ملتا۔ نہ تو اس سلسلے میں کسی نے آپ سے فتویٰ طلب کیا، نہ کسی نے آپ پر اعتراض کیا کہ ہندوستان کو دار الحرب سمجھنے کے بعد آپ جہاد کیوں نہیں کرتے۔ ہاں ایک موقع پر قرآنی آیت " وجاھدوا فی سبیل اللہ " کی تشریح کرتے ہوئے شاہ صاحب نے جہاد کی جو تعریف کی ہے وہ بعینہ وہی ہے جسے ختم ۱۹ ویں صدی میں سرسید، امیر علی، اور چراغ علی وغیرہ نے اختیار کیا تھا۔ شاہ صاحب کے خیال میں " جہاد کی تین قسمیں ہیں۔ قسم اول جہاد زبانی ہے۔ اس جہاد کو وعظ و نصیحت ' ترغیب و ترہیب اور رفع شبہات مخالفین کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے۔ دوسرے نمبر پر وہ جہاد ہے جس میں مسلمان اس خیال سے جنگی تیاری کرتے ہیں کہ اگر حقیقتاً جنگ کا موقع آگیا تو پھر انہیں شکست نہ ہو۔ تیسرے نمبر پر وہ جہاد ہے جس میں باقاعدہ دست بدست جنگ

ہوتی ہے۔ جہاد کی ان تینوں قسموں پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "بلاشبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دو قسموں کے جہاد میں مشغول تھے۔ قسم سوم میں جو درحقیقت سب سے ادنیٰ جہاد ہے، آں حضرت نے شرکت نہیں کی۔" (۲۳)

مذکورہ بالا بحث کے بعد ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کم از کم شاہ صاحب یا ان کے ہم عصر مسلمان، دارالحرب کے مسئلہ کو اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے، جس نقطہ نظر سے ہم چاہتے ہیں کہ وہ دیکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی بدلتی ہوئی صورت حال نے اس وقت کے مسلمانوں کے سامنے چند اہم معاشی مسائل لا کھڑے کئے تھے۔ اور وہ ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے بے چین تھے۔ دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث میں ایک موقف تو وہ تھا جسے شاہ صاحب نے اختیار کیا۔ اور دوسرا موقف یہ ہو سکتا تھا کہ آپ ہر سوال کرنے والے کو یہ جواب دیتے کہ ہاں ہندوستان دارالحرب تو ہو گیا ہے لیکن تم سود کا جواز معلوم کرنے کے بجائے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ ہندوستان کو پھر سے دارالاسلام کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب یہ جواب دے سکتے تھے لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو درحقیقت ماہر قانون شریعت (مفتی) کے موقف سے ہٹ چکے ہوتے کیوں کہ قانون شریعت کے ماہر ہونے کے باعث اگر ایک طرف ان کا یہ فریضہ تھا کہ وہ شریعت کی حد میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کریں تو دوسری طرف تاریخ دین پر گہری نظر ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے جوابات سے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات بھی بٹھانی تھی کہ قانون شریعت جامد نہیں، بلکہ لچکدار اور زمان و مکان کا پابند ہے۔ اس لئے ان قوانین پر زمان و مکان کی تبدیلیوں کا اثر بھی ناگزیر ہے۔

حوالجات

۱۔ اس فرق کی ایک بہترین مثال ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے جاری کردہ فتاویٰ ہجرت میں نظر آتی ہے جسے انہوں نے کسی استفتا کے بغیر ۱۹۲۰ء میں دیا تھا۔ اس فتویٰ میں مولانا آزاد

نے مسلمانوں پر ہندوستان سے ہجرت ضروری قرار دی تھی۔ چوں کہ مولانا نے وہ فتویٰ کسی شخص کے سوال کے جواب میں نہیں دیا تھا۔ اس لئے ہم اس فتویٰ کے ظاہری یا معنوی معنی نکالنے میں آزاد ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہجرت کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا لیکن چوں کہ مولانا اس وقت کی سیاسی صورت حال کے پیشِ نظر ہندوستان سے ہجرت ضروری سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے ایمان داری کے ساتھ اپنی رائے عوام کے سامنے پیش کر دی تھی لیکن اگر یہی فتویٰ کسی شخص کے استفتا کے جواب میں ہوتا تو پھر یہ کہا جاتا کہ اس زمانے میں مولانا آزاد کے علاوہ بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ آیا ہندوستان سے ہجرت کر جانی چاہیے یا نہیں۔ (مولانا آزاد کے فتوائے ہجرت کے متن کے لئے ملاحظہ ہو" تبرکات آزاد"، مرتبہ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۹، صفحات ۲۰۳ مسلسل اس سے قبل یہ فتویٰ ہفت روزہ اہلِ حدیث امرت سر کی اشاعت ۳۰ جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔)

۲۔ ابتدائی ۱۴ ویں صدی ہجری (آخر ۱۹ ویں صدی عیسوی) میں مطبع مجتبائی دہلی کے مالک مولوی عبدالاحد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاہ صاحب کے جتنے بھی فتاویٰ دستیاب ہوسکیں۔ اُنہیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ انہوں نے تمام فتاویٰ کو جمع کرایا اور اپنے زمانہ کے مشہور علماء کی تصحیح کے بعد انہیں دو جلدوں میں اپنے ہی مطبع سے مجموعہ فتاویٰ عزیزی (فارسی) کے نام سے شائع کر دیا۔ پہلی جلد ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) اور دوسری جلد ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) میں شائع ہوئی ان دونوں جلدوں میں شاہ صاحب کی ہر وہ تحریر جو مرتبین کی نظروں میں "فتویٰ" معلوم ہوئی جمع کر دی گئی۔ مثلاً انہیں صفحات میں شاہ صاحب کے بیان کردہ بہت سارے تفسیری نکات اور چند ایک ایسے خطوط بھی ملتے ہیں، جو انہوں نے اپنے دوستوں، شاگردوں اور ہم عصروں کو کسی علمی مسئلے پر لکھے تھے دونوں جلدوں کے شروع میں ایک مجمل سی فہرست مضامین بھی ہے لیکن درحقیقت کتاب کی ترتیب میں کسی قسم کا بھی اصول پیشِ نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ اصل فارسی کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اور بازار میں دستیاب ہے۔

۳۔ "امان اول" سے وہ معاہدات مراد ہیں جو دارالاسلام اور اس کے مسلمان اور غیر مسلم شہریوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

۴۔ مضمون نگار نے اپنی سی پوری کوشش کی۔ لیکن اسے ان دونوں شخصیتوں کے حالات کہیں دستیاب نہ ہو سکے۔

۵۔ ملاحظہ ہو مجموعہ فتاویٰ عزیزی (آئندہ صرف فتاویٰ لکھا جائے گا) از شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (فارسی) جلد اول ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) صفحات ۱۷ اور ۱۸۔

۶۔ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۲

۷۔ فتاویٰ جلد ۱، ص ۲۸۔

۸۔ بظاہر سائل ظہر کی فرضیت کے بارے میں سوال کر رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے سوال کا پس منظر یہ ہے کہ جمعہ کی امامت اصلاً خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ خود امامت نہ کر سکے اور ظاہر ہے کہ وہ بیک وقت مختلف جگہوں پر امامت نہیں کر سکتا۔ تو پھر اس کا مقرر کردہ امام اس فرض کو ادا کرے گا۔ دارالحرب میں چونکہ خلیفہ عزل و نصب کا اختیار نہیں رکھتا اس لئے امام جامع مسجد بھی درحقیقت خلیفہ کی نیابت نہیں کرتا، اس دشواری کی وجہ سے اکثر فقہا کے نزدیک دارالحرب میں جمعہ کی نماز ادا نہیں کی جائے گی۔ بلکہ عام دنوں کی طرح ظہر کی نماز پڑھی جائے گی۔ اب اگر اس کے باوجود کسی دارالحرب میں مسلمان جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں، جو بظاہر ان پر فرض نہیں ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آیا وہ پھر سے ظہر کی نماز پڑھیں یا جمعہ ہی کی نماز کو کافی سمجھیں۔ اگر دیکھا جائے تو اس سوال میں بھی وہی حصول حق کی ذہنیت کام کر رہی ہے۔ ظہر کی نماز کے مقابلہ میں جمعہ کی نماز زیادہ اہتمام چاہتی ہے۔ ظہر کی جماعت اگر چھوٹ جائے تو آدمی اسے تنہا بھی پڑھ سکتا ہے۔ لیکن جمعہ کی جماعت اگر ایک مسجد میں نہ ملے تو دوسری کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ جمعہ کی نماز میں جماعت اور خطبہ چھوٹ جانے کے ڈر سے وقت سے بہت پہلے مسجد میں آکر بیٹھنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر جمعہ کی فرضیت ختم ہو جاتی ہے تو دکان اور کاروبار کو بند کر کے جامع مسجد میں آنے کی چھٹی

مل جاتی ہے۔ اور اپنے پڑوس کی مسجد یا گھر یا دکان ہی پر ظہر کا فریضہ ادا کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ فتاویٰ جلد ۱، صفحات ۳۳، ۳۴

۱۰۔ ” ص ۱۱۵

۱۱ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو گزشتہ حاشیہ نمبر ۳

۱۲۔ فتاویٰ جلد ۱، صفحات ۱۱۵، ۱۱۶ (مضمون نگار کا خیال ہے کہ اس سے قبل متن حاشیہ نمبر ۶ کی جس عبارت کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ کسی دوسری جگہ سے تعلق رکھتا ہے وہ ٹکڑا اس فتویٰ کا ایک حصہ ہے۔ اس سوال میں خاص طور سے انگریزی علاقوں کے بارے میں پوچھا گیا ہے اور شاہ صاحب نے ان علاقوں کو "امان اول" کے معدوم ہو جانے کے باعث دارالحرب قرار دیا ہے۔ اگر "اس شہر دہلی میں ..." والا ٹکڑا ہم اس جواب کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو یہ معلوم ہوگا کہ دہلی سے لے کر کلکتہ تک کے سیاسی حالات کا تجزیہ دراصل "امان اول" کی عدمیت کی تفصیل ہی ہے۔

۱۳۔ عموم بلویٰ اس مرگ انبوہ کو کہتے ہیں۔ جس سے ایک بہت بڑا گروہ مستقل طور سے دو چار رہتا ہو، مثلاً نماز پڑھنے کے لئے کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ شبہ ہو جائے کہ کپڑے پر نجاست لگ گئی ہے تو اسے صاف کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن ایسے لوگ جن کا کاروبار ہی اس قسم کا ہو کہ انہیں ہر وقت گوبر اور غلاظت سے واسطہ پڑتا ہو تو ان کے لئے یہ اجازت ہے کہ وہ جب تک اپنے کپڑوں پر نجاست نہ دیکھ لیں اس وقت تک اپنے کپڑوں کو صاف سمجھیں۔

۱۴۔ فتاویٰ جلد ۱، ص ۱۲۹

۱۵۔ ” ص ۱۱۶

۱۶۔ ” ص ۴۲ اس مثال سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ شاہ صاحب ایک حرام شے کو جانتے بوجھتے حلال ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اس قسم کی کوشش شاہ صاحب کے نزدیک صریحاً کفر ہے اور ایسا شخص جو محض اتباعِ نفس کی خاطر حلال کو حرام یا

حرام کو حلال سمجھتا ہو کافر ہے" (ملاحظہ ہو فتاوی جلد ۱، ص ۱۵۶) درحقیقت شاہ صاحب نے ہنڈی کے مسئلہ میں جو رائے دی ہے۔ وہ اس سماج کے طریقِ فکر کی عکاسی کر رہی ہے جہاں شریعت اور قانون میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ دائرہ قانون میں رہتے ہوئے قانونی شکنجوں سے چھٹکارہ پانے کی کوشش انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

۱۷۔ شاہ عبدالعزیز، مجموعہ رسائل خمسہ (مجموعہ فتاوی عزیزی جلد اول کے ساتھ مطبوعہ) صفحہ ۱۸۵۔

۱۸۔ فتاوی جلد ۱، صفحات ۱۱۴، ۱۹۵، ۱۹۶، جلد ۲ ص ۱۱۹

۱۹۔ فتاوی جلد ۱، ص ۹۱۔

۲۰۔ ایضاً جلد ۱، صفحات ۱۶۲، ۱۶۳

۲۱۔ ایضاً جلد ۱ ص ۵۲

۲۲۔ ایضاً جلد ۱ ص ۱۶۳

۲۳۔ فتاوی جلد دوم ص ۸۸

سٹہ بازی اسٹاک ایکسچنج پر خرید و فروخت

مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

چند وہ صورتیں جن میں قمار اور احتمالِ سود کی خرابیاں پائی جاتی ہیں

(۱) دو معاملہ کرنے والے (بغیر حقیقت معلوم کئے) ایک دوسرے کے جس کپڑے یا سامان کو چھو دیتے اس کی بیع ہو جاتی تھی اس کو "ملامسہ" کہتے ہیں،

(۲) دو معاملہ کرنے والے ایک دوسرے کی جانب جس کپڑے یا سامان کو پھینک دیتے اس کی بیع ہو جاتی تھی اس کو "منابذہ" کہتے ہیں۔

بعض لوگوں کے نزدیک "ملامسہ" میں خریدار جس کپڑے یا سامان کو چھو دیتا اس کی بیع ہو جاتی اور "منابذہ" میں بیچنے والا جس کپڑے یا سامان کو خریدنے والے کی جانب پھینک دیتا اس کی بیع ہو جاتی۔[۱]

(۳) خریدار بیچنے والے کے جس کپڑے یا سامان پر کنکری رکھ دیتا اس کی بیع ہو جاتی تھی اس کو "بیع الحصاۃ" یا القاء الحجر کہتے ہیں۔

(۴) درخت پر لگے ہوئے تر پھلوں کو اندازہ سے ٹوٹے ہوئے خشک پھلوں کے عوض بیچا جاتا تھا اس کو "مزابنہ" کہتے ہیں۔

(۵) کھڑی کھیتی (فصل) کو اندازہ سے کٹے ہوئے غلّہ کے عوض فروخت کیا جاتا تھا اس کو "محاقلہ" کہتے ہیں۔

---

[۱] ہدایہ ج ۳ باب البیوع الفاسدہ

ان صورتوں میں چونکہ قمار (جوا) اور سود کا احتمال پایا جاتا ہے اس بناء پر ان سے منع کیا گیا ہے یعنی پہلی تین صورتوں میں ایک فریق نفع کی خاطر غیر ضروری خطرات مول لیتا ہے اور بقیہ دو میں ایک جنس کا اندازہ اسی جنس سے کمی بیشی کا احتمال پیدا کرتا ہے بالخصوص جبکہ تر کا اندازہ خشک کے ساتھ اور درخت پر لگے ہوئے کا اندازہ کٹے ہوئے کے ساتھ کیا جائے۔

ان صورتوں کی ممانعت سے متعلق حدیثیں چنانچہ ان صورتوں کی ممانعت کے بارے میں حدیثیں یہ ہیں،

نھی عن الملامسة والمنابذة فی البیع[1] — رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیع میں "ملامسہ" اور "منابذہ" سے منع فرمایا۔

نھی عن بیع الحصاة[2] — رسول اللہ نے کنکری پھینکنے کی بیع سے منع فرمایا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن المزابنة والمحاقلة[3] — بیشک رسول اللہ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع فرمایا ہے۔

چند وہ صورتیں جن میں ضرر، دھوکہ جہالت وغیرہ کی خرابیاں پائی جاتی ہیں

(۱) باغ کے پھل اور کھیت کی فصل کو تیار ہونے اور پکنے سے پہلے بیچ دیا جاتا تھا۔

(۲) خریدی ہوئی چیز کو قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کیا جاتا تھا

(۳) بیع کے ایک معاملہ میں دو معاملہ کئے جاتے تھے چنانچہ بیچنے والا کہتا کہ میں نے اس چیز کو نقد دس روپیہ میں بیچا اور ادھار بیس روپیہ کے عوض فروخت کیا یا میں نے اپنا باغ ایک ہزار میں اس شرط پر فروخت کیا کہ تم اپنا مکان سو روپیہ کے عوض فروخت کرو۔

(۴) بیع کے درمیان ایسی شرطوں کا اضافہ کیا جاتا جن کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا مثلاً خریدار کہتا کہ میں کپڑا اس شرط پر خریدتا ہوں کہ تم (بیچنے والا) اس کو کتا دو یا کاٹ کر سلا دو۔

ان صورتوں میں چونکہ ایک فریق کو نقصان کا اندیشہ دھوکہ دہی قیمت میں جہالت اور

---

[1] بخاری کتاب البیوع۔ [2] مسلم ابواب البیوع [3] بخاری باب بیع المزابنة

ایسی شرطوں کا اضافہ پایا جاتا ہے جن کا معاملہ بیع سے کوئی تعلق نہیں ہے اس بناء پر ان سے منع کیا گیا ہے۔

ان صورتوں کی ممانعت سے متعلق حدیثیں چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لاضرر ولاضرار فی الاسلام[1]۔	اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔
نہیٰ عن بیع النخل حتیٰ یزھو وعن بیع السنبل حتیٰ یبیض ویأمن العاھۃ۔	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی بیع سے منع فرمایا یہاں تک کہ وہ پک جائے اور بالی کی بیع سے منع فرمایا یہاں تک کہ وہ سفید ہو جائے اور آفت کا خطرہ نہ رہے۔

بیع ہونے کے بعد پھل اور فصل برباد ہونے کی صورت میں حضرت عمر بن عبد العزیز سے خریدار کو نقصان کا معاوضہ دلانا بھی ثابت ہے[2]۔

دوسری صورت کے بارے میں فرمایا:۔

من ابتاع طعاماً فلا یبیعہ حتی یستوفیہ[3]۔	جس شخص نے غلہ خریدا وہ اس وقت تک نہ بیچے جب تک اس پر قبضہ نہ کرے۔

قبضہ عملاً یا گاہونا دونوں میں سے کوئی سا کافی ہے۔

تیسری صورت کے بارے میں ہے۔

نہیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی صفقۃ واحدۃ[4]۔	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک معاملہ میں دو بیع سے منع فرمایا۔

چوتھی صورت کے بارے میں ہے۔

---

[1] مسلم ابواب البیوع [2] موطا امام مالک کتاب البیوع

[3] بخاری و مسلم [4] شرح السنہ۔

ولا شرطان فی بیع[1] بیع میں دو شرط حلال نہیں ہے۔

ایک شرط کا بھی یہی حال ہے دو کی قید واقعی ہے احترازی نہیں ہے[2]

چند وہ صورتیں جن میں جہالت منازعت اور ناجائز استحصال وغیرہ کی خرابیاں پائی جاتی ہیں

(۱) ادھار کی بیع ادھار کے بدلہ کی جاتی تھی یعنی ایک شخص کوئی چیز ادھار خریدتا اور مدت معینہ پر وہ قیمت نہ ادا کر سکتا تو دوبارہ اسی چیز کو ادھار خرید لیتا تھا اس کو "بیع الکالی بالکالی" یا بیع النسیہ بالنسیہ کہتے ہیں اس صورت میں دونوں طرف صرف باتیں ہی باتیں ہوتی تھیں، بیع و ثمن دونوں نہ ہوتے تھے

(۲) جو چیز پاس موجود نہ ہوتی اس کی بیع ہوتی تھی پھر وہ چیز بازار سے خرید کر خریدنے والے کے حوالہ کی جاتی تھی۔

(۳) ایک شخص کوئی چیز خریدتا اور بیچنے والے کو کچھ رقم اس شرط پر ادا کرتا کہ اگر بیع مکمل ہو گئی تو یہ رقم قیمت میں شمار ہو گی اور اگر مکمل نہ ہوئی تو یہ رقم بیچنے والے کی ہو جائے گی اس کو "بیع عربان" کہتے ہیں۔

(۴) جو چیز اپنے قبضہ اور ضمان میں نہ آتی اس پر نفع لیا جاتا تھا جیسے قبضہ سے پہلے مبیع پر نفع حاصل کیا جاتا تھا۔

ان صورتوں کی ممانعت سے متعلق حدیثیں

ان صورتوں میں چونکہ جہالت منازعت اور ناجائز استحصال وغیرہ قسم کی خرابیاں پائی جاتی ہیں اس بناء پر ان سے منع کیا گیا ہے چنانچہ ممانعت سے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یہ ہیں۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکالی بالکالی[3] — رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ادھار کے بدلہ ادھار کی بیع سے منع فرمایا۔

دوسری صورت کے بارے میں ہے۔

نھانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ میں وہ چیز

---

[1] ترمذی و ابوداؤد [2] حاشیہ مشکوۃ باب المنہی عنہا من البیوع [3] دارقطنی از مشکوۃ

ان ابیع ما لیس عندی[1] — بیچوں جو میرے پاس نہ ہو۔

ابوداؤد و نسائی کی روایت میں ہے۔

قال قلت یا رسول اللہ یاتینی الرجل فیرید منی البیع و لیس عندی فابتاع لہ من السوق قال لا تبع ما لیس عندک[2]

حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ میرے پاس ایک شخص آتا ہے اور وہ مجھ سے بیع کرنا چاہتا ہے حالانکہ میرے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن بیع کے بعد میں اس کے لیے بازار سے خرید لاتا ہوں آپ نے فرمایا جو چیز تمہارے پاس نہ ہو اس کی بیع مت کرو۔

تیسری صورت کے بارے میں ہے۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع العربان[3]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیع عربان سے منع فرمایا۔

چوتھی صورت کے بارے میں ہے۔

ولا ربح ما لم یضمن[4]

اس چیز کا نفع حلال نہیں جو ضمان میں نہ ہو۔

یکجائی طور پر مذکورہ صورتوں کی ممانعت کے وجوہ

مبادلہ کی مذکورہ شکلوں کو جن وجوہات کی بنا پر منع کیا گیا ہے یکجائی طور پر ان کی فہرست یہ ہے۔

خود غرضی۔ اجتماعی مفاد کی قربانی۔ اجارہ داری۔ ذخیرہ اندوزی۔ فریب دہی اخلاقی اصول کی پامالی۔ طلب و رسد کے قدرتی تناسب میں خلل اندازی۔ مستقبل کی سودا بازی۔ جہالت۔ منازعت۔ ناجائز استحصال۔ احتمال سود۔ باہمی تعاون کا فقدان اور غلط تشہیر و پروپیگنڈا۔

یہ وجوہ قدیم و جدید جن شکلوں میں پائے جائیں گے ان کی ممانعت ہوگی

یہ وجوہات مبادلہ کی قدیم و جدید جن شکلوں میں پائے جائیں گے اسلام میں ان کی ممانعت ہوگی اگرچہ ان میں کچھ مادی فائدہ

---

[1] ترمذی [2] ابوداؤد و نسائی [3] ابوداؤد و ابن ماجہ [4] ترمذی و نسائی۔

بھی ہو۔ جیسا کہ قرآن حکیم کی درج ذیل آیت میں نفع کے بالمقابل ضرر کے بجائے لفظ "اثم" کے استعمال سے واضح ہوتا ہے۔

یسئلونك عن الخمر و المیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما۔[1]	وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑھ کر ہے۔

کلام عرب میں لفظ "اثم" کا استعمال اخلاقی و روحانی مفاسد کے لیے ہوتا ہے جبکہ "ضرر" مادی وجسمانی مضرات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

عرب جاہلیت میں شراب و جوا بھی نیکی و خدمت خلق کا ذریعہ تھے	عرب جاہلیت میں شراب و جوا خالص عیاشی و مال کی بربادی کا ذریعہ نہ تھے بلکہ ان سے کچھ فوائد بھی حاصل کیے جاتے تھے مثلاً شراب

سے جنگ میں مدد لی جاتی اور جوئے کی آمدنی سے غریبوں کی مدد کی جاتی تھی۔

یا عرب کے دولتمند قحط کے زمانہ میں خاص تقریب کے تحت ایک جگہ اکٹھے ہوتے اور شراب کی مستی میں جس کسی کے اونٹ و اونٹنی کو چاہتے ذبح کر دیتے پھر ان کے مالک کو منہ مانگے دام دے کر گوشت پر جوا کھیلتے تھے اور جوئے میں ہر شخص جتنا گوشت جیتا وہ غریبوں اور فقیروں میں بانٹا جاتا تھا اس تقریب میں شریک ہونے والے دولتمندوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کے لیے ایک خاص لفظ "برم" استعمال ہوتا تھا جس کے معنی بخیل کے ہیں۔[2]

چنانچہ "لسان العرب" میں ہے

کانوا اذا قامروا فقمروا اطعموا منہ وتصدقوا فالاطعام والصدقة	جب جوا کھیلتے اور اس میں جیتتے تو کچھ اس سے لوگوں کو کھلا دیتے اور کچھ صدقہ کر دیتے یہ کھلانا

---

[1] سورہ بقرہ رکوع ۲۷ ۔ [2] تدبر قرآن صفحہ ۔

منفعۃ والاثم القمار[1] ۔ اور صدقہ کرنا نفع ہے اور اثم (گناہ) جوا ہے۔

غرض اس طریقہ سے عرب جاہلیت میں شراب اور جوا بھی نیکی وخدمت خلق کا ذریعہ بن گئے تھے جس کی بنا پر انفاق وجہاد کے ساتھ شراب وجوا کے متعلق سوال کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ آج کل لاٹری فلم شو اور رقص وسرود وغیرہ کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے مثلاً لاٹری اس لیے ڈالی جائے کہ اس کی آمدنی مصیبت زدہ ومفلوک الحال لوگوں کے کام آجائے گی فلم اس لیے دکھائی جائے کہ اس کی آمدنی فلاں نیک کام وخدمت خلق میں صرف کی جائے گی اور رقص وسرود کی محفلیں اس لیے منعقد ہوں کہ اس کی آمدنی سے یتیم ومسکین کی کفالت کی جائے گی وغیرہ۔

نیکی وخدمت خلق کا ذریعہ بننے سے نہ حرام چیز حلال بنتی ہے اور نہ ناجائز فعل جائز ہوتا ہے

قرآن حکیم کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اصولی طور پر جواز عدم جواز یا حلال وحرام کے لیے مادی وجسمانی فوائد ونقصان کو مدار نہیں بنایا گیا بلکہ اخلاقی وروحانی فوائد ونقصان کو مدار بنایا گیا ہے۔

جس کی بنا پر نیکی وخدمت خلق کا ذریعہ بننے اور مادی وجسمانی فائدہ متعلق ہونے سے نہ حرام چیز حلال بنتی ہے اور نہ ناجائز فعل جواز میں تبدیل ہوتا ہے اگر اسی طرح قلب جاہلیت ہوتی رہی تو پھر کسی شئی کے حرام اور کسی فعل کے ناجائز ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ ہر جائز وحرام میں کچھ نہ کچھ فائدہ ہوتا اور کسی نہ کسی طرح اس کو نیکی وخدمت خلق کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

معاملات ومبادلات میں اسلام کا درجہ نہایت بلند ہے

مذکورہ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ معاملات ومبادلات میں اسلام نے اخلاقی حدود وایک دوسرے کے حقوق کا کس قدر لحاظ کیا ہے؟ نیز حلال وحرام اور جواز وعدم جواز کے فیصلہ میں اس کا معیار کس درجہ بلند ہے؟

سٹہ بازی ناجائز ہے

ان تفصیلات کی روشنی میں سوال نامہ کا جواب درج ذیل ہے۔

(۱) سٹہ بازی ان وجوہات کی بنا پر ناجائز ہے۔

---

[1] لسان العرب لغۃ قمار

(ا) یہ ادھار کی بیع ادھار کے بدلے ہے

(ب) اس چیز کی بیع ہے جس پر عملاً یا قانوناً اب تک قبضہ نہیں ہے۔

(ج) اس پر نفع لیتا ہے جو اپنے ضمان میں نہیں ہے۔

(د) فصل آنے سے پہلے محض تخمین و اندازہ کی سودا بازی ہے۔

(ر) ایک فریق اس میں غیر معمولی خطرات مول لیتا ہے۔

(س) اس میں اجارہ داری۔ ذخیرہ اندوزی اور ناجائز استحصال کی ذہنیت پائی جاتی ہے

(ص) وہ تمام اخلاقی خرابیاں پائی جاتی ہیں جو ماہرین معاشیات کی آراء میں گزر چکی ہیں

(ط) یہ بڑی حد تک مالیاتی بحران کا باعث ہوتا ہے جس کا بالواسطہ اثر اخلاق پر پڑتا ہے۔

سوالنامہ میں بحران کی اصل علت سٹہ بازی کو قرار دیا گیا ہے لیکن یہ "بڑی حد تک" ہے تمام تر نہیں ہے کیونکہ اس کے علاوہ بحران کے اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔

اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت ناجائز ہے | (۲) اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت ان وجوہات کی بناء پر ناجائز ہے۔

(ا) کمپنی کے ڈائرکٹر، منیجر حصہ داروں کے امین اور ان کے مفاد کے محافظ ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ بھی دھوکہ دے کر حصہ داروں سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

(ب) کمپنی کی اندرونی حالت سے جن کو زیادہ واقفیت ہوتی ہے وہ فرضی طور پر خرید کر کے یا احتکار و تخمین کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں جس سے دوسرے حصہ داروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

(ج) حصص کی منتقلی میں چونکہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد شریک ہوتی ہے اس بناء پر حق تلفی دھوکہ دہی اور ناجائز استحصال وغیرہ کو کاروباری حلقہ میں برا نہیں سمجھا جاتا۔

(د) حصص کی انتقال پذیری کی توقع بالواسطہ مستقبل کے تخمینی کاروبار کو فروغ دینی اور ملک کے مرافوں کو جنم دیتی ہے جن کے اثرات نہایت دور رس اور ہمہ گیر ہوتے ہیں۔

(ر) حصص پر نفع کی مذکورہ تقسیم بعض صورتوں میں جہالت پیدا کرتی اور بعض میں حق تلفی کا باعث بنتی ہے جیسا کہ "ترجیحی" کی بعض شکلوں میں ہوتا ہے۔

(س) بار بار حصص کی منتقلی سے اخلاقی حس کو ٹھیس پہونچتی اور اجتماعی مفاد مجروح ہوتا ہے۔

(ص) تمسکات کے مالک صرف نفع میں شریک ہوتے، یعنی سود کے مستحق ہوتے ہیں نقصان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(ط) تمسکات کی خرید و فروخت کرنے والے ہر وقت ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کی کوشش میں رہتے اور اس کی قمار بازی میں بہت کچھ غیر پیداواری محنت صرف کرتے ہیں جس کو ماہرین معاشیات نے چوری کرنے اور بھیک مانگنے والوں کی محنت سے تشبیہ دی ہے۔

(ع) یہ کاروبار چند چالاک و چالباز قسم کے دلالوں میں محدود ہو گیا ہے جو کمیشن حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی غلط شہرت و جائز و ناجائز سے دریغ نہیں کرتے ہیں

اسٹاک ایکسچینج کی مذکورہ چار صورتوں کو نہ سٹہ بازی سے علیحدہ کیا جا سکتا اور نہ بعض صورتوں میں خرابی کی کمی بیشی کے سبب اس سسٹم کے جواز کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے

مزید وضاحت کے لیے چاروں کی تفصیل یہ ہے۔	سوالنامہ میں مذکورہ چاروں صورتیں ناجائز ہیں

پہلی و دوسری صورت میں حصص کی منتقلی و اخلاقیات کے مجروح ہونے کی عام خرابیاں پائی جاتی ہیں۔

تیسری صورت میں ایک خاص قسم کی جہالت بھی پائی جاتی ہے وہ یہ کہ مطلوبہ قسط کی ادائیگی اور فروخت سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاہدہ کی تکمیل ہو گئی اور واپسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاہدہ کی تکمیل نہیں ہوئی۔ پھر یہ پتہ نہیں چلتا کہ معاہدہ کی تکمیل کے لیے صرف درخواست اور مطلوبہ قسط کی ادائیگی کافی ہے یا اس کے بعد میٹنگ اور فیصلہ بھی ضروری ہے اگر درخواست اور مطلوبہ قسط کی ادائیگی سے معاہدہ کی تکمیل ہو گئی ہے تو اس کا توڑنا محض اضافہ قیمت میں کمی کی وجہ سے ناجائز ہے اور اگر معاہدہ کی تکمیل نہیں ہوئی ہے تو قیمت چڑھتے ہی فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

اسی طرح تکمیل معاہدہ کے بغیر مطلوبہ قسط پر نفع کمانا جائز نہیں ہے اور تکمیل معاہدہ کے

بعد قسط کی واپسی درست نہیں ہے (غالباً سوالنامہ میں خاص صورتوں کا لحاظ کیا گیا ہے ورنہ تمام صورتوں میں قسط کی واپسی نہیں ہوتی ہے)

چوتھی صورت میں زید اکثر ڈائرکٹر، منیجر یا اور کوئی ماہر شخص ہوتا ہے جو کاروبار کی اندرونی حالت سے واقفیت کی بناء پر اپنے دلال سے خرید نے کے لیے کہتا ہے اگر ایسی بات ہے تو بدنیتی یا دوسروں کی حق تلفی لازم آتی ہے۔

پھر اس صورت میں دلال کی حیثیت اور اس کے اختیارات واضح نہیں ہیں جس سے جہالت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ زید نے دلال سے قرض کی ادائیگی کو مزید ۱۵ یوم تک ملتوی کرنے کے لیے کہا تھا جبکہ اس نے "بنک" سے سودی قرض لے کر ادائیگی کردی اگر دلال کے اس تصرف کو جائز تسلیم کیا جائے تو ایک معاملہ میں دو معاملہ کرنا لازم آجائے گا جیسا کہ بعد کی ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے۔

اور اگر اس تصرف کو ناجائز تسلیم کیا جائے تو فروخت کی صورت میں ایک ایسی شی پر نفع کمانا، لازم آئے گا جو اپنے قبضہ اور ضمان میں نہیں ہے "سود" کا معاملہ ان سب کے ماسوا ہے

غرض چند در چند پیچیدگیوں اور خرابیوں کی وجہ سے خرید و فروخت کی مذکورہ شکلوں کی اسلامی معاملات و مبادلات میں گنجائش نہیں ہے۔

ناجائز ہوتے ہیں اخلاقی و روحانی نقصان کو مدار بنایا گیا ہے	شراب اور جوئے کی طرح سٹہ بازی اور حصص کی خرید و فروخت میں بھی کچھ فوائد بیان کئے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اسلام میں گنجائش

نکالنے کی کوشش ہوتی ہے مثلاً:۔

(۱) ماہر سٹہ بازوں کی موجودگی سے مارکیٹ میں مقابلہ کی صورت قائم رہتی ہے جس سے ہوشیار خریدار (مارکیٹ کا بھاؤ کم رکھ کر اور کم قیمت پہ مال خرید کر) ناواقف بیچنے والوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

(۲) سٹہ بازی سے قیمتوں کے تعین میں مدد ملتی ہے کیونکہ حاضر بازار کی قیمتیں وعدہ بازار کی قیمتوں سے متاثر ہوتی ہے۔

(۳) سٹہ باز قومی خدمت انجام دیتے ہیں کیونکہ وہ صحیح طور پر بازار کا اندازہ لگاتے اور بھاؤ کے اتار چڑھاؤ میں تناسب قائم رکھتے ہیں وغیرہ

لیکن یہ فوائد مادی وجسمانی ہیں جبکہ جواز و عدم جواز کے بارے میں اخلاقی و روحانی فوائد و نقصان کو مدار بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا۔

مادی فوائد کے مقابلہ میں مادی نقصان کا پلہ بھی بھاری ہے

پھر اسلام میں گنجائش کے لیے جن مادی فوائد کا ذکر کیا جاتا ہے ان کے مقابلہ میں مادی نقصانات کم درجہ کے نہیں ہیں مثلاً،

(۱) سٹہ بازی کی وجہ سے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ کے نقصانات ہر وقت کارفرما رہتے ہیں اور ایک رجحان کو غالب کرنے کے لیے ہر قسم کے صحیح و غلط طریقے استعمال کرنے ناگزیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ بھاؤ کا اتار چڑھاؤ کرنے والے بڑے بڑے گروہ بنائے جاتے ہیں تھوڑے سرمایہ سے زیادہ فائدہ کی امید دلا کر نئے لوگوں کو اپنے گروہ میں شامل کیا جاتا ہے اور طرح طرح کی غلط افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔

(۲) وعدہ بازار کی قیمتیں دلالوں کی خدمت کے معاوضہ اور سٹہ بازوں کے منافع سے متاثر ہو کر متعین ہوتی ہیں اس لیے یا تو مال پیدا کرنے والوں کا نقصان ہوتا ہے کہ ان کو اس قیمت سے کم قیمت ملتی ہے جو سٹہ بازوں اور دلالوں کی غیر موجودگی میں ملتی۔

یا مال کھپت کرنے والوں کو نقصان ہوتا ہے کہ ان کو اس قیمت سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے جو وہ سٹہ بازوں اور دلالوں کی غیر موجودگی میں ادا کرتے۔

(۳) قومی خدمت کی بات اس بناء پر کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ سٹہ باز صحیح و غلط دونوں قسم کے اندازے لگاتے ہیں۔ غلط اندازہ کی صورت میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا مسئلہ نہایت سنگین بن جاتا اور حصص خریدنے والوں کو کافی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے یہ نقصانات مارکیٹ کے لیے اس قدر پریشان کن ثابت ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے بسا اوقات اسٹاک ایکسچینج کی راہ سے سٹہ بازی کو ختم کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں مثلاً ۱۹۲۶ء اور اس سے کچھ پہلے کے

انگلستان میں حصص کی خریداری کے لیے پوری قیمت کی نقد ادائیگی لازمی کر دی گئی تھی جبکہ پہلے اپنے دلال کو قیمت کا کچھ حصہ دے کر خریداری کی جا سکتی تھی۔ اسی طرح ۱۹۶۹ء کے ہندوستان میں داسٹاک ایکسچنجوں میں) وعدہ کی سوداکاری پر پابندی لگا کر بحران دور کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وغیرہ۔

اسلامی حکومت میں دو متبادل انتظام ہیں | (۳) اسلامی حکومت میں حصص کی خرید و فروخت کے دو متبادل انتظام ہیں۔

(الف) وہ جس میں مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں باقی رہتی ہیں۔

(ب) وہ جس میں یہ کمپنیاں بڑے کاروبار کے لیے ختم کر دی جاتی ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک کے لیے متبادل انتظام | (۱) جس انتظام میں مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں باقی رہتی ہیں وہ ترقی یافتہ ممالک کے لیے ہے جنھوں نے انفرادی ملکیت کے باوجود خود کفیل ہو کر اپنے معاشی مسائل بڑی حد تک حل کر لیے ہیں جیسے امریکہ و برطانیہ وغیرہ۔

اس میں پیچیدگیوں اور خرابیوں کے دور کرنے کے بعد حصص کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چنانچہ جن راستوں سے پیچیدگیاں و خرابیاں داخل ہوتی ہیں یہ ہیں۔

(۱) کمپنی کے نظام کا واسطہ در واسطہ ہونا

(۲) بار بار حصص کی منتقلی

(۳) حصص کی تقسیم میں جہالت

(۴) تمسکات کا اجراء

(۵) دلالوں کا پیشہ در درمیانی طبقہ

ان راستوں کے بند کرنے کی تدبیریں یہ ہیں۔

(۱) واسطوں کو کم کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ شرکت و مضاربت کی بنیادوں پر مشترکہ کمپنیوں کے لیے قواعد و ضوابط مقرر کیے جائیں جس میں کسی ایک مسلک کی پیروی ضروری نہیں

ہے۔ بلکہ ہر فقہی مسلک اور اصول دکلیات سے استفادہ کی گنجائش ہے نیز اجتہاد کے ذریعہ نئے قوانین وضع کرنے کی اجازت ہے[1]

(۲) حصص کی منتقلی کا نظم ختم کیا جائے کہ اس کے بغیر دوسروں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ظلم وزیادتی سے نجات ملنی مشکل ہے۔

یہ منتقلی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے لوازم میں سے نہیں ہے کہ اس کے بغیر وہ تشکیل نہ پاسکیں یا ان کا چلنا ناممکن ہو جائے، بلکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کمپنی کے حصہ دار اپنے کو مستقل طور پر کمپنی سے وابستہ کریں خواہ انہیں فائدہ ہو یا نقصان جیسا کہ شرکت میں ہوتا ہے[2]

(۳) تقسیم کی جہالت دور کی جائے اس طرح کہ بڑے حصوں کو محدود سے محدود تر کر دیا جائے اور مختلف قسم کے حصے بند کر کے زیادہ مقدار میں ایک قسم کے چھوٹے حصے جاری کئے جائیں تاکہ عوام کو زیادہ فائدہ پہونچ سکے۔

(۴) تمسکات کا اجرار بند کر دیا جائے کہ اس کے بغیر ادھار اور سود کا سلسلہ نہ ختم ہو سکے گا۔ اس کے بجائے کاروباری اغراض کے لیے حکومت سرکاری خزانہ سے لوگوں کو قرض دے تاکہ وہ کمپنی کے کاروبار میں شرکت کر کے حصے خرید سکیں حکومت مقررہ قواعد وضوابط کے مطابق اسی قرض کے نفع ونقصان دونوں میں کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کر کے شریک ہو سکتی ہے۔

(۵) دلالوں کا پیشہ ور درمیانی طبقہ ختم کیا جائے اگر کاروبار چلانے کے لیے کچھ مشیر کاروں کی ضرورت ہو تو ان کو قانونی واخلاقی ضابطوں کا زیادہ سے زیادہ پابند بنایا جائے۔

ان اصلاحات کے نافذ کرنے میں ابتداءً دشواری ہوگی لیکن رفتہ رفتہ دشواری پر قابو پاکر معاشرتی زندگی کا نقشہ بدلا جا سکتا ہے جیسا کہ ہر اصلاحی وانقلابی تحریک میں ابتدا دشوار ہوتی ہے لیکن بعد میں راہیں ہموار ہو جاتی ہیں۔

---

[1] شرکت ومضاربت کے شرعی اصول کے نام سے اردو میں محترم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی کتاب شائع ہو گئی ہے اس سے بھی استفادہ مفید رہے گا۔ [2] اصول معاشیات ج ۲ صفحہ ۱۱۰۔

غیر ترقی یافتہ ممالک کے لیے تبادلی انتظام

(۲) جس انتظام میں مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں بڑے کاروبار کے لیے ختم کردی جاتی ہیں وہ غیر ترقی یافتہ ممالک کے لیے ہے جن میں اب تک نہ معاشی مسائل حل ہوئے ہیں اور نہ وہ اپنی ضرورت پوری کرنے میں خودکفیل ہوئے ہیں۔

اس میں کمپنیوں کے ختم ہونے کے بعد اگرچہ اونچے پیمانے پر حصص کی خرید و فروخت کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے لیکن چھوٹے کاروبار کے لیے کمپنیوں کے ساتھ حصص کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اسلامی حکومت میں مسئلہ ملکیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے

بدقسمتی سے ذرائع پیداوار کی تنظیم میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ ملکیت کو دیدی گئی ہے جس کے غلط تصور نے ہمیشہ انسانیت سوز نتائج پیدا کئے ہیں اور آج بھی اس کی وجہ سے بہت سے ممالک میں ایک طرف بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے دولت و سامان عیش کی ناقابل تصور فراوانی ہے تو دوسری طرف محنت و مشقت کے باوجود ذلت و نکبت کی موت ہے۔

یا ایک طرف یہ کہ ذرائع پیداوار پر چند افراد کا قبضہ ہے تو دوسری طرف ملک اس قدر محتاج ہے کہ معمولی معمولی چیزیں بھی اس میں نہیں تیار ہوتیں بلکہ باہر سے درآمد ہوتی ہیں

ایسی حالت میں کم از کم "اسلام" سے تو اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مقصد (معاشی بدحالی دور کر کے خودکفیل ہونا) کو نظر انداز کر کے ملکیت کی بحثوں میں الجھے گا یا اپنے انتظام کو کسی ایک تنظیم (انفرادی یا اجتماعی) میں محدود کر کے "تنگی" پیدا کرے گا[1]

مقصد کے پیش نظر ذرائع پیداوار تین حصوں میں تقسیم ہوں گے

چنانچہ مقصد کے پیش نظر اسلامی حکومت میں انفرادی و اجتماعی ملکیت دونوں کی اجازت ہوگی[2] اور سر دست حالات کے لحاظ

---

[1] جیسا کہ ہندوستان میں اس تنگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی ۱۹۰ بڑی بڑی کمپنیوں پر صرف دس خاندان کا قبضہ ہے۔ [2] اسلام میں وسعت اور انفرادی و اجتماعی دونوں کی اجازت کے لیے راقم کی کتاب "احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت" کا مطالعہ مفید رہے گا جو ادارہ نشریات اسلام چوک انارکلی لاہور پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔

سے ذرائع پیداوار درج ذیل حصّوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔

(۱) وہ جن پر اجتماعی ملکیت ہوگی یعنی حکومت براہ راست انتظام کرے گی۔

(۲) وہ جن پر بتدریج اجتماعی ملکیت ہوگی

(۳) وہ جن پر انفرادی ملکیت ہوگی۔

ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلے حصہ کی تفصیل | (۱) پہلے حصہ میں تا فرو کردہ بنیادی صنعتیں اور مثلاً درج ذیل چیزیں شامل ہوں گی۔

(الف) فولاد و لوہا: اس میں کان، مشینی اوزار اور ڈھالنے کے لیے بڑی بڑی مشینیں سب شامل ہونگی

(ب) اسلحہ جات: اس میں دفاع سے متعلق صنعتیں شامل ہیں۔

(ج) برقی پلانٹ: اس میں بجلی پیدا کرنے کی طاقت اور اس سے متعلقہ صنعتیں شامل ہیں۔

(د) اٹامک انرجی: (ایٹمی طاقت)۔

(ر) کوئلہ کی کان، تارکول، پٹرول اور گیس کی صنعت۔

(س) خام میگنیز

(ص) جواہرات: سونا چاندی۔ تانبا جستہ۔ سیسہ۔

(ط) ہوائی۔ بحری اور ریلوے ٹرانسپورٹ۔

(ع) ٹیلیفون ٹیلیگراف اور وائرلیس۔

(ف) کپڑوں کے مل۔ بڑے کارخانے اور ڈاکخانے۔

دوسرے حصہ کی تفصیل | (۲) دوسرے حصہ میں مثلاً یہ چیزیں شامل ہوں گی۔

(الف) المونیم اور ٹین کی صنعت۔

(ب) کوئلہ سے کاربن بنانے کی صنعت۔

(ج) چھوٹے اوزار کے لیے چھوٹی مشینیں

(د) رنگ سازی و پلاسٹک کی چیزیں۔

(ر) انگریزی دوائیں اور جراثیم کش دوائیں۔

(ز) روڈ ٹرانسپورٹ۔

(ص) سمنٹ کے کارخانے۔

(ط) کاغذ کے کارخانے۔

(ع) چائے کے باغات اور اس سے متعلقہ چیزیں

(ف) ان کے علاوہ اور جو چیزیں اس میں شامل ہونے کے لائق ہوں[1]

تنظیمی تبدیلی سے مراد قومیانا نہیں بلکہ اسلامیانا ہے

اسلامی حکومت میں انفرادی و اجتماعی بجتوں کے بجائے ملکیت کا صحیح تصور پیدا کیا جائے گا اور تعلیم و تربیت پر زیادہ زور دیا جائے گا۔

صحیح تصور یہ کہ ہر شئی کا حقیقی مالک اللہ ہے اور انسان بحیثیت امین" اس پر قابض ہے یعنی ذرائع پیداوار افراد کے سپرد ہوں یا جماعتوں کے ہوں ان سب کی حیثیت محض "امین" کی ہے جس کو مالک کے مقررہ قانون کے مطابق استعمال و انتفاع کا حق حاصل ہو اور اسی وقت تک یہ حق حاصل رہے گا جب تک وہ حصول مقصد (خلق خدا کی خوشحالی و فارغ البالی) میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں یا ایسی فضاء پیدا کرنے میں مددگار بنیں جو عام مخلوق کی خوشحالی و ترقی کی ضامن ہو۔

اسلام میں اسی حق استعمال و انتفاع کو حق ملکیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اراضی کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کہتے ہیں۔

وحق الملك فی الآدمی کونه احق بالانتفاع من غیرہ[2]

حق ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنے غیر کے مقابلہ میں زیادہ انتفاع کا حق حاصل ہو۔

تعلیم و تربیت کے ذریعہ اخلاقی فضا اور قانون و اخلاق میں باہمی ربط پیدا کیا جائے گا کہ

---

[1] اراضی کے بارے میں راقم کی کتاب "اسلام کا زرعی نظام" کا مطالعہ مفید رہے گا جو ندوۃ المصنفین دہلی انڈیا سے شائع ہوئی ہے۔

اس کے بغیر مذکور تنظیمی تبدیلیوں کو نہ "اسلامی" قرار دیا جا سکتا اور نہ ان سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اگر محض تنظیمی تبدیلی کے ذریعہ معاشی مسائل حل بھی ہو گئے تو اخلاقی اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے بہت سے نفسیاتی و سماجی مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے جن پر قابو پانا سخت مشکل ہوگا جیسا کہ بعض مسلم ممالک (مصر وغیرہ) میں یہی صورتحال درپیش ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ مذکورہ تنظیمی تبدیلی سے میری مراد قومیانہ نہیں بلکہ "اسلامیانہ" ہے جس میں اللہ کے سامنے جواب دہی کا تصور ابھرے گا اور حقوق سے زیادہ فرائض پر زور ہوگا۔

بتدریج اجتماعی ملکیت کا یہ مطلب ہے کہ حکومت ان کے لیے لائسنس جاری کرے گی ان پر عمومی نگرانی قائم رکھے گی اور متعینہ مدت کے بعد پیداوار اور انتظام کی جانچ کرتی رہے گی اگر پیداوار میں کمی یا انتظام میں خرابی ہوئی تو اپنے قبضہ میں لینے کی مجاز ہوگی۔

اسی طرح حکومت کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ ان چیزوں کے پرانے کاروبار انفرادی ملکیت میں رہنے دے لیکن نئے کاروبار کا انتظام خود کرے۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اشیاء کی مذکورہ فہرست نہ آخری ہے اور نہ کوئی دوسری فہرست کسی وقت آخری ہو سکتی ہے حالات کے لحاظ سے حکومت نئی فہرست بنانے اور پرانی فہرست میں رد و بدل کرنے کا پورا اختیار رکھتی ہے اسی طرح چند معدنیات کو چھوڑ کر انفرادی کو اجتماعی اور اجتماعی کو انفرادی میں تبدیل کرنے کا بھی اختیار رکھتی ہے۔

تیسرے حصہ کی تفصیل | (۳) تیسرے حصہ میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں اور گھریلو صنعتیں شامل ہیں (الف) چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے لیے نجی و عوامی کمپنیاں قائم ہوں گی یا وہ انفرادی طور پر انجام پائیں گی ان کے لیے قواعد و ضوابط شریعت کی روشنی میں مقرر ہوں گے۔ اور حکومت (بشرط مصلحت) ان کے لیے سرمایہ کی ایک حد (مثلاً دس بیس لاکھ وغیرہ) مقرر کرنے کی مجاز ہوگی کہ اس کے بعد یہ انفرادی سے نکل کر اجتماعی میں آ سکتی ہیں۔

(ب) گھریلو صنعتوں کے لیے سرمایہ کی حد بندی نہ ہوگی۔ ان میں چونکہ گھر کے اکثر لوگ کام کرتے ہیں باہر کے مزدوروں سے کم کام لیا جاتا ہے۔ اس بناء پر نہ اوقات کار کا تعین ہو پاتا ہے اور نہ کام کی باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے حکومت چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے فروغ دے گی اور ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہے گی۔

اسی طرح دوسرے اور تیسرے حصے سے (الف) میں حصص کی خرید و فروخت اور مسابقت کا سلسلہ بھی جاری رہے گا غرض اس طرح ایک طرف اجتماعیت کا تجربہ ہوگا تو دوسری طرف انفرادیت کو موقع ملتا رہے گا ان میں نہ کوئی آخری شکل ہوگی اور نہ کسی کو ذاتی وقار و اقتدار بڑھانے کے لیے باقی رکھے گا کہ وہ تنہا یا جماعتی حیثیت سے سرچشمۂ رزق پر قابض ہو کر اللہ کی مخلوق کو غلامی پر مجبور کر سکے۔

نوادرات ومخطوطات دارالمصنفین اعظم گڈھ

جناب عبدالمجید صاحب ندوی اسسٹنٹ ٹیچر
نیشنل ہائر سکنڈری اسکول، محمد پور۔ اعظم گڑھ

پچھلے دنوں راقم الحروف کو ایم اے۔ عربی کے امتحان کی تیاری اور دارالمصنفین، اعظم گڑھ میں ملازمت سے اس خزانہ نوادرات ومخطوطات سے استفادہ کا موقع ملا جو کتب خانہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ کے نام سے متعارف ہے۔ ان نوادرات ومخطوطات میں بعض قدامت، بعض تاریخی اہمیت، بعض خطاطی اور بعض فن کے اعتبار سے نہایت اہم اور قیمتی ہیں، انھیں دیکھ کر خیال ہوا کہ ان کا تعارف اصحابِ علم واہل ذوق حضرات کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اس لئے ذیل میں ان کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے:۔

(عربی مخطوطات)

۱۔ کتاب الجمل اس کتاب کا پورا نام "کتاب الجمل فی اصول النحو" ہے ابوالقاسم زجاجی نحوی کی مصنفہ ہے۔ مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر مصنف نے اسے اس اہتمام کے ساتھ لکھا ہے کہ ہرباب کے اختتام پر خانۂ کعبہ کے سات طواف کرتے تھے۔

پیش نظر قلمی نسخہ دارالمصنفین کے خزانہ، مخطوطات کا قدیم ترین نسخہ ہے تاریخ کتابت شائعہ ہے۔ اس نسخہ کو ایک عرب نے ۵۵۸ھ میں دیکھا ہے۔ اس کے اوراق نہایت درجہ منتشر اور بوسیدہ ہو گئے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں جمع وترتیب دے کر ۱۳۶۷ھ میں اس کی ایک نقل تیار کرالی ہے یہ

نسخہ چھوٹی تقطیع کے ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں، خط پاکیزہ عربی نسخ ہے:۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ | "نہج البلاغہ" حضرت رضی اللہ عنہ کے خطبوں کا نہایت قیمتی منتخبہ مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب سید رضی الدین محمد ہیں زیر نظر کتاب اس کی شرح ہے۔ شارح کا نام عزالدین عبدالحمید مدائنی المتوفی ۶۵۵ھ ہے۔ یہ شرح کئی اجزاء پر مشتمل ہے وزیر نوید الدین محمد بن علقمی کے کتب خانہ خاص کے لئے لکھی گئی تھی، شروع کتاب میں شارح کے مختصر حالاتِ زندگی ہیں۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حسب ونسب اور فضائل ومناقب بھی مختصر طور پر ذکر کئے گئے ہیں:۔

پیش نظر قلمی نسخہ بہت قدیم ہے، اس پر شاہانِ گولکنڈہ کی پانچ مہریں ثبت ہیں، تاریخ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ صفحات کے درمیان خاص خاص فقروں کو سرخ روشنائی سے۔۔۔ نمایاں کیا گیا ہے۔ ہر متن کے بعد "الشرح" کے سرخ لفظ سے تشریح کا آغاز ہوا ہے۔ حاشیوں پر جا بجا وضاحتی نوٹ بھی مندرج ہیں، یہ نسخہ کتابت کے کئی اجزاء کو شامل ہے۔ آخری عبارت یہ ہے:۔

"هذا اما انتهى فى هذا الكتاب من الجزء الثالث من نهج البلاغة والحمد لله وحده وصلى الله على من لا نبى بعده"

۳۔ کتاب المیزان | امام عبدالوہاب بن احمد بن علی شعرانی المتوفی ۹۷۳ھ کی مصنفہ ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں ائمہ مجتہدین کے مختلف مذاہب اور ان کے دلائل واساسات کے درمیان جمع وتطبیق کی سعی بلیغ کی ہے انھیں مضامین ومسائل پر مشتمل مصنف کی ایک اور کتاب "المنہج المبین فی ادلۃ المجتہدین" نامی بھی ہے۔

پیش نظر قلمی نسخہ ۲۶/ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام محمد بن محمد المعروف بہ جلبوکلی ہے۔ سرورق پر پانچ مہریں ہیں۔ متن میں "محمد عبدالرحمان"

کندہ ہے ۔ اور دو محو شدہ ہیں ۔ کاغذ دبیز بادامی، خط عربی نسخ باریک، سات عدد تصویریں بھی اس کی زینت ہیں ۔ ان تصویروں میں ۔ شجرہ احکام شریعت، شجرہ مذاہب ائمہ مجتہدین وغیرہ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے ۔ پل صراط و میزان وغیرہ کے نقشے بھی ہیں تقطیع کلاں کے ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ ہر صفحہ میں ۲۸ سطریں ہیں ۔

۴ ۔ عمدۃ الطالب فی نسب ابی طالب کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے ۔ جمال الدین احمد المعروف بہ ابن عقبہ المتوفی ۸۲۸ھ کی مصنفہ ہے پیش نظر نسخہ تقطیع کلاں کے ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں ۔ کاتب کا نام درج نہیں ہے ۔ تاریخ کتابت ۱۰۷۹ھ ۔ کاغذ نہایت عمدہ دبیز بادامی ہے ۔ خط عربی نسخ پختہ و جلی ہے ۔

۵ ۔ نظام الغریب علی ابن عیسی بن ابراہیم ربعی کی مصنفہ ہے پیش نظر قلمی نسخہ عربی خط نسخ کا شاہکار ہے ۔ کاتب کا نام محمد شرف الدین اور تاریخ کتابت شعبان ۹۹۸ھ ہے سرورق پر تین مہریں ثبت ہیں ۔ گلابی، دلاجوردی گلکاری کی گئی ہے ۔ نسخہ مکمل ہے، متوسط تقطیع کے ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں ہیں ۔ کتابت کا موضوع لغت ہے، مصنف نے بعض لغات کے استعمال کی بڑی نادر تحقیقات پیش کی ہیں ۔

۶ ۔ رسائل اخوان الصفا چوتھی صدی ہجری میں بعض اہل علم کے ایک بورڈ نے جو اپنے آپ کو "اخوان الصفا" کے نام سے موسوم کرتا ہے ۔ اپنی متفقہ کوششوں سے مختلف فلسفیانہ موضوعات پر ۵۱ رسالے لکھے تھے ۔ یہ رسائل "رسائل اخوان الصفا" کے نام سے مشہور و معروف ہیں ۔ قفطی نے "اخبار الحکماء" میں ان رسائل کے مؤلفین کے جو نام دیے ہیں، وہ صرف ابوسلیمان محمد بن معشر بستی (مقدسی) ابوالحسن بن ہارون زنجانی، ابو احمد المہرجانی اور عوفی کے ہیں ۔ یہ لوگ فرقۂ باطنیہ سے تعلق رکھتے تھے یہ رسائل فلسفہ کی ایک انسائیکلو پیڈیا ہیں، اس میں افلاطون ۔ فیثا غورث اور ارسطو سب کا فلسفہ موجود ہے ۔ اس کے علاوہ اسلامی فلسفہ پر مذہب، اخلاق، اور تصوف کے جو اثرات پڑے ہیں ان کی تفصیل بھی

ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان سے فلسفہ کی تعلیم نہیں بلکہ ایک خاص سیاسی ذہن رکھنے والی ایک خاص جماعت تیار کرنا مقصود تھا۔

پیش نظر مخطوطہ ابتدائی چند رسائل پر مشتمل ہے۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے انھیں ۱۹۱۱ء میں خرید اتھا، یہ نسخہ تقطیع کلاں کے ۸۲ صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ میں ۲۵ سطریں ہیں کاغذ دبیز بادامی، خط عربی نسخ، کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے، نسخہ نہایت خوشنما اور قدیم ہے۔

۷۔ وفیات الاعیان احمد بن ابراہیم بن ابی بکر بن خلکان المتوفی ۶۸۱ھ کی مشہور ومعروف تصنیف ہے، اس کا موضوع نام ہی سے واضح ہے کہ "وفیات" ہے۔

پیش نظر قلمی نسخہ گیارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام یحیٰ بن ابراہیم بن شرف الدین ہے، کاغذ دبیز بادامی۔ تقطیع کلاں ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ ہر صفحہ میں ۲۴ سطریں خط عربی نسخ۔

۸۔ شرح اشارات ابو عبد اللہ محمد نصیر الدین محقق طوسی کی فلسفہ میں مشہور کتاب ہے۔ پیش نظر قلمی نسخہ خط فارسی نستعلیق کا بہترین نمونہ ہے۔ متوسط تقطیع کے ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۲ سطریں ہیں، کاغذ دبیز بادامی، کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں ہے۔

۹۔ الیواقیت والجواہر علم عقائد کی مشہور و معروف کتاب ہے، امام عبد الوہاب بن احمد بن علی شعرانی نے اسے بمقام مصر ۹۵۵ھ میں تصنیف کیا۔ پیش نظر قلمی نسخہ محمد علی خاموش بن سلطان حسین کا مکتوبہ ہے، تاریخ کتابت درج نہیں متوسط تقطیع کے ۵۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۲۵ سطریں ہیں۔ خط عربی نسخ ہے۔ کاغذ عمدہ چکنا۔

۱۰۔ دلائل الخیرات درود وظائف کا ایک مختصر رسالہ ہے اس کا پورا نام "دلائل الخیرات وشوارق الانوار" ہے۔ ابو عبد اللہ محمد بن سلیمان سملانی حسنی کا مرتبہ ہے، یہ قلمی نسخہ

بارھویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے کاتب کا نام درج نہیں، ابتدائی صفحات میں حرمین شریفین کی نہایت پاکیزہ تصویریں ہیں، یہ تصویریں اب تک تروتازہ ہیں اور نہایت دلکش ہیں کتاب کی تاثیر میں ان سے اضافہ ہوگیا ہے۔

۱۱۔ مطالع الانوار عفیف نورکاشانی کی مصنفہ ہے، تواریخ وسیر کے مضامین پر مشتمل ہے صفحہ اول سے صفحہ ۲۶۵ تک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ولادت سے وفات تک کے مختصر حالات ہیں، ۲۶۶ سے ۲۸۷ تک خلفائے راشدین کا تذکرہ ہے اور پھر علامات قیامت و احوال آخرت کے بیان پر کتاب تمام ہوگئی ہے۔

پیش نظر قلمی نسخہ ۶ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ کا مکتوبہ ہے کاتب کا نام محمد رضا بن محمد شفیع ہے۔ خط فارسی نستعلیق۔ کاغذ دبیز بادامی متوسط تقطیع کے ۲۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں۔

۱۲۔ تفسیر بیضاوی قاضی ناصرالدین عبداللہ بن عمر بیضاوی کی شہرۂ آفاق تفسیر ہے پیش نظر قلمی نسخہ محمد ہاشم بن عبدالرحیم مشہدی نے رمضان المبارک ۱۰۷۷ھ میں بمقام مشہد امام رضا لکھا ہے۔ متوسط تقطیع کے ۶۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۲۳ سطریں ہیں۔

۱۳۔ صحیح بخاری پیش نظر قلمی نسخہ نہایت خوشنما خوشخط ہے، خط عربی نسخ، کاغذ دبیز چکنا، تقطیع کلاں ضخامت ۶۱۶ صفحات، ہر صفحہ پر ۳۳ سطریں ہیں۔ تاریخ کتابت ۵ ربیع الاول ۱۱۳۳ھ اور کاتب کا نام مصطفی بن شیخ حجازی ثم شنانی ہے۔

۱۴۔ الشفاء فی تعریف حقوق المصطفیٰ مولفہ عیاض بن موسیٰ المعروف بہ قاضی عیاض المتوفی ۵۴۹ھ قاضی صاحب سبتہ میں پیدا ہوئے، قرطبہ میں قاضی مقرر ہوئے اور مراکش کے شہر مکنس میں وفات پائی۔ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں بہت مشہور کتاب ہے۔ پیش نظر مخطوطہ ۲۹ ذی قعدہ ۱۱۵۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام احمد بن محمد ہے۔ کاغذ بادامی دبیز، خط عربی نسخ تقطیع خورد ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے

ہر صفحہ میں ۲۱ سطریں ہیں، ہر ورق پر پانچ محو شدہ مہریں ثبت ہیں۔

۱۵۔ جامع الرموز فقہ کی مشہور کتاب "مختصر الوقایہ" کی شرح ہے۔ شارح کا نام شمس الدین قہستانی ہے، پیش نظر نسخہ ۹۹۷ھ کا مکتوبہ ہے کاتب کا نام حامد بن شیخ زکریا ہے متوسط تقطیع کے ۷۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۳۱ سطریں ہیں۔

۱۶۔ حاشیہ شرح حکمۃ العین "حکمۃ العین" کے مصنف علامہ نجم الدین ابوالحسن قزوینی ہیں اس کی شرح علامہ شمس الدین نے لکھی ہے اور اس پر یہ حاشیہ مرزا حبیب اللہ المعروف بہ ملا جان المتوفی ۹۹۴ھ تحریر فرمایا ہے، پیش نظر نسخہ بارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، کاتب کا نام محمد باقر غیاث الدین ہے خط عربی ثلث۔ کاغذ عمدہ چکنا ہر ورق پر محو شدہ چار مہریں ہیں۔ چھوٹی تقطیع کے ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۲۱... سطریں ہیں۔

۱۷۔ لوامع الاسرار فی شرح مطالع الانوار قاضی سراج الدین محمود بن ابی بکر المتوفی ۷۶۶ھ کی مصنفہ ہے۔ مضامین منطق پر مشتمل ہے کتاب کی وجہ تسمیہ اور سبب تالیف کے متعلق دیباچہ میں مصنف نے تحریر کیا ہے "میں نے لوگوں کو مطالع الانوار کے مطالع و مباحث میں دلچسپی لیتے دیکھا۔ یہاں تک کہ بعض دوستوں نے مجھ سے اس کی شرح لکھنے کے لئے اصرار کیا تو میں نے یہ شرح لکھی اور اس کا نام "لوامع الاسرار فی شرح مطالع الانوار" تجویز کیا"

پیش نظر قلمی نسخہ... نہایت خوشنما ہے، خط عربی نسخ، کاغذ عمدہ چکنا ہر ورق پر ایک مہر ثبت ہے۔ اندازہ ہے یہ نسخہ شاہی ملکیت میں رہ چکا ہے۔ کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ متوسط تقطیع کے ۵۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں، حاشیہ پر جا بجا وضاحتی نوٹ بھی درج ہیں۔

۱۸۔ شرح منار الانوار اصول شریعت کی مشہور و معروف کتاب "منار الانوار" کی مفصل شرح ہے۔ پیش نظر قلمی نسخہ ربیع الاول ۹۳۲ھ کا مکتوبہ ہے کاتب کا نام عبدالمجید

ہے۔ متوسط تقطیع کے ۲۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط عربی نسخ، کاغذ عمدہ چکنا، اول آخر کے چند صفحات کرم خوردہ اور قدرے بوسیدہ ہیں، آخری صفحہ پر ایک مہر ہیں "صدر جہاں" کندہ ہے۔

۱۹۔ المغنی فی اسماء الرجال مشہور محدث و محقق عالم مولانا محمد بن طاہر پٹنی المتوفی ۹۸۶ھ کی مشہور تصنیف ہے پیش نظر قلمی نسخہ محمد شاہ رنگیلے کی ملک میں رہ چکا ہے۔ سرورق پر انکی ایک مہر ثبت ہے ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ کاغذ عمدہ دبیز، خط عربی نسخ، ہر صفحہ میں ۲۳ سطریں ہیں۔ سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں۔

۲۰۔ منہج العمال فی سنن الاقوال حدیث کے مشہور عالم مولانا علی بن حسام الدین المتقی الہندی کی مشہور کتاب ہے پیش نظر نسخہ نہایت خوشنما و خوشخط ہے۔ ہر صفحہ پر حواشی وفٹ نوٹ بھی مندرج ہیں، خاص خاص فقروں کو سرخ روشنائی سے نمایاں کیا گیا ہے، تاریخ کتابت ۹۸۳ھ ہے کاتب کا نام طاہر بن یوسف ہے، نسخہ مکمل ہے، متوسط تقطیع کے ۲۷۶ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۲۷ سطریں ہیں، کاغذ دبیز بادامی، خط عربی نسخ۔

اسی نسخہ کے ساتھ ایک دوسرا مختصر سا رسالہ بھی شامل ہے جو آداب و اسرار تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے، یہ رسالہ بھی انہیں مصنف موصوف کا مولفہ ہے، اس کا نام "نعم التوسل لتحصیل الیقین والتوکل" ہے اس نسخہ پر سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ یہ بھی "منہج العمال" کے زمانہ ہی کا مکتوبہ ہے۔

۲۱۔ احیاء العلوم پیش نظر نسخہ نہایت خوشخط عربی نسخ میں ہے، نسخہ ناقص الطرفین ہے کاغذ عمدہ، تقطیع متوسط، تاریخ کتابت اور کاتب کے نام کا پتہ نہ چل سکا۔

۲۲۔ تفسیرات الاحمدیہ ملاجیون امیٹھوی المتوفی ۱۱۳۰ھ کی مشہور تصنیف ہے۔ پیش نظر نسخہ مصنف کے قریب ہی عہد کا مکتوبہ ہے سرورق پر ایک شاہی مہر ثبت ہے، کاتب کا نام احمد المعروف بہ جبین بن سعد بن عبید اللہ ہے، تقطیع کلاں کے ۸۰۰ صفحات اس کی ضخامت

ہے ہر صفحہ میں ۲۵ سطریں ہیں۔

۲۳۔ انوار التنزیل | حسین بن محمد نیشاپوری کی مشہور تفسیر ہے، پیش نظر قلمی نسخہ سورہ "روم" سے سورہ "ق" تک مشتمل ہے، ۱۰۱۰ھ کا مکتوبہ ہے کاتب کا نام نصیر الدین بن سید صالح ہے۔ تقطیع کلاں کے ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۲۳ سطریں ہیں

۲۴۔ تحریر اقلیدس | نظام الملک طوسی کی مصنفہ ہے۔ جامیٹری کے موضوع پر اچھی کتاب ہے یہ قلمی نسخہ خوش خطی رضوان شیرازی کا مکتوبہ ہے، اس پر عالمگیر رح کی مہر ثبت ہے۔ تاریخ کتابت ۱۰۶۹ھ ہے، کاتب کا نام درج نہیں۔ تقطیع خورد، صفحات ۴۵۴ ہیں، ہر صفحہ میں ۱۴ سطریں ہیں، کاغذ عمدہ دبیز بادامی، خط فارسی نستعلیق۔

۲۵۔ عمدۃ الجراحین | عربی زبان میں طب کے موضوع پر ابو الفرج بن موفق الدین المتوفی ۶۸۵ھ کی مشہور تصنیف ہے، پیش نظر نسخہ ۴ ربیع الاول کا مکتوبہ ہے کاتب کا نام محمد ہے۔ خط عربی نسخ، کاغذ دبیز بادامی، تقطیع متوسط، صفحات ۳۰۹ ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں ہیں شروع کے چند صفحات غائب ہیں۔

ہندو تہذیب اور مسلمان

جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب
استاذ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

نکاح بیوگان

قدیم الایام سے ہندوؤں میں بیوہ کا عقد ثانی نہیں ہوتا تھا[1] اسی طرح مسلمانوں میں بھی بیوہ کے عقد ثانی کو برا اور مذموم سمجھتے تھے شاہ ولی اللہ کا بیان ہے :-

"ہندوؤں کی ایک بدترین رسم یہ ہے کہ بیوہ کی شادی نہیں کرتے۔ یہ بدترین رسم عربوں میں کبھی نہ تھی، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل نہ آپ کے زمانے میں اور نہ آپ کے بعد"[2]

---

[1] THE CLASSICAL AGE, P 566
حدیقۃ الاقالیم "شوہر دیگر کردن میان ایشاں رسم نیست"، ص ۵۳ کتاب الہند (اردو ترجمہ) جلد دوم۔ ص ۴۳ خلاصۃ التواریخ ص ۲۶ ہفت تماشا۔ ص ۱۱۲-۱۱۳

[2] وصیت نامہ شاہ ولی اللہ۔ ص ۴ تقویۃ الایمان ص ۲۶۲۔ مرزا قتیل نے بھی لکھا ہے کہ "وہ بیوہ لڑکی کو دوسری شادی سے محروم رکھتے ہیں، چاہے وہ سولہ سال یا اس سے بھی کم عمر میں بیوہ ہوگئی ہو اور اس معاملہ میں ان لوگوں اور قصبات کے شرفا کا حال قطعاً ہندوؤں کا سا ہے کہ اپنی انتہائی جہالت کے باعث شریعت کے احکام پر عمل نہیں کرتے ایسا کرنے والے کو نہایت ذلیل، کمینہ اور کم مرتبہ سمجھتے ہیں۔ اگر لڑکی بذات خود ہزاروں مردوں سے تعلق پیدا کرلے تو اس سے نہیں جھجکتے۔ مگر اپنی خوشی اور دلی رغبت سے اس کا نکاح ایک دوسرے مرد سے نہیں کرتے"، ہفت تماشا۔ ص ۱۳۸

جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا تو اس کے رشتہ دار اُسے عقد ثانی سے منع کرتے کیوں کہ عقد ثانی ان کی نظر میں معیوب تھا اور اگر ان کی مرضی کے خلاف کوئی عورت عقد ثانی کر لیتی تو لوگ اس پر لعن وطعن کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالعموم بیوہ عورت اپنی پوری زندگی رنڈاپے میں کاٹتی تھی[1]۔

فرقۂ کنبوہ کے بارے میں لکھتے ہوئے مرزا قتیل رقمطراز ہے:

"آج سے پہلے اس فرقے کے مسلمانوں میں یہ بھی رسم تھی کہ اگر ان میں سے کسی کا داماد نکاح کے بعد اور رخصتی ہونے سے پہلے ہی مار اگیا یا کسی مرض میں گرفتار ہو کر گذر گیا تو لڑکی بیوہ عورتوں کا لباس پہن لیتی تھی[2]۔

اس سلسلے میں مرزا قتیل نے ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک ہندوستانی حج اور زیارت کے لئے گیا ہوا تھا۔ عرب کے کسی شہر میں کسی ضرورت سے اُسے چھ ماہ تک ٹھہرنا پڑا۔ وہاں کے ایک شہری سے اس کی دوستی ہوگئی اور یہ دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ دونوں صبح و شام ساتھ رہتے تھے اور دونوں میں بہت دانت کاٹی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ وہ عرب جوان کچھ دنوں تک اس ہندوستانی کے گھر نہیں آیا اور ہندوستانی نے اس کی جدائی کو بہت زیادہ محسوس کیا۔ ہفتہ دس دن کے بعد وہ ملا ہندوستانی نے اس سے گلا کرنا شروع کیا۔ عرب نے جواب دیا کہ میرے بھائی کیا کروں؟ میری ماں کا فلاں عرب سے نکاح تھا اور میرے سوا وہاں کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو مجلس کا انتظام کرتا اس وجہ سے عقد کی رات کو اہل مجلس کو شربت پلانے میں مصروف تھا اور پہلے تین چار دن

---

[1] ملاحظہ ہو۔ صراط المستقیم ص ۱۱-۲-۲۱۔ تقویۃ الایمان ص ۸۴۔ وصیت نامہ شاہ ولی اللہ ص ۴۷

[2] ہفت تماشا۔ ص ۱۵۱۔

ضروری سامان مہیا کرنے میں لگا رہا تھا۔ ہندوستانی مرد نے یہ بات سن کر لاحول پڑھی اس کا دوست اس بات سے بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے دوستی کو بالائے طاق رکھا اور قاضی کے سامنے جاکر حقیقتِ حال بیان کیا اور قاضی کے حکم سے اس ہندوستانی کو گرفتار کر لیا گیا۔ قاضی نے کہا "اے شخص! خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہو کہ کیا یہ سچ ہے کہ اس کی ماں کے نکاح کی خبر سن کر تو نے لاحول پڑھی تھی۔ ہندوستانی نے جواب دیا۔ بالکل سچ ہے اور میں نے ٹھیک ہی پڑھی تھی کہ میں پینتالیس ۴۵ سال کا ہونے کو ہوں، اس مدت میں کبھی بھی ہندوستان میں ایسا واقعہ میرے سننے میں نہیں آیا تھا۔ [1]

حالانکہ اب اتنی سختی تو نہیں رہی تھی کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں تھی کہ شاہ اسمٰعیل شہید کی بیوہ بہن کا عقد ثانی نہیں ہوا تھا مگر اب بھی یہ رسم جاری ہے۔ احمد علی نے اپنی تصنیف دلی کی شام (یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں لکھی گئی تھی) یہ واقعہ بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں میں بیوہ کے عقد ثانی کو کتنا مذموم سمجھا جاتا تھا۔

"وحیدہ بیگم اصغر کی سب سے بڑی بہن تھیں۔ کم سنی ہی میں ان کی شادی بھوپال میں سید وحید الحق سے ہو گئی تھی جو بالکل غیر تھے۔ ابھی دوسرا بچہ گود ہی میں تھا کہ عین عالم شباب میں ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ حالانکہ اسلام نے نکاح ثانی کی اجازت دی ہے مگر انہوں نے اپنے اوپر رنگ، اور ریشم حرام کر لیا۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ ہندوؤں کے ہاں بیوہ کی شادی مذہباً منع ہے اور ہندوستان میں رہنے بسنے والے مسلمانوں پر بھی اس کے رسم و رواج کا اثر ہونا لازمی تھا"۔ [2]

---

[1] ہفت تماشا۔ ص ۱۳۸-۱۳۹

[2] دلی کی شام از احمد علی (ترجمہ بلقیس جہاں) ناشر جامعہ مکتبہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۷۴

توہم پرستی

قدیم ہندوستان میں علم نجوم[1] کا عام رواج تھا۔ جب مسلمان ہندوستان آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی اور یہاں کے باشندوں سے ان کے تعلقات بڑھے تو انھیں بھی اس علم سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ علاء الدین خلجی[2] کے دور حکومت میں عوام و خواص دونوں کو اہل تنجیم سے بڑی دلچسپی تھی اور ضیاء الدین برنی[3] کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں علم نجوم کا عام رواج ہوگیا تھا[4] دہلی کا کوئی محلہ ایسا نہ تھا جس میں نجومی سکونت پذیر نہ ہوں۔ ملوک اور امراء اپنے بچوں کے زائچے تیار کروایا کرتے تھے اور اس کام کے صلے میں ان کو بڑے بڑے انعامات سے نوازتے تھے۔ ہندو اور مسلم سیکڑوں منجم اپنی دکانیں لگائے اس کام میں مصروف نظر آتے تھے۔ منجم کے مشورہ کے بغیر کوئی اہم کام شروع نہیں کیا جاتا تھا۔ برنی کا بیان ہے۔

لہ البیرونی رقمطراز ہے "ہمارے منجمین اور ہندو منجموں کے درمیان صرف ایک بات میں اختلاف ہے اور وہ یہ ہے ہمارے منجمین اس حساب میں موجہ ساعات کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اس رات کا رب جو اس دن کے بعد ہے، وہ ستارہ ہوگا جو رب یوم سے تیرھواں پڑتا ہے اور برعکس (یعنی نیچے سے اوپر کی طرف) شمار کرنے میں دن کے رب سے تیسرا پڑتا ہے ہندوؤں کے رب کو پورے یوم کا رب قرار دیتے ہیں۔ رات دن کی تابع ہوتی ہے۔ اس کے لئے علیحدہ کوئی خاص رب نہیں ہے" جمہور ہندوؤں کا یہی طریقہ ہے۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ کتاب الہند (ا۔ت) جلد اول۔ ص ۲۸۴-۲۸۹

۲ متوفی جنوری ۱۳۱۶ء۔ ۳ مصنف تاریخ فیروزشاہی ۴ تاریخ فیروزشاہی ۳۶۳، ۲۷۳، ۱۹۹

"اشراف شہر را رسمے بودہ است کہ بے اختیار منجم در ہیچ ہیے دست نہ زندے و ہیچ تطہیرے و کار خیرے و خواستگاری بے اختیار منجم در دہلی نشدے" [1]

(اشراف شہر کی یہ موروثی رسم ہے کہ بغیر منجم سے دریافت کئے کوئی کار خیر اور کوئی معاملۂ خواستگاری بغیر منجم کی استصواب رائے کے نہیں ہوتا تھا۔)

ایک ایسے ماحول میں رہتے ہوئے سلطان علاء الدین خلجی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا اور بالخصوص اس کے حرم کی مستورات پر نجومیوں کا بہت اثر تھا۔ [2]

اس عہد میں نجومیوں کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے برنی لکھتا ہے :

"منجمان عصر علائی کہ ہم در استخراج احکام نجوم وہم در رصد بندی ماہر وکامل بودند واز بسیاری اکابر و اشراف و بزرگان و بزرگ زادگان کہ شہر دہلی بد ایشاں مملو بود علم نجوم رواجی تمام داشت و ہر محلی از منجم خالی بنودی و منجمان از بادشاہ و ملوک و امراء و اکابر و اشراف و خواجگان و خواجہ زادگان انعامات و صدقات بسیار یافتندی و شاید کہ منجمان چہار صد و پانصد تقویم در بست و سی صد مولود نامہ فرزندان ملوک و امراء و وزراء و اکابر در خدمت بزرگان برسانیدندی و ہدایا و انعام یافتندی کہ ازاں روزگار منجمان بغایت آراستہ گذشتی و اشراف شہر را رسمی موروث بودہ است کہ بی اختیار منجم در ہیچ مہمی دست نزدندی و ہیچ تطہیری و کار خیری و خواستگاری بے اختیار منجم در دہلی نشدی و بنیا نیان حد فتحمان و صلاحیان و مولانا شرف الدین مطرز و فرور کن عجائب کہ از منجمان استاد بودند۔ از سلطان علاء الدین دیہا و در ارصاد داشتند و بنیا نیان کہ از ہم دریں علم بیشتر بودند چنداں صدقات از سلطان علاء الدین و از حرم او می یافتند کہ ایشاں را ازاں اسباب حاصل شد و در

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص/ ۳۶۳

[2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص ۳۶۳۔۳۶۴

شہر از مسلمانان و ہندوان منجم بسیار بودند، خبر معارف و مشاہیر را در تاریخ ذکر کردن وجہ نیست و ہم در عہد علائی کسے رتال سروف و چندیں خوانندگان مشہور بودند"

ثمین سے مولانا صدر الدین لونی اور عزی رتال کول (علی گڑھ) کے باشندے تھے تیسرے معین الملک زبیری جو "در اظہار علم ضمیر و کشف احکام مغیبات دبیروں اور دن گم شدہ ساحر یہاں کی کردند" [۱]

سلطان فیروز شاہ تغلق (متوفی ۱۳۸۸ء) کو علم نجوم و ہئیات سے بڑی گہری دلچسپی تھی وہ اکثر و بیشتر "منجمان دانا" اور "کاہنان باریک بین" سے ستاروں کے بارے میں معلومات حاصل کیا کرتا تھا [۲] اس علم کا اس نے وسیع مطالعہ بھی کیا تھا اور اس فن میں کئی کتابیں بھی تصنیف کروائی تھیں۔ سیرت فیروز شاہی میں لکھا ہے:

"و چندیں مصنفات و مولفات و قواعد آں بتالیف و تصنیف خاص مخصوص گشتہ و باملا و ارشاد حضرت مسطور مذکور است" [۳]

اس نے اسطرلاب [۴] ایجاد کیا تھا جو "اسطرلاب فیروز شاہی" کہلاتا تھا اور اس کو منارۂ فیروز آباد پر نصب کیا گیا تھا۔

جولا لکھی کے مندر [۵] میں فیروز شاہ کو نجوم پر ایک سنسکرت کی تصنیف دستیاب

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۳۶۳۔ ۳۶۴

[۲] تاریخ فیروز شاہی (عفیف) ص ۲۱۴

[۳] سیرت فیروز شاہی ص ۱۵۳/ ماخوذ از سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (از پروفیسر خلیق احمد نظامی) ص ۳۹۸

[۴] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ اسلامک کلچر (جنوری ۱۹۳۵ء ص ۴۹۔ ۵۲۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء ص ۲۲۱۔ ۲۳۱، جولائی ۱۹۴۶ء۔ ص ۲۶۷ ۔ ۲۸۴

[۵] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ تاریخ فیروز شاہی (عفیف) اردو ترجمہ۔ ص ۱۳۴۔ ۱۳۷ خلاصۃ التواریخ ۳۸

ہوئی تھی جس کا اس نے عز الدین خالد خانی سے نظم میں ترجمہ کرایا تھا اور اس کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا گیا۔ نظام الدین بخشی نے اس کا مطالعہ کیا تھا اور کتاب کے بارے میں اس نے اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"الحق کتابیست متضمن اقسام حکمت علمی و عملی" [1]

یہاں تک کہ عبد القادر بدایونی نے بھی اس کتاب کی تعریف کی ہے [2] سبحان رائے بھنڈاری کا بیان ہے کہ فیروز شاہ کو یہ کتاب بہت پسند آئی تھی اور اس نے:

"درصلہ آں بسیاری نقود از طلا و نقرہ و جامہ و جاگیر مرحمت کرد و مضمون آں کتاب اکثر اوقات مذکور محفل قدسی می شد" [3]

علاوہ ازیں علم نجوم پر باراہمر کی مشہور تصنیف باراہی سنگھتا [4] کا بھی فیروز شاہ نے ترجمہ کروایا تھا اور اس زمانے میں یہ کتاب علم نجوم کی اعلیٰ ترین کتابوں میں شمار کی جاتی تھی۔ اور البیرونی نے بھی اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا [5] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذخیرہ سرشاہ سلیمان میں اس کا ترجمہ "کتاب النجوم" [6] کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب کے شروع میں لکھا ہے۔

---

[1] طبقات اکبری۔ ۱/ص ۲۴۳
[2] منتخب التواریخ ۱/ص ۲۴۹
[3] خلاصۃ التواریخ ص ۲۴۸
[4] KERN (کرن) نے ۱۸۶۵ء میں اس کتاب کو کلکتہ سے شایع کیا تھا اور ۱۸۷۰ء میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے رسالہ میں چھپا تھا۔
[5] البیرونی نے اس کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ کتاب الهند (ا۔ ت) ۱/ص ۲۰
[6] کتاب النجوم (نمبر ۵۲۶)

"این کتاب ترجمہ کردہ از ہندوی (سنسکرت) بفارسی امام ائمہ عبدالعزیز تھانیسری مولف تاریخ فیروز شاہی اصلح اللہ شانہ بحکم وفرمان بادشاہ دین دار ... ابوالمظفر فیروز شاہ ... این کتاب بارانی از نوادر کتب اہل ہند است" لہ

فیروز شاہ تغلق فال پر بھی بہت اعتقاد رکھتا تھا ٢ہ ہر کام اور مہم پر جانے سے قبل قرآن سے فال نکالتا تھا۔ اور حد یہ تھی کہ گورنروں کا تقرر بھی فال دیکھ کر کرتا تھا ٣ہ مزید برآں سلطان جادو، ٹونے، تعویذ اور گنڈوں کا بھی معتقد تھا۔ قیاس چاہتا ہے کہ غالباً سلطان کے اس دلچسپی کے سبب سے عبدالقوی المعروف بہ ضیاء نے اپنی کتاب راحت الانسان اس کے نام معنون کی تھی۔ اس کتاب میں تین باب اور چودہ فصلیں ہیں۔ اس کا بیشتر حصہ تعویذ گنڈوں اور عملیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ٤ہ

قرونِ وسطیٰ کے مصنفین نے اس عہد کے مدارس کا تفصیلی نصاب درج نہیں کیا ہے لہٰذا وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ علم نجوم بھی نصاب میں شامل تھا مگر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ علم نجوم بھی طلبا کو پڑھایا جاتا ہو ۵ہ

عہد مغلیہ میں بھی علم نجوم سے گہری دلچسپی کا سلسلہ برابر چلتا رہا۔ اکبر بادشاہ کو اس فن سے بے حد دلچسپی تھی۔ علم فلکیات میں تاجک نامی مشہور کتاب کا فارسی میں ترجمہ کرایا گیا تھا

لہ کتاب النجوم۔ ص ۱

٢ہ عفیف۔ تاریخ فیروز شاہی / ۲۲۵

٣ہ ایضاً / ۲۲۵

٤ہ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ ص / ۴۰۴

۵ہ STUDIES IN MEDIEVAL INDIAN HISTORY AND CULTURE - P = 76

۔ یہ ترجمہ تکمل خاں گجراتی نے کیا تھا۔ [1] اس عہد میں سید میر شہرۂ آفاق منجم تھا۔ اس کو دربار میں بڑی عزت حاصل تھی اور اس کی کئی پیشین گوئیاں صادق ثابت ہوئی تھیں [2]
عبدالقادر بدایونی اس منجم سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس سے اس علم کے سیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ اس کا بیان ہے:۔

"میری اس ماہر نجوم سے انہی دنوں شناسائی ہوئی تھی۔ میں نے اس علم کے سکھانے کی درخواست کی تو اس نے قبول کر لیا اور کہا یہ اہل بیت کا خاص علم ہے اور اس کے لیے چند شرائط کی پابجائی لازمی ہے۔ آخر میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ شرطیں شیعوں کے بعض مسائل کی تقلید سے متعلق ہیں اور یہ فال بھی دوسرے فالوں کی طرح جعلی اور اختراعی ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ایسے فال بر آمد کر سکتا ہے۔ اس کا مجھے مشاہدہ بھی ہوا بلکہ میں نے خود بھی تجربہ کر کے دیکھ لیا اور انہی دنوں سید کی تعلیم کا احسان اٹھائے بغیر ہی میں نے فال کے اس طریقے کو سیکھ لیا۔" [3]

اکبر بادشاہ نے مدارس کے لئے نصاب خود تجویز کیا تھا۔ اور اس میں بادشاہ نے نجوم اور رمل کے مضامین بھی بطور لازمی مضامین کے شامل کئے تھے [4]

جہانگیر [5] اور شاہ جہاں بادشاہ کے دربار سے اہل تنجیم منسلک تھے۔ اور وہ بھی ان کے مشورے پر بڑی پابندی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ ایک موقع پر جب شاہ جہاں بادشاہ نے دیکھا کہ اس کے امراء جیبت رائے بندیلہ سے مقابلہ کرنے میں پہلوتہی کر رہے ہیں تو اس نے

---

[1] آئین اکبری (ا۔ت) ج ا حصہ اول۔ ص ۱۹۲ نیز بدایونی (ا۔ت) ص ۴۱۵ (فٹ نوٹ)

[2] بدایونی (ا۔ت) ص ۴۱۹-۲۰

[3] برائے تفصیل۔ آئین اکبری (ا۔ت) ج ا ح ا ص ۴۱۸، آئین۔ ۴۳

[4] بدایونی (ا۔ت) ص ۴۲۰

[5] جہانگیر کو جوتک رائے منجم سے بڑی عقیدت تھی۔ چناں چہ یہ منجم کئی مرتبہ سونے میں تلوایا گیا تھا۔ تزک جہانگیری (فارسی) ص ۲۵۸، ۳۲۹

درباری ہندو نجومی سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا اور اس کے مشورہ پر وہ بذات خود اس مہم پر روانہ ہوا۔ [1]

سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں علم نجوم کا عام چرچا اور خواص و عوام دونوں نجومیوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ان کے مشورہ کے بنا کوئی اہم کام شروع نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ جنگ کا وقت اور بچے کی ولادت کا وقت تک ان سے پوچھا جاتا تھا اور لا ولد بادشاہ امراء اور دیگر اشخاص اولاد کے ہونے اور نہ ہونے تک کی بات تک ان سے معلوم کرتے تھے۔ برنیئر کا بیان ہے:-

"ایشیائی لوگ اکثر احکام نجوم کے ایسے معتقد ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا کا کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جو کواکب اور افلاک کی گردش پر منحصر نہ ہو۔ اور اس لئے وہ ہر ایک کام میں نجومیوں سے مشورہ لیا کرتے ہیں یہاں تک کہ عین جنگ کے وقت جب کہ دونوں طرف صف بندی بھی ہو چکی ہو کوئی سپہ سالار اپنے منجم سے ساعت نکلوائے بنا لڑائی شروع نہیں کرتا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نامبارک گھڑی میں لڑائی شروع کر دی جائے بلکہ منجموں سے دریافت کئے بغیر کوئی شخص سپہ سالاری کے عہدے پر مامور کبھی نہیں کیا جاتا۔ علی ہذا القیاس بدلا ان کی اجازت کے نہ شادی بیاہ ہو سکتا ہے اور نہ کہیں کا سفر کیا جاتا ہے بلکہ ذرا ذرا سی باتیں بھی ان سے پوچھے بغیر نہیں کی جاتیں مثلاً لونڈی غلام کا خریدنا یا نیا کپڑا زیب تن کرنا اور اس احمقانہ توہم نے خلایق کو عموماً ایسی دقت میں ڈال رکھا ہے اور اس سے ایسے اہم اور نامرغوب نتیجے پیدا ہوتے ہیں کہ مجھے سخت تعجب ہے کہ اس قدر مدت سے یہ اعتقاد کیوں کر قایم چلا آتا ہے۔ کیوں کہ ہر ایک نجومی سے خواہ وہ کسی سرکاری کام کے متعلق ہو یا نج کے۔ اور ہر ایک معاملہ سے خواہ وہ معمولی ہو یا غیر معمولی نجومی کو واقف کرنا

---

[1] منوچی (انگریزی) جلد اول ص ۲۱۰، ۲۱۲، ۲۲۸

ضروری ہے"۔[1]

دہلی اور آگرہ کے بازاروں میں نجومی اور رتال اپنی پوتھیاں اور تختیاں لے کے اپنی اپنی دکانیں سر بازار لگاتے تھے اور ان کے اردگرد لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ان میں ہر قسم کے لوگ اور طرح طرح کی ضرورتیں لے کر حاضر ہوتے تھے۔ اور اپنے مستقبل کے بارے میں مشورہ طلب کرتے تھے۔

برنیئر رقمطراز ہے۔

"اور ہندو اور مسلمان نجومیوں اور رتالوں کا تو جمع ہے اور یہ فاضل نجومی دھوپ میں ایک میلا سا قالین کا ٹکڑا بچھائے بیٹھے رہتے ہیں جن کے پاس علم ریاضی کے کچھ پرانے آلات ہوتے ہیں اور سامنے ایک بڑی سی کتاب کھلی رکھی ہوتی ہے، جس میں بارہ برجوں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں اور اس طریقے سے وہ لوگ راہ چلتے لوگوں کو پھسلاتے اور فریب دیتے ہیں اور عوام الناس غیب دان سمجھ کر اُن سے رجوع کرتے ہیں اور یہ ایک پیسہ لے کر ان کو بتاتے ہیں کہ ان کی قسمت میں آئندہ کیا ہونا ہے اور ان کے ہاتھ اور چہرہ کو خوب دیکھ بھال کر اور کتاب کے ورق الٹ پلٹ کر یقین دلاتے ہیں کہ گویا واقعی کچھ حساب لگا رہے ہیں اور یہ لوگ جس کام کی بابت ان سے سوال کرتے ہیں اس کے لئے "وقت" اور "ساعت" یعنی مہورت بتاتے ہیں اور نادان عورتیں سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر اوڑھ کر اُن کے

---

[1] برنیئر۔ وقائع سیر و سیاحت (مرادآباد ۱۸۸۸ء) ج ۱/ ص ۲۸۲

نیز ملاحظہ ہو۔

TERRY-A VOYAGE TO THE EAST INDIES. (L. 1655) PP. 220-223 THEVENOT AND CAREERI: INDIAN TRAVELS (DELHI 1949) PP. 194-196 PETER MUNDY TRAVELS ETC. II. PP. 195-96

پاس جمع ہوتی ہیں اور اپنی تمام عمر کے امورات کی نسبت ان سے پوچھ گچھ کرتی اور اپنے تمام دلی بھید ان سے کہہ دیتی ہیں"[۱]

مابعد برنیئر نے ایک پرتگالی کا حال بیان کیا ہے جو گوا سے بھاگ کر دہلی آیا تھا اور ان نجومیوں کے ساتھ بازار میں بیٹھا ہوا لوگوں کو بے وقوف بنا رہا تھا[۱]

بعد ازیں مصنف بذا لکھتا ہے کہ جن نجومیوں کی امراء کے ہاں آمد و رفت تھی وہ علامہ دہر سمجھے جاتے تھے اور تھوڑی ہی مدت میں دولتمند ہو جاتے تھے۔ وہ آگے لکھتا ہے۔

"تمام ایشیا میں یہ بے اصل وہم پھیلا ہوا ہے اور خود بادشاہ اور بڑے بڑے امیر ان فریبی غیب گویوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر ملازم رکھتے ہیں اور بغیر ان کی صلاح کے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی شروع نہیں کرتے۔ یہ نجومی گویا آسمان میں لکھی باتیں جانتے ہیں۔ ہر ایک کام کرنے کے لئے مبارک گھڑی تجویز کرتے اور ہر ایک شبہ کو قرآن سے فال سے نکال کر حل کرتے ہیں"[۲]

منوچی کے بیانات سے برنیئر کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے تقریباً پچاس سال اس نے ہندوستان میں قیام کیا تھا اور اس نے بذات خود ان تمام باتوں کا مشاہدہ کیا تھا وہ لکھتا ہے:-

"کوئی بھی بڑا آدمی ایسا نہیں ہے جو اپنے گھر میں ایک نجومی ملازم نہ رکھتا ہو وہ نہ صرف کسی کام کے لئے باہر جانے کے بارے میں اس سے مشورہ کرتا ہے بلکہ یہاں تک کہ وہ کس وقت اور ساعت نیا لباس زیب تن کرے۔ اس سلسلہ میں بھی وہ اس سے دریافت

---

[۱] برنیئر وقائع سیر و سیاحت ج ۲/ ص ۲۵۶-۲۵۷

[۲] وقائع سیر و سیاحت۔ ص ۲۵۷/ جلد دوم

[۳] ایضاً۔ ص ۲۵۷-۲۵۸ جلد دوم

کرتا ہے مغل اور ہندو دونوں اتنے سریع الاعتقاد ہیں کہ وہ لوگ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ اس پر یقین کرتے ہیں" [1]

مآثر عالمگیری اور منتخب اللباب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے جلوس کے بارہویں سال تمام ان نجومیوں کو جو دربار شاہی شاہزادوں اور صوبہ داروں سے منسلک تھے، برطرف کر دیا تھا [2] بلکہ اس حکم کی تعمیل اتنی سختی سے کی گئی تھی کہ بخشا ورسفا نے ان لوگوں سے مچلکے لکھوائے تھے کہ سالِ نو کے آغاز پر جنم پتریاں نہ بنائیں اور نیز اس مضمون کے احکام دیگر صوبہ جات کو بھی روانہ کئے گئے [3]

اورنگ زیب کی وفات کے بعد پھر پہلے سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اور نجومیوں اور رمالوں کا ستارہ بلند ہو گیا۔ بادشاہ سے لے کر عوام تک ہر طبقے کے لوگوں میں ان کی آؤ بھگت تھی اور ہر شخص ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ہر کام کے بارے میں مشورہ طلب کرتا تھا۔ اس عہد کے ادب میں نجومیوں کے اثرات کی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ افواج مغلیہ نے احمد شاہ ابدالی کا پہلے دن اس لئے مقابلہ نہیں کیا تھا کہ نجومیوں کے حساب کے مطابق وہ دن جنگ کے لئے مبارک نہیں تھا۔

---

[1] منوچی (انگریزی) ج ۱/ص ۲۱۲-۲۱۴، دارا شکوہ کو نجومیوں سے بے حد عقیدت تھی۔ ایضاً ج ۱/ص ۲۲۴-۲۶۸-۲۲۸، ۳۰۰

[2] خافی خان ج ۲/ص ۲۱۴-۲۱۵- حالاں کہ بادشاہ ہونے سے پہلے اورنگ زیب بھی نجومیوں سے مشورہ طلب کرتا تھا۔ منوچی ج ۱/ص ۶۶

[3] محمد ساقی مستعد خاں - مآثر عالمگیری (ا-ت) ص ۱۶۱ ۔ برائے تفصیل سیر المتاخرین (انگریزی ترجمہ) ج ۳/ ۲۵۸

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ

فانی مرادآبادی

قابلِ صد آفریں ہیں دورِ حاضر کے دماغ
کاوشِ پیہم سے جن کی ہو گئے روشن چراغ

ذہن کو حاصل ہوا ہے ارتقائے لامکاں
علم اور ایجاد کی مشعل سے تاباں ہے جہاں

وہ زمیں ہو، آسماں ہو، آب یا کوہ و دمن
وہ ہوا ہو، برق ہو، یا کہ ہوں سرو و سمن

سب کے سب زیرِ نگیں، زیرِ اثر انسان کے
طاقتِ ادراک سے رُخ پھر گئے طوفان کے

ہر نفس ایجادِ نو ہے، باعثِ آرامِ جاں
منزلِ عظمت کی جانب ہے رواں یہ کارواں

جوہری طاقت سے ہے لبریز ہر ذرہ یہاں
روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے ہر سرِّ نہاں

فاصلے برسوں کے طے ہوتے گئے لمحات میں
ہے خلاؤں کی حکومت آدمی کے ہاتھ میں

ساکنانِ فرش کی اب آشنائی ہو گئی
چاند تاروں پر بھی انساں کی رسائی ہو گئی

ٹیلیویژن ریڈیو اور سارا لاسلکی نظام
کر رہا ہے آدمی کے ذہنِ عالی کو سلام

ضو فشاں ہے فرش سے تا عرش قندیلِ خرد
سو گئی ہے نور کی آغوش میں لیلِ خرد

ناز کرتی ہے مشیت عقلِ انسانی پہ آج
ہو گیا ہر طاقتِ دنیا پہ انسانوں کا راج

تبصرے

مجلات ورسائل

اسلام اور عصر جدید ایڈیٹر ڈاکٹر سید عابد حسین تقطیع متوسط صفحات ۱۱۲۔ کتابت وطباعت بہتر سالانہ قیمت -/۱۶ پتہ: جامع نگر۔ نئی دہلی - ۲۵۔

اسلام کو اپنی تاریخ میں دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں سے سابقہ پڑا ہے اور کہیں اس کی کرخم نہیں ہوئی لیکن آج اس کا مقابلہ عصر جدید کی اس تہذیب سے ہے جس کے جلو میں علوم وفنون۔ سائنس اور ٹکنالوجی صنعت وحرفت ایجادات واختراعات سوشلزم اور جمہوریت حریت فکر وآزادی عمل کے انبوہ در انبوہ لشکر اور سازوسامان ہیں اور دوسری جانب پسماندگی اور مرعوبیت۔ دل شکستگی اور شکست خوردگی کا احساس ہے اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ آج اسلام کا سابقہ ایک نہایت قوی اور طاقتور حریف سے ہے اور اس لیے ضروری ہے کہ اسلام میں فکری اور نظری طور پر وہ توانائی پیدا کی جائے جس کے باعث وہ تاریخ کے اس دور میں بھی اپنی انفرادیت اور وجود کو قائم رکھ سکے اور اگر ممکن ہو تو دوسروں کو متاثر بھی کرسکے یہی وہ ضرورت ہے جس کی تکمیل کے لیے چند اصحاب علم وفضل اور ارباب فکر ونظر نے جامعہ نگر میں " اسلام اور عصر جدید سوسائٹی " کے نام سے ایک ادارہ بڑی امنگوں کے ساتھ قائم کیا۔ ہے۔ " اسلام اور عصر جدید " اسی ادارہ کا سہ ماہی مجلہ ہے ہمیں اب تک اس کے دو نمبر موصول ہوئے ہیں، جو ہند وبیرون ہند کے ارباب علم وقلم کے مقالات پر مشتمل ہیں۔ مضامین سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادارہ کے اساسی مقصد سے تعلق رکھتے ہیں

اور معیاری ہونے کے باعث معلومات افزا اور لائق مطالعہ ہیں۔ اس موقع پر یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ بعینہٖ یہی کام ڈاکٹر اقبال مرحوم کے ذہن میں تھا اور وہ خود اس کو کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے دیوبند کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور راقم الحروف اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے لاہور میں ملا تو ڈاکٹر صاحب نے استعفا پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اب میں مولانا انور شاہ کو لاہور بلاؤں گا اور ہم دونوں مل کر وہ کام کریں گے جو میری زندگی کی آخری تمنا اور آرزو ہے۔ پھر فرمایا "میں عصر جدید" کو خوب جانتا ہوں لیکن "اسلام" کو ایسا نہیں جانتا اور دوسری طرف مولوی انور شاہ اسلام کو خوب جانتے ہیں مگر عصر جدید سے ایسے واقف نہیں ہیں، اس لیے ہم دونوں مل جل کر اس کام کو انجام دیں گے اور یہ کام اس زمانہ میں وقت کی عظیم ترین خدمت ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب سے جو لوگ قریب تھے انہیں معلوم ہے کہ مرحوم کے دل میں اس کام کی بڑی لگن تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ ادھر ڈاکٹر صاحب کی صحت اچھی نہیں رہی اور ادھر حضرت شاہ صاحب لاہور میں قیام نہ فرما سکے اور اس کام کا آغاز بھی نہ ہو سکا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آج دنیا میں نہ اقبال موجود ہیں اور نہ انور شاہ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ادارہ کا پیش نظر مقصد باحسن وجوہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ ادارہ کو دونوں قسم کے حضرات کا پورا تعاون اور اشتراک حاصل ہو۔ لیکن مجلہ کے شروع میں مجلس ادارت کے چودہ ممبروں کی جو طویل فہرست چھپی ہوئی ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً ادارہ کے نزدیک عصر جدید کے ماہرین کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اسلام کے ماہرین کو نہیں ہے اگر خدانخواستہ ہمارا یہ اندیشہ صحیح ہے تو اسلام کا مریض ناتواں کہہ سکتا ہے۔

تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

لیکن ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی ذات سے توقع رکھنی چاہئے کہ وہ اس کی نوبت

نہیں آنے دیں گے۔

عزائم ایڈیٹر ڈاکٹر محمد آصف قدوائی۔ ہفتہ وار۔ سائز الہلال کتابت وطباعت اعلیٰ صفحات سولہ۔ سالانہ قیمت -/6۔ پتہ باغ گونگے نواب لکھنؤ۔

ہفتہ وار ندائے ملت" لکھنؤ کا مشہور اخبار ہے اور مسلمانوں میں بڑا مقبول بھی ہے پچھلے دنوں اس کے عملہ میں اختلافات پیدا ہوئے اور اختلافات بذات خود کتنے ہی برے ہوں لیکن ان کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ جن حضرات کے دم سے ندائے ملت کا وقار قائم ہوا تھا انہوں نے وہاں سے الگ ہوکر عزائم کے نام سے اپنا ایک الگ ہفتہ وار شائع کرنا شروع کر دیا ہے یہ پرچہ کئی ماہ سے بڑی باضابطگی اور پابندی سے نکل رہا ہے اور اس کا طنطنہ اور طمطراق وہی ہے جو ان حضرات کی موجودگی میں ندائے ملت کا تھا۔ وہی لب ولہجہ، وہی سنجیدگی فکر کے ساتھ زور قلم مختلف قسم کے معلومات افزا مضامین اور تراجم۔ سیاسی تبصرے اور مسلمانوں کے معاملات ومسائل کی جرات مندانہ مگر بصیرت اور ہوشمندی کے ساتھ ترجمانی۔ ارباب ذوق کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اس کی قدر کرنی چاہئے۔

نقیب ایڈیٹر جناب شاہد صاحب، ام نگری الہلال سائز ہفتہ وار ضخامت سولہ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ سالانہ قیمت -/15۔ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

امارت شرعیہ بہار کا پرانہ ترجمان ہے لیکن اب ایک ڈیڑھ برس سے نئی آب وتاب اور بڑے اہتمام وانتظام سے نکل رہا ہے۔ مسلمانوں کے معاملات ومسائل پر خصوصاً اور ملک کے حالات پر عموماً اس کے اداریے اور شذرات بکلی فکر انگیز ہوتے ہیں۔ فتاوی امارت شرعیہ کی خبریں اور دو ایک مذہبی یا سیاسی مضامین اس کی ہر اشاعت میں لازمی طور پر ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ملک کی اسلامی صحافت میں اس کا بھی ایک نمایاں مقام ہے۔

ہفت روزہ ندائے ملت لکھنؤ کا تعلیمی نمبر مرتبہ محمد عثمان صاحب صدیقی ضخامت ۹۰ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت 2/50۔ پتہ 99 گوئن روڈ لکھنؤ۔

آج کل مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا اہم مسئلہ تعلیم کا ہے۔ کیونکہ آئندہ نسلوں کا بگڑنا اور بننا اسی پر موقوف ہے لیکن سخت افسوس اور بڑے دکھ کی بات ہے کہ مسلمان عوام میں عام طور پر تعلیمی مسائل کا شعور ہی نہیں پایا جاتا اور اس لیے ان کی اولاد اسی ڈگر پر چل رہی ہے جس پر دوسرے لوگ چل رہے ہیں۔ عام مسلمانوں میں بھی شعور پیدا کرنے کی غرض سے ندائے ملت کا یہ خاص نمبر شائع کیا گیا ہے۔ اس میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا ماضی حال اور مستقبل ان تینوں کی تصویر یکجا طور پر سامنے آجائے۔ چنانچہ اس میں دیو بند علی گڑھ ندوۃ۔ جامعہ۔ اور اتر پردیش میں دینی تعلیم کے مکاتب پر مقالات کے علاوہ آج کل مختلف ریاستوں میں مسلمانوں کے جو تعلیمی حالات اور اس کا نظام ہیں ان پر بھی الگ الگ، مستقل مضامین ہیں اور سکولرزم کے پردہ میں آج کل ملک میں کس طرح کی تعلیم کا چلن ہے اس کی پردہ دری بھی کی گئی ہے مضامین سب کے سب محنت اور توجہ سے لکھے گئے ہیں اس لئے معلومات افزا بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی یہ نمبر مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کے علاوہ جو حضرات تعلیم کے مضمون سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ البتہ اس نمبر کا حصۂ نظم بہت پھسپھسا اور معیار سے گرا ہوا ہے۔

ماہنامہ الفاروق رامپور کا سیرت نمبر مرتبہ مسرت حسین صاحب آزاد تقطیع کلاں ضخامت ۱۹۶ صفحات قیمت -/3 پتہ نبر گلہ آزاد خاں۔ رامپور یو۔پی۔

الفاروق کم و بیش دو برس سے شائع ہو رہا ہے۔ اس میں مذہبی اصلاحی اور علمی و ادبی قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔ یہ خاص نمبر سیرت مبارک پر ہے۔ اس میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کی کوئی قید نہیں ایسے مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو مستند ہیں اور جن سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ نثر کے علاوہ نظم کا حصہ بھی خوب ہے۔

پیٹ میں بھاری پن اور سینے میں جلن سے
جلد آرام کے لیے
پچنول
لیجیے
پچنول پیٹ کے درد، کھٹی ڈکاریں، اپھارا، جلن، متلی، بھوک کی کمی اور کھانے کے بعد طبیعت کی سستی وغیرہ جیسی شکایتوں میں نہایت مفید ہے۔
ہمدرد
PACHNOL
HTA-HDF-1546A-U

Registerd No. D. 183

OCTOBER 1969

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

طابع؟ مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

برہان دہلی

جلد ۶۳ | رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ مطابق نومبر ۱۹۶۹ء | شمارہ ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نظرات

النبأ العظیم

ان لوگوں سے قطع نظر جو کسی جارحیت پسندانہ ذہن یا عقیدہ کے باعث بڑے سے بڑے جرم اور گناہ کو بھی درست اور صحیح سمجھتے ہیں۔ ایک عام نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص کسی خاص جذبہ کے ماتحت جب کوئی بُرا کام کرتا ہے تو یہ سمجھتے ہوئے کرتا ہے کہ وہ برا ہے لیکن جب وہ اس کام کو دوبارہ کرتا ہے۔ تو اس کی برائی کا احساس بھی کم ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ کی تکرار کے بعد اس کام کی برائی کا احساس ہی باقی نہیں رہتا۔ اب وہ اپنے فعل پر ندامت نہیں بلکہ فخر محسوس کرتا ہے۔ اور اگر کوئی اسے ملامت کرتا اور برا بھلا کہتا ہے تو وہ تاویل و توجیہہ کرنے لگتا ہے۔ انسانی عمل و کردار کا یہی وہ مقام ہے جسے مذہب کی زبان میں تسویلِ شیطان کہتے ہیں۔ یہ نفسیاتی حقیقت جس طرح افراد و اشخاص پر صادق آتی ہے۔ اسی طرح جماعتوں اور قوموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ گجرات کے فسادات کے سلسلہ میں متعدد انگریزی اخبارات نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اس درجہ ہولناک تباہی و بربادی کے بعد بھی وہاں کی اکثریت میں

بحیثیت مجموعی ندامت اور پشیمانی (Repentence) کے آثار نہیں پائے جاتے۔ ——یہ اگر صحیح ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ بدقسمتی سے ہمارا سماج اور معاشرہ جو بائیس برس سے مسلسل آگ اور خون کی ہولی کے مناظر دیکھتا چلا آرہا ہے۔ اور جس کے نوجوان اسی ماحول اور فضا میں پیدا ہوئے اور پل بڑھ کر بڑے ہوئے ہیں اب وہ عمل و کردار اور ذہن و تخیل کے اسی مقام پر پہنچ گیا ہے۔ جہاں مذکورہ بالا نفسیاتی حقیقت کا ظہور ہوتا ہے۔

~~~~~~~~~~

اس کی مزید تائید و توثیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ اکثریت میں ایک طبقہ کا یہ وطیرہ ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں فساد ہوا تو بجائے اس کے کہ بہ حیثیت انسان کے مظلومین اور بلاکشانِ رنج و مصیبت کے لئے اس کی زبان سے ایک، دو لفظ ہمدردی کے اور ظالموں کے فعل پر اظہارِ مذمت کے نکلیں۔ یہ فوراً انہیں غریبوں کو جلی کٹی باتیں سنانی شروع کر دیتا ہے۔ جس کے معنی بالواسطہ یہ ہوئے کہ کشت و خون اور سلب و نہب کا ہنگامہ کرنے والوں نے جو کچھ کیا اس میں وہ معذور تھے اور اس لئے کسی سزا کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ طبقہ اپنے دل کا کبیٹ اس قسم کی باتیں کہہ کر ظاہر کرتا ہے کہ (۱) فساد کی پہل مسلمانوں نے کی تھی۔ (۲) مسلمان پاکستان دوست ہیں۔ (۳) مسلمان قومی دھارے سے الگ ہیں۔ اور کسی کی دلیل یہ ہے کہ ان کا پرسنل لا الگ ہے۔ (۴) جب تک وہ ہندو کلچر اور تہذیب اختیار نہیں کریں گے وہ ملک کے شہری نہیں ہو سکتے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ وہ عام باتیں ہیں جن کو اس طبقہ کے افراد ہر بڑے فساد کے بعد تحریروں اور تقریروں میں برملا کہہ کے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکتے اور اس طرح خود اپنی شرافت کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ احمد آباد اور گجرا .... جس نے گزشتہ تمام فسادوں کا ریکارڈ توڑ دیا۔ اس کے بعد دنیا نے بڑی حسرت اور تعجب سے دیکھا کہ اس مرتبہ اس ننگِ انسانیت طبقہ کی ہم نوائی کا شرف بھودان تحریک کے ایک عظیم لیڈر کو بھی حاصل
~~~~~~~~~~

تھا۔ جس کو پاکستان تک میں انصاف پسند کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ غور کیجئے تو اس کا سبب بجز اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ فسادات کے تسلسل اور ان کی یکسانیت نے ہندوستانی سماج کے ضمیر کو بے حس اور بے جان اس حد تک کر دیا ہے کہ ایک خاص اقلیت کے ساتھ اب ظلم ظلم نہیں رہا۔ بلکہ لڑکوں کا کھیل بن گیا ہے۔

~~~~~~

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے کہ وہی چھوٹے چھوٹے واقعات جن کی بہ قول شخصے ابتدا مسلمانوں کی طرف سے ہوتی ہے اور جو فساد کا باعث بنتے ہیں۔ یہ بلکہ ان سے بھی بڑے بڑے واقعات ہندوؤں میں آپس میں یا ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ واقعات افراد و اشخاص تک محدود رہتے ہیں۔ اور فساد برپا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس کسی مسلمان کی طرف سے پتہ بھی کھڑکتا ہے تو فرقہ وارانہ فساد کا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیوں؟ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مختلف تاریخی اور سیاسی عوامل کے باعث ملک کی تقسیم کے وقت مسلمانوں کے متعلق ہندو سماج کا جو عام ذہن تھا۔ آزادی کے بعد اس کی اصلاح کی کوئی ذرا سی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ اور نہ صرف یہ کہ کوشش نہیں کی گئی، بلکہ ایک طبقہ کیطرف سے جو مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے فسطائی رجحانات رکھتا تھا۔ ہندو سماج کے اس عام ذہن کو مسموم سے مسموم تر کرنے کی باقاعدہ اور مثبت مہم چلائی گئی۔ اس سلسلہ میں نصابِ تعلیم کے ذریعہ بچوں کے ذہن کو متاثر کیا گیا۔ نیم فوجی تنظیمات کے ذریعہ نوجوانوں کے دماغ میں اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب کے خلاف نفرت اور عناد کے زہریلے جراثیم پیدا کئے گئے۔ اور اخبارات و رسائل میں غلط سلط تاریخی واقعات کا حوالہ دیکر عام لوگوں میں ملک کی اس عظیم اقلیت کے خلاف بددلی، بیزاری اور استخفاف کے جذبات ابھارے گئے۔ ظاہر ہے ہندوؤں میں ایک عظیم اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے
~~~~~~

جو اس جارحیت پسند طبقہ کے ہم نوا اور ہم خیال نہیں ہیں۔ لیکن جب کسی ایک خاص فرقہ کے متعلق ایک طبقہ کی طرف سے مسلسل بائیس برس تک نہایت منظم طریقہ سے اور اشاعت و تبلیغ کے تمام جدید وسائل و ذرائع کی مدد سے ایک بات جو خواہ فی نفسہٖ کتنی غلط او بے بنیاد ہو، یکسانیت اور پوری طاقت و قوت سے کہی جاتی رہی ہو تو انسان بہرحال انسان ہے اچھے اچھے سنجیدہ فکر لوگوں کا بھی کسی نہ کسی حد تک اس سے متاثر ہو جانا لازمی ہے۔ اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملک کی سیاسی جماعتوں کے باہمی فکری و نظری اختلافات کے باوجود جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہندو سماج کا عام ذہن ان کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ اور وہ نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمانوں کو ہندوستانی قومیت کا جز تسلیم نہیں کرتا۔

~~~~~~~~

اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے مولانا محمد حفظ الرحمن کو۔ ایک مرتبہ بریلی کے ایک عظیم الشان مجمع میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے بڑی صفائی اور قوت سے کہا تھا کہ لوگ متحدہ قومیت کی بات کرتے ہیں۔ یہ ہے کہاں؟ میں تو متحدہ قومیت اس دن سمجھوں گا جب کہ ایک مسلمان بھرے بازار میں ایک ہندو کے چپت مارے اور پھر ہندو مسلم فساد نہ ہو۔

~~~~~~~~

بہرحال یہ ہے مسلمانوں کے متعلق ایک عام ہندو سماج کا مشتبہ اور ناصاف ذہن اور ذہنیت جس کی آڑ میں فتنہ پرور اور فساد پسند لوگوں کو جہاں کوئی جھوٹا یا سچا بہانہ ملا اپنی من مانی کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور یہی وہ ذہن ہے جس کے باعث اکثریت کے امن پسند حضرات اور پولیس اور حکام اپنے وہ فرائض انجام نہیں دیتے جو اس قسم کے موقع پر انہیں انجام دینے چاہئیں۔ بازار میں چند آدمی "چور چور" کا شور مچا کر کسی ایک شخص کو پکڑ کر زد و کوب کرنے لگیں تو کوئی اس کی مدد کو نہیں پہنچتا۔ اور جو لوگ اس کا یقین رکھتے ہیں کہ کسی شخص کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا حق نہیں ہے۔ وہ بھی ایک نگاہ غلط انداز سے "چور" کے پٹنے کا تماشہ

دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہہ کر اپنی دکانوں پر بیٹھے رہ جاتے ہیں کہ "اسے مارو مت اسے تھانہ لے جاکر پولس کے حوالے کردو" کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی ملک کے سماج میں آج مسلمانوں کی مثال اسی "چور" کی سی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے متعلق ہندو سماج کے اس عام ذہن اور ذہنیت کی تعمیر میں کچھ تھوڑا بہت دخل خود مسلمانوں کا بھی ہے۔ تقسیم کے بعد ان پر خوف و ہراس اور مایوسی و ناکامی کے احساس کا غلبہ ہوا، تو انہوں نے آنکھیں بند کر کے ملک کی سب سے بڑی اور با اقتدار سیاسی جماعت سے اپنی تمام امیدیں اور تمنائیں وابستہ کرلیں۔ اور اس کے سہارے جینے کی قسم کھاکر بیٹھ رہے۔ خود حریتِ فکر اور خود اعتمادی کے ساتھ انہوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ اب جب کہ ملک کے زمین و آسمان بدل گئے ہیں اور ملک جمہوریت اور سیکولرزم کے اس دور میں آزادی کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ انہیں اپنی تعمیرِ نو کے لئے کیا کچھ کرنا ہے۔ اور کس طرح کرنا ہے، ملک کو آزاد ہوئے ایک ربع صدی ہونے کو آئی، لیکن نہایت افسوس اور بڑے دکھ کی بات ہے کہ آج تک مسلمانوں نے کل ہند سطح پر کوئی کام ایسا نہیں کیا جس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکے کہ اس ملک کی ایک عظیم اقلیت نے وقت کی آواز کو سن لیا ہے اور وہ ایک انقلابی فکر و ذہن کے ساتھ مثبت جد و جہد اور عمل کے میدان میں گامزن ہوگئی ہیں۔ فآھا ثم آھا ثم آھا۔

مسلمانوں نے کبھی اس حقیقت کو محسوس نہیں کیا کہ جس قوم کو اپنے پرانے کھنڈروں پر تعمیرِ نو کا اہتمام کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور مقدم شرط تین چیزیں ہیں۔ ایک اجتماعی یک جہتی اور یگانگت۔ دوسری صبر، مگر وہ صبر نہیں جو اضطراری ہو۔ بلکہ اختیاری اور مایوسی کے ساتھ نہیں۔ بلکہ عزم و ہمت اور حوصلہ کے ساتھ اور تیسری چیز ہے

ضبط نفس (Self Control) جن لوگوں کو اپنی تعمیر کرنی ہوتی ہے وہ کسی کے لعن طعن اور حرف گیری کی پروا بالکل نہیں کرتے۔ اور خاموشی سے مگر ہمت و استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ آخر ایک وقت آتا ہے۔ جب کہ ان کو اپنے تعمیری منصوبہ میں کامیابی ہوتی ہے اور اب ان کے بڑے سے بڑے مخالف اور نکتہ چین بھی انکے مداح اور قدردان بن جاتے ہیں۔ تاریخ کے اوراقِ پارینہ کو کھنگالنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے زمانہ میں جرمنی اور جاپان اسرائیل اور خود اس ملک کے عیسائیوں اور سکھوں کی مثال سبق آموزی کے لئے کافی ہے۔

~~~~~~~~

آجکل ہر شخص پوچھتا اور غور کر رہا ہے کہ ان فسادات کی جڑ کہاں ہے ؟ ہم نے ابھی بتایا کہ ان کی جڑ مسلمانوں کے متعلق ہندو سماج کا یہ ذہن اور ذہنیت ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا یہ ذہنیت جس مادہ سے بنی ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی دو چیزیں ہیں، ان میں سے ایک کا تعلق حکومت اور اکثریت کے ساتھ ہے۔ اور دوسری کا خود مسلمانوں کے ساتھ۔ جہانتک حکومت اور اکثریت کا تعلق ہے ابھی حال میں نئی دہلی میں قومی یک جہتی کونسل کی مجلس قائمہ کی جو میٹنگ ہوئی تھی اور اس میں جن سنگھ سے قطع نظر وزیر اعظم، وزیر داخلہ اور دوسری جماعتوں کے نمائندوں کا جو رول رہا۔ اور پھر جو تجویز منظور ہوئی ہے۔ اس کو دیکھ کر توقع ہوتی ہے کہ شاید حد سے گزر کر درد کے دوا ہو جانے کا وقت آپہنچا ہے۔ بہرحال قافلہ نے اپنی سمت صحیح متعین کرلی ہے۔ اب یہ سفر کب شروع ہوتا ہے اور کیوں کر اس کی تکمیل ہوگی ؟ اس کا جواب مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ اب رہا دوسرا جز جس کا تعلق مسلمانوں کی اپنی ذات سے ہے تو اس کے لئے اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب کہ ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید جیسی کوئی صحیح لیڈرشپ اور قیادت پیدا ہو۔
~~~~~~~~

ریڈیو پر رویت ہلال کی خبر

مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ

عرصہ سے ریڈیو پر رویتِ ہلال کی خبر کا مسئلہ اہلِ علم کے سامنے پیش ہے۔ لیکن اب تک نہ کوئی اجتماعی فیصلہ ہو سکا اور نہ عوامی خلفشار سے بچنے کی کوئی صورت نکل سکی۔ ذیل میں اس سلسلہ کی چند باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔ شاید وہ کچھ مفید ثابت ہوں۔

خبر کی صحیح حیثیت متعین کرنیکا حکم: قرآن حکیم کی بعض آیتوں سے خبر کی صحیح حیثیت متعین کرنیکا ثبوت ملتا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا[۱]	اے ایمان والو! اگر فاسق (غیر ثقہ) تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔

آیت میں فاسق (غیر ثقہ) اور نباء (خبر) دونوں عام ہیں۔

ای فاسق جاء کم بای نباء[۲]	یعنی جو فاسق جس قسم کی خبر لائے (اسکی تحقیق کر لیا کرو)

[۱] سورہ حجرات رکوع ۱

[۲] تفسیر کبیر ج۳ صفحہ ۵۹۰

دوسری آیت ہے:

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ	اور جب ان کے پاس کوئی بات امن یا خوف
اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ وَلَوْ رَدُّوْہُ	کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں اگر
اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ	یہ لوگ اس کو اللہ کے رسولؐ اور اہلِ علم کے
مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ	حوالہ کر دیتے تو ان میں جو تحقیق کرنے والے
یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ [1]	ہیں وہ اس کی تحقیق کر لیتے۔

"اولی الامر" سے مراد اہل علم و صاحب فقہ ہیں۔" اہل العلم والفقہ" [2] اور "جاءھم امر" میں لفظ امر (بات) ہر حادثہ و شرعی واقعہ کو شامل ہے۔

لان الامن والخوف حاصرٌ	کیوں کہ امن اور خوف ہر اس چیز میں موجود
فی کل مایتعلق بباب التکلیف [3]	ہے جس کا تعلق باب تکلیف سے ہے۔

مذکورہ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل علم دونوں خبر کی تحقیق اور اس کی صحیح حیثیت متعین کرنے پر مامور ہیں۔

ان الرسولؐ واولی الامر	رسول اللہ اور اہلِ علم دونوں استنباط کے
کلھم مکلفون بالاستنباط [4]	مکلف ہیں۔

صحیح حیثیت کے تعین کیلئے غلبۂ ظن کافی ہے: کسی خبر کی صحیح حیثیت کا تعین اس وقت ہوتا ہے جبکہ تحقیق کے بعد اس سے غلبۂ ظن حاصل ہو جائے۔ جیسا کہ فقہاء کی درج ذیل تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے۔

وغالب الظن عندھم ملحق	فقہاء کے نزدیک غلبۂ ظن یقین کا حکم رکھتا ہے
بالیقین وھو الذی یبنی علیہ	اسی پر شرعی احکام کا مدار ہے۔
الاحکام [5]	

---

[1] سورہ نساء رکوع ۱۱ ۔ [2] قرطبی۔ [3] تفسیر کبیر ج ۳ ص ۴۰۱ [4] ایضاً

[5] الاشباہ والنظائر ص ۳

دوسری جگہ ہے۔

یعرف ذلک من تفحص کلامھم فی الابواب [1]	یہ بات مختلف ابواب میں تلاش وجستجو سے معلوم ہوتی ہے۔

ابن عابدین کہتے ہیں:

یقع العلم الشرعی وھو غلبۃ الظن بخبرھم [2]	ان کی خبر سے علم شرعی یعنی غلبہ ظن حاصل ہوجائے۔

پھر اسکے بعد ہے:

لانہ العلم الموجب للعمل لا العلم بمعنی الیقین [3]	کیوں کہ غلبہ ظن ہی وہ علم ہے جس سے عمل کا وجوب ہوتا ہے۔ علم شرعی سے مراد اس جگہ یقین نہیں ہے۔

غلبہ ظن وہی معتبر ہے جس سے اطمینان قلب حاصل ہوجائے۔	غلبہ ظن اس وقت احکام کا مدار قرار پاتا ہے۔ جب کہ اس سے اطمینان قلب حاصل ہوجائے۔

امّا اکبر الرائی وغلبۃ الظن الطرف الراجح اذا اخذ بہ وھو المعتبر عند الفقہاء [4]	اکبر رائے اور غلبہ ظن کسی ایک جانب رجحان کو کہتے ہیں۔ جب کہ اس کو دل قبول کرے۔ فقہاء کے نزدیک یہی معتبر ہے۔

چند فقہی جزئیات جن سے ریڈیو پر خبر کی صحیح حیثیت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے	ذیل میں چند فقہی جزئیات ذکر کی جاتی ہیں جن سے ریڈیو پر خبر کی صحیح حیثیت متعین کرنے میں مدد

---

[1] الاشباہ والنظائر ص۳۷ [2،3] ردالمحتار ج۲ کتاب الصوم ص۹۵

[4] الاشباہ والنظائر ص۳۷

ملتی ہے۔

(۱) سرکاری طور پر جس خبر کے پہنچانے کا انتظام ہو اس کے منادی کی خبر مستند ہے۔ خواہ وہ ثقہ ہو یا غیر ثقہ ہو۔

خبر منادی السلطان مقبول عدلاً کان او فاسقاً [۱]	بادشاہ (حکومت) کے منادی کی خبر معتبر ہے، خواہ وہ ثقہ ہو یا غیر ثقہ۔

(۲) شہادت کے ذریعہ جس بات کا فیصلہ ہو چکا ہو اس میں فرد واحد کی خبر معتبر ہے۔

ولا خلاف فی ان الحکم الثابت بالشہادۃ یجزی فیہ خبر الواحد [۲]	اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس کا فیصلہ شہادت سے ہو چکا ہے۔ اس کے اعتبار کے لئے خبر واحد کافی ہے۔

(۳) سرکاری وغیر سرکاری طور پر خبر کی قائمقامی کے لئے عادۃً کچھ علامتیں طے کر لی گئی ہوں تو ان کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔

یلزم اهل القری الصوم بسماع المدافع او رؤیۃ القنادیل من المصر لانہ علامۃ ظاہرۃ تفید غلبۃ الظن وغلبۃ الظن حجۃ موجبۃ للعمل [۳]	توپ کی آواز یا روشنی دیکھنے سے گاؤں والوں پر روزہ رکھنا ضروری ہے کیوں کہ یہ ظاہری علامتیں غلبۂ ظن کا فائدہ دیتی ہیں۔ اور غلبۂ ظن ایسی حجت ہے جس سے عمل کا وجود ثابت ہوتا ہے

---

[۱] فتاویٰ عالمگیری ج ۶ کتاب الکراہیۃ ص ۲۷ [۲] احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۳۶

[۳] رد المختار ج ۲ کتاب الصوم

(۴) جس خبر کی مستند ثبوت (نہ کہ افواہوں) کی بنا پر عام شہرت ہو جائے۔ تو دوسرے شہر والوں کو اس کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔

ان الخبر اذا استفاض و تحقق فیما بین اهل البلدة الاخری یلزمهم حکم هذه البلدة [1]	خبر جب شہر کے لوگوں میں مشہور اور ثابت ہو جائے ـــــ تو اس شہر کا حکم دوسرے شہر کے لوگوں پر لازم ہوگا۔

(۵) آسمان صاف ہونے کی صورت میں بھی ایک روایت کے مطابق دو آدمیوں کی شہادت کافی ہے۔ جب کہ ایسی حالت میں دوسری روایت کے مطابق شہادت کے لئے ایک جماعت یا ایسی تعداد ضروری ہے کہ اس کی خبر سے غلبۂ ظن حاصل ہو جائے۔

جیسا کہ سرخسیؒ کہتے ہیں۔

اما اذا لم یکن بالسماء علة فلا تقبل شهادة الواحد والمثنی حتی یکون امراً مشهوراً ظاهراً فی هلال رمضان وهکذا فی هلال الفطر فی روایة هذا الکتاب وفی روایة الحسن عن ابی حنیفة رحمهما الله تعالی قال تقبل فیه شهادة رجلین	جب آسمان میں ابر وغیرہ نہ ہو تو ایک دو آدمیوں کی شہادت قبول نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ بات مشہور ہو جائے۔ رمضان و عید دونوں کے لئے یکساں حکم ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے محمدؒ کی یہی روایت ہے۔ لیکن حسنؒ کی روایت امام ابوحنیفہ سے یہ ہے کہ ایسی صورت میں بھی دو مردوں یا ایک مرد اور

---

[1] ردالمحتار، ج۲ کتاب الصوم ص۹۲

او رجل وامرأتين بمنزلة حقوق العباد [1] — دو عورتوں کی شہادت قبول ہوگی جیسے حقوق العباد میں ہوتا ہے۔

در مختار میں ہے۔

وبلا علة جمع عظيم يقع العلم الشرعي وهو غلبة الظن بخبرهم...... وعن الامام انه يكتفي بشاهدين [2] — ابر وغیرہ نہ ہونے کی صورت میں شہادت کے لئے ایک بڑی جماعت درکار ہے۔ جس کی خبر سے علم شرعی یعنی غلبہ ظن حاصل ہو جائے۔ اور امام ابوحنیفہ سے ایک روایت ہے کہ ایسی حالت میں بھی دو گواہوں کی شہادت کافی ہے۔

ابن نجیمؒ نے اس روایت کے بارے میں کہا ہے۔

وينبغي العمل على هذه الرواية في زماننا لان الناس تكاسلت عن ترائي الاهلة [3] — ہمارے زمانہ میں اس روایت پر عمل مناسب ہے کیوں کہ چاند دیکھنے میں لوگ سستی کرنے لگے ہیں۔

ابن عابدینؒ نے کہا ہے۔

انت خبير بان كثيراً من الاحكام تغيرت لتغير الازمان ولو اشترط في زماننا الجمع العظيم لزم — تم جانتے ہو کہ بہت سے احکام زمانہ کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ اگر ہمارے زمانہ میں شہادت کے لئے بڑی جماعت شرط ہو تو لوگ دو دو

---

[1] المبسوط للسرخسی ج کتاب نوادر الصوم ص ۱۴۰
[2] در مختار کتاب الصوم ص ۱۴۸
[3] ابن عابدین رد المحتار ج کتاب الصوم ص ۹۷

ان لا یصوم الناس الا بعد لیلتین او ثلاث لما ہو مشاہد من تکاسل الناس ؎۱	تین تین دن بعد تک روزہ نہ رکھیں گے۔ کیوں کہ اس سلسلہ میں لوگوں کی سستی عام طور سے دیکھی جا رہی ہے۔

(۶) اسی طرح آسمان صاف ہونے کی صورت میں شہر سے باہر رہنے والے یا شہر میں کسی اونچی جگہ سے چاند دیکھنے والے ایک شخص کی شہادت معتبر ہوگی چنانچہ امام طحاویؒ کا یہ قول تقریباً فقہ کی تمام بڑی کتابوں میں مذکور ہے۔ مثلاً ہدایہ میں ہے۔

وذکر الطحاوی انہ تقبل شہادۃ الواحد اذا جاء من خارج المصر لقلۃ الموانع والیہ الاشارۃ فی کتاب الاستحسان وکذا اذا کان علی مکان مرتفع فی المصر ؎۲	طحاوی نے ذکر کیا ہے کہ ایک کی شہادت قبول ہوگی جب کہ وہ شہر کے باہر سے آیا ہو۔ کیونکہ وہاں رکاوٹیں کم پائی جاتی ہیں۔ کتاب الاستحسان میں اسی کی طرف اشارہ ہے ایسے ہی ایک شہادت قبول ہوگی۔ جبکہ شہر میں کسی اونچی جگہ کا رہنے والا ہو۔

فتاوی عالمگیری میں یہ عبارت نقل کرنے کے بعد ہے۔

وعلی قول الطحاوی اعتمد الامام المرغینانی وصاحب الاقضیۃ والفتاوی الصغری ؎۳	طحاوی کے قول پر امام مرغینانیؒ اور صاحب اقضیۃ وفتاوی صغری نے اعتماد کیا ہے۔

؎۱ رد المحتار ج۲ کتاب الصوم ص۹۷ ؎۲ ہدایہ کتاب الصوم ؎۳ فتاوی عالمگیری ج۱ کتاب الصوم فی رویتہ الہلال

اس قول کی المبسوط میں یہ دلیل منقول ہے۔

لانہ یتفق من الرؤیۃ فی الصحاری مالا یتفق فی الامصار لما فیھا من کثرۃ الغبار وکذلک ان کان فی المصر علی موضع مرتفع فقد یتفق لہ من الرؤیۃ مالا یتفق لمن ھو دونہ فی الموقف لہ	شہر میں چوں کہ غبار وغیرہ زیادہ رہتا ہے۔ اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ باہر چاند نظر آئے اور شہر میں نہ نظر آئے اسی طرح اونچی جگہ سے چاند دیکھنا جسقدر آسان ہوتا ہے نیچی جگہ سے اسس قدر آسان نہیں ہوتا۔

سطح زمین سے آنکھ کی اونچائی کا تناسب افقِ حسی (جہاں آسمان وزمین دونوں ملتے نظر آتے ہیں) سے یہ ہے۔

آنکھ کی اونچائی	فاصلہ افق حسی
۶ فٹ	۳ میل
۲۴ فٹ	۶ میل
۹۶ فٹ	۱۲ میل
۳۸۴ فٹ	۲۴ میل

یعنی آنکھ کی اونچائی میں جب چار گنا فاصلہ ہوگا تو افقِ حسی میں دوگنا ہوتا رہے گا۔

اس کا فارمولا یہ ہے۔

جتنے میں اونچا دیکھنا ہو اس عدد کو ۳ سے تقسیم کیا جائے۔ پھر حاصل تقسیم کو حاصل تقسیم میں ضرب دیا جائے

لہ المبسوط ج کتاب الاستحسان ص ۱۶۹

پھر حاصل ضرب کو ۶ میں ضرب دیا جائے۔ اب جو حاصل ضرب ہوگا، اتنی ہی فٹوں میں آنکھ کی اونچائی ہوگی۔

مثلاً کوئی شخص دس میل تک دیکھنا چاہے تو دس کو ۳ سے تقسیم کرنے کے بعد $\frac{۱۰}{۳}$ آیا پھر $\frac{۱۰}{۳}$ کا مربع کیا تو $\frac{۱۰}{۳} \times \frac{۱۰}{۳} = \frac{۱۰۰}{۹}$ ہوا۔ پھر $\frac{۱۰۰}{۹}$ سے ۶ کو ضرب دیا تو $\frac{۲۰۰}{۳}$ آیا۔ جو ۶۷ فٹ کے برابر ہے۔ یعنی دس میل تک دیکھنے کے لئے آنکھ کی اونچائی ۶۷ فٹ ہونی چاہئے۔

(۷) ایک شخص کی شہادت پر رمضان کے روزے رکھے گئے تھے لیکن کسی وجہ سے ۳۰ تاریخ کو عید کا چاند نہ نظر آیا، تو دوسرے دن (چاند دیکھے بغیر) عید کرنے کی اجازت ہے۔ اس صورت میں بہ ظاہر چاند کا ثبوت ایک شخص کی شہادت کی بنا پر ہو رہا ہے جبکہ عید میں ایک شخص کی شہادت پر فیصلہ کرنا درست نہیں ہے۔ چنانچہ امام محمد سے جب یہ سوال کیا گیا تو انہوں نے درج ذیل توجیہ پیش کی۔

کیف یفطرون بشہادۃ الواحد قال لا یفطرون بشہادۃ الواحد بل بحکم الحاکم لانہ لما حکم بدخول رمضان وامر الناس بالصوم فمن ضرورتہ الحکم بانسلاخ رمضان بعد مضی ثلاثین یوما [۱]	سوال کیا گیا کہ لوگ ایک شخص کی شہادت سے پھر کیسے افطار کریں گے تو امام محمدؒ نے جواب دیا کہ افطار ایک شخص کی شہادت سے نہیں بلکہ حاکم کے حکم سے کریں گے کیوں کہ جب حاکم نے روزہ کا حکم دیا تو لازمی طور سے تیس ۳۰ دن گزرنے کے بعد اس کے ختم کرنے کا بھی حکم نکل آئے گا۔

---

[۱] المبسوط ج۳ کتاب الصوم ص۱۲۰

ریڈیو کی خبر پر غور کرنے کے لئے چند پہلو ان تصریحات کے بعد "ریڈیو" کی خبر میں چند حیثیتوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) "ریڈیو" ایک نئی ایجاد اور خبر رسانی کا آلہ ہے۔ قدیم زمانہ میں خبر رسانی کا کام دوسرے ذرائع (منادی سلطان وغیرہ) سے انجام پاتا تھا۔ اور اب ترقی یافتہ دور میں اونچے پیمانہ پر اس کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔

(۲) "ریڈیو" رویتِ ہلال کی جس خبر کو نشر کرتا ہے۔ اس کی حیثیت شہادت کی نہیں، بلکہ اطلاع کی ہوتی ہے جس طرح اور بہت سی باتوں کی وہ عوام کو اطلاع دیتا ہے۔ اسی طرح چاند ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔

(۳) "ریڈیو" پر چاند کی جو اطلاع آتی ہے اس کے بارے میں اب تک یہ عمل درآمد چلا آ رہا ہے کہ پہلے شہر کے معتمد عالم یا جامع مسجد کے پیش امام سے چاند ہونے یا نہ ہونے کے متعلق معلوم کیا جاتا ہے۔ پھر جیسا وہ کہتے ہیں اس کے مطابق خبر نشر کی جاتی ہے

عالم و پیش امام چاند ہونے کے بارے میں جو بات کہتے ہیں اس کا مدار عام رویت ہوتی ہے یا وہ فیصلہ ہوتا ہے جو شہادت گزرنے کے بعد کیا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے ریڈیو کی اطلاع گویا عام رویت یا فیصلہ کی اطلاع ہوتی ہے۔

(۴) "ریڈیو" کی خبروں کے اعتبار کا عام رواج (عرف) ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ جن خبروں کا تعلق حکومت کی خاص پالیسی سے ہو اور جب کی صحیح اطلاع وہ مناسب نہ سمجھتی ہو۔ وہ عموم سے مستثنیٰ ہیں۔

(۵) "ریڈیو" پر دینی خبروں کا شریعت کے مطابق اہتمام نہ ہونے کے باوجود ان خبروں سے غلبہ ظن حاصل ہو جاتا ہے۔ اور غلبہ ظن کے بارے میں یہ وسعت ہے کہ اگر ان لوگوں کی خبروں سے بھی حاصل ہو جائے جن کی شہادت عام حالات میں معتبر نہیں ہے تو دینی امور میں اس پر عمل کرنا درست ہے جیسا کہ ردالمحتار میں ہے۔

واما غیر مقبول الشهادة كالكافر والفاسق والصبي فلعدم الاعتداد بالخبارة فيما هو من امور الديانات مالم يغلب على الظن صدقة [1]	جن لوگوں کی شہادت غیر معتبر ہے جیسے کافر، فاسق، بچہ ان کی خبر پر دینی معاملات میں اس وقت تک اعتبار نہ کیا جائیگا۔ جب تک ان کی سچائی پر غلبہ ظن نہ حاصل ہو۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

يجب ان يعلم بان العمل بغالب الراي جائزة في باب الديانات وفي باب المعاملات وكذا العمل بغالب الراي في الدماء جائزة [2]	یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ دیانات، معاملات اور خون سب میں غالب رائے پر عمل کرنا جائز ہے۔

غلبہ ظن دو یا تین خبروں سے حاصل ہو جاتا ہے۔ غلبہ ظن (اطمینان قلب) ایک وجدانی امر ہے۔ جو خبر دینے والوں کی کثرت اور خبر دینے کی خاص طرز پر موقوف نہیں ہے۔ چنانچہ بسا اوقات جم غفیر کی خبر اور مقفع و مسجع عبارت ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ لیکن ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ساتھ دو ایک آدمیوں کی خبر قابل اعتبار بن جاتی ہے۔

ایسی حالت میں "ریڈیو" کی خبر سے غلبہ ظن حاصل ہونے کے لئے خبر کی تعداد اور اس کے

---

[1] رد المحتار ج باب شروط الصلوٰۃ ص ۴۴۸ [2] فتاوی عالمگیری ج کتاب الکراہیۃ الباب الثانی فی العمل بہ غالب الرای۔

الفاظ کی حد بندی نہایت مشکل امر ہے۔ پھر بھی عموماً ابر کی صورت میں دو اور آسمان صاف ہونے کی صورت میں تین خبروں سے غلبۂ ظن حاصل ہو جاتا ہے۔ خواہ یہ خبریں مختلف ریڈیو اسٹیشن کی ہوں یا ایک اسٹیشن سے کسی جگہ کی ہوں۔ البتہ اس صورت میں چاند کا ثبوت محض ان خبروں سے نہیں بلکہ اس فیصلہ سے سمجھا جائیگا، جو علماء ان خبروں سے غلبۂ ظن حاصل ہونے کے بعد کریں گے۔

امام محمدؒ نے مذکورہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے حاکم کے حکم کو فیصلہ کی بنیاد قرار دیا تھا۔ اب چونکہ حاکم شرعی موجود نہیں ہیں اس بنا پر دینی معاملات میں علماء انکے قائم مقام ہوں گے۔ اور اگر علماء فیصلہ نہ کریں۔ تو عوام کو قانون ہاتھ میں لینے کا حق نہ ہوگا۔

اذا خلا الزمان من سلطان	جب کسی زمانہ میں ایسی حکومت
ذی کفایۃ فالامور موکلۃ	نہ رہے۔ جو دینی معاملات کی ذمہ داری
الی العلماء و یلزم الامۃ	لیتی ہو۔ تو یہ معاملات علماء کے سپرد
الرجوع الیھم [1]	ہونگے اور امت کو ان کیطرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

اختلافِ مطالع کی بحث بڑی پُر پیچ ہے

رویت ہلال کے سلسلہ میں اختلاف مطالع کی بحث کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بحث اس قدر پُر پیچ ہے کہ اس سے کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنا حد درجہ مشکل ہے۔ چنانچہ ابوریحان بیرونی (فن ہیئت کا ماہر) نے کہا ہے۔

ان علماء الھیئۃ مجمعون	علماء ہیئت اس بات پر متفق ہیں کہ
علی ان المقادیر المفروضۃ	رویت ہلال کے عمل میں آنے کے
فی اواخر اعمال رویۃ	لئے جو مقداریں فرض کی جاتی ہیں وہ

---

[1] الحدیقۃ المحمدیۃ

الهلال من ابعاد لم يوقف	سب محض تجرباتی ہیں اور مناظر کے
عليها الا بالتجربة للمناظر	کچھ حسابی حالات ہیں جن کی وجہ سے
احوال هندسية يتفاوت	نظر آنے والی چیز چھوٹی بڑی دکھائی
لاجلها المحسوس بالبصر	دیتی ہے۔
في العظم والصغر وفي الاحوال	فلکی حالات کچھ اس قسم کے ہیں
الفلكية ما اذا تاملها متامل	کہ جو بھی منصف مزاج ان میں غور
منصف لم يستطع بت الحكم	کرے گا وہ رویت ہلال کے ہونے
على وجوب رؤية الهلال	اور نہ ہونے کے بارے میں کوئی قطعی
او امتناعها [1]	فیصلہ نہ کر سکے گا۔

شمس الدین محمد بن علی خواجہ کا چالیس سالہ تجربہ اور دوسرے ماہرین کا فیصلہ یہ ہے۔

فلا سبيل الى التحقيق سوى	سوائے تخمین اور اندازہ کے کوئی یقینی
التخمين والتقريب [2]	بات نہیں کہی جاسکتی۔

چنانچہ پاکستان ۱۹۶۱ء میں کراچی کے محکمہ موسمیات نے ایک ہفتہ پہلے اعلان کیا کہ ۲۹ر رمضان جمعہ کے روز غروب آفتاب کے بعد چاند تقریباً اکیس منٹ افق پر دیکھا جاسکے گا۔ لیکن پنجاب یونیورسٹی کی رصد گاہ نے ۲۹ کو اعلان کیا کہ آج (جمعہ کے دن) ہلال کی روشنی اس قدر کم ہوگی کہ معمولی نگاہیں اس کو نہ دیکھ سکیں گی۔ [3]

اختلافِ مطالع اعتبار کرنے اور نہ کرنے کی صورتیں۔ اختلافِ مطالع کے سلسلے میں محققین

---

[1] الآثار الباقية عن القرون الخالية ص ۱۹۸　[2] کشف الظنون ج ۲ ص ۹۶۹

[3] ایوننگ اسٹار، ۱۷ مارچ ۱۹۶۱ء از رویت ہلال

فقہا اس بات سے متفق ہیں کہ قریب کے شہروں میں اس کا اعتبار نہ کیا جائے اور دور کے شہروں میں اعتبار کیا جائے لیکن قریب و بعید کے تعین میں فقہا کے درمیان شدید اختلاف ہے چنانچہ اس سلسلے کے اقوال درج ذیل ہیں

(۱) جس مسافت میں قصر کی جاتی ہے (۴۸ میل) وہ بعید ہے اور اس سے کم قریب ہے۔ [۱]

(۲) جس جگہ تک مطلع میں اتحاد ہے وہ قریب ہے اور جس جگہ سے مطلع بدل جائے وہ بعید ہے۔ [۲]

(۳) ایک ماہ یا اس سے زیادہ کی (پیدل چلنے کے لحاظ سے) مسافت (اندازہ ۴۸۰ میل شرعی) بعید ہے اور اس سے کم قریب ہے۔ [۳]

(۴) چوبیس فرسخ سے کم (تقریباً ۸۲ میل انگریزی اور ۷۲ میل شرعی) قریب ہے اور اس سے زیادہ بعید ہے۔ [۴]

(۵) خراساں و اندلس کے درمیان کا فاصلہ (تقریباً ۳ ہزار میل) بعید ہے اور اس سے کم قریب ہے۔ [۵]

(۶) مدینہ اور شام کے درمیان کا فاصلہ (تقریباً ۴ سو میل) بعید ہے اور اس سے کم قریب ہے۔ [۶]

(۷) مبتلی بہ جس کو قریب سمجھے وہ قریب ہے اور جس کو بعید سمجھے وہ بعید ہے۔ [۷]

(۸) ایک ملک کے تمام شہر آپس میں قریب ہیں۔ اور دوسرا ملک بعید ہے۔ [۸]

---

[۱] نووی شرح مسلم کتاب الصوم باب لکل بلد رویتہم۔ [۲] تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی باب ماجاء لکل اہل بلد رویتہم [۳] رد المحتار ج۲ کتاب الصوم مطلب فی اختلاف المطالع۔ [۴] ایضاً [۵] تحفۃ الاحوذی [۶] ترمذی کتاب الصوم حدیث کریب۔ [۷] العرف الشذی شرح ترمذی باب ماجاء ان الصوم لرویۃ الہلال والافطار لہ [۸] تحفۃ الاحوذی

(۹) اسلامی حکومت کے تمام شہر ایک شہر کے حکم میں ہیں۔ یعنی اگر خلیفۃ المسلمین شہادت کی بنا پر چاند تسلیم کرلے۔ تو اس کی مملکت کے تمام شہروں میں چاند تسلیم کرنا ضروری ہے۔ ؎۱

ایک دن فرق سے کم میں اختلاف کا اعتبار نہ ہوگا۔ (۱۰) کسی جگہ کی رویت دوسری جگہ تسلیم کرنے میں اگر ایک دن کا فرق لازم آئے تو اختلافِ مطلع کا اعتبار ہوگا۔ اور اس سے کم اختلاف کا اعتبار نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس صورت میں ۲۹ کے بجائے ۲۸ اور ۳۰ کے بجائے ۳۱ دن کا مہینہ ہوسکتا ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہینہ ۲۹ یا ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ ؎۲

یہ فرق اختلاف رویت کے لحاظ سے ہے ہیئت کے لحاظ سے نہیں ہے۔ ایک دن کا فرق عموماً حجاز، مصر، الجیریا، اسپین، فرانس، انگلستان، اور امریکہ وغیرہ ممالک میں پیش آتا ہے۔ یہ فرق اختلافِ رویت کے لحاظ سے ہے فنِ ہیئت کے لحاظ سے نہیں ہے۔ یعنی رویت ہلال میں مختلف مقامات پر ایک دن کا فاصلہ ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق بلاد کے طول و عرض سے ہے۔ جب کہ ہیئت کا طول و عرض سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ ہیئت کے لحاظ سے جب القمر الجدید "New Moon" ہوگیا تو وہ پوری دنیا کے لئے ہوا۔ اس کے متعین لمحہ میں کسی جگہ کوئی فرق نہ ہوگا۔ البتہ اس لمحہ میں دنیا کی گھڑیوں کے اوقات ضرور مختلف ہوں گے۔

ہیئت کے لحاظ سے القمر الجدید اس وقت ہوتا ہے جب کہ سورج اور چاند (نیرین) کی تقویموں میں صرف صفر کا فرق ہو۔ (مزید تحقیق و تفصیل کے لئے فنِ ہیئت کا مطالعہ ضروری ہے۔

؎۱ تحفۃ الاحوذی ؎۲ فتح الملہم شرح مسلم باب بیان ان لکل بلد رؤیتہم۔

ایک دن سے کم فرق والے ممالک میں ایک دن عید کرنے کی گنجائش۔ رویت کے لحاظ سے (ریڈیو کی خبر سے فیصلہ کی صورت میں) ان سب ممالک میں ایک دن عید کرنے کی گنجائش نکلی جن میں ایک دن کا فرق نہیں لازم آتا۔ چناں چہ ہندوستان و پاکستان میں چونکہ ایک دن کا فرق نہیں ہے اس بنا پر دونوں جگہ عید ایک دن کی جاسکتی ہے۔

ہندوپاک کے اوقات میں فرق کا نقشہ ہندوپاک کے مختلف شہروں کے اوقات میں فرق کی تفصیل یہ ہے:

چٹاگانگ میں نصف النہار (زوال) کے وقت ۱۲ بجے ہیں تو مندرجہ ذیل شہروں میں زوال کے وقت چٹاگانگ کی گھڑی میں درجہ ذیل اوقات ہوں گے

ڈھاکہ میں زوال	۱۲ بجکر ۶ منٹ	۶ منٹ بعد
کلکتہ 〃 〃	۱۲ بجکر ۱۴ 〃	۱۴ 〃 〃
پٹنہ 〃 〃	۱۲ بجکر ۲۷ 〃	۲۷ 〃 〃
بنارس 〃 〃	۱۲ بجکر ۳۵½ 〃	۳۵½ 〃 〃
الٰہ آباد 〃 〃	۱۲ بجکر ۴۰ 〃	۴۰ 〃 〃
لکھنؤ 〃 〃	۱۲ بجکر ۴۴ 〃	۴۴ 〃 〃
کانپور 〃 〃	۱۲ بجکر ۴۶ 〃	۴۶ 〃 〃
مدراس 〃 〃	۱۲ بجکر ۴۶½ 〃	۴۶½ 〃 〃
حیدرآباد 〃 〃	۱۲ بجکر ۵۳½ 〃	۵۳½ 〃 〃
دہلی 〃 〃	۱۲ بجکر ۵۸½ 〃	۵۸½ 〃 〃
لاہور 〃 〃	۱ بجکر ۱۰½ 〃	۷۰½ 〃 〃
بمبئی 〃 〃	۱ بجکر ۱۶½ 〃	۷۶½ 〃 〃
کراچی 〃 〃	۱ بجکر ۳۹½ 〃	۹۹½ 〃 〃

جس وقت کراچی میں زوال کا وقت ہوگا۔ اس وقت چاٹگانگ کی گھڑی میں ۱ بجکر ۳۹½ منٹ ہوں گے۔ یعنی کراچی میں چاٹگانگ سے ۹۹½ منٹ بعد زوال ہوگا۔ اس طرح ڈھاکہ و کراچی میں ایک گھنٹہ ۳۴ منٹ کا فرق ہوتا ہے۔

چاند کے ثبوت میں عام فقہا کے نزدیک ہئیت کا اعتبار نہیں ہے۔ اگر ایک ہی عرض البلد میں کوئی دو شہر ہیں۔ تو مذکورہ فرق طلوع و غروب میں بھی ہوگا۔ ورنہ جیسا عرض البلد میں فرق ہوگا۔ اس کے لحاظ سے اختلاف ہوگا۔

ہئیت کے لحاظ سے اگرچہ ساری دنیا میں ایک دن عید منائی جاسکتی ہے۔ لیکن عام فقہا اس کو درست تسلیم نہیں کرتے۔

واتفق الائمۃ الاربعۃ علی انہ لا اعتبار بمعرفۃ الحساب والمنازل [۱]

چاروں اماموں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ چاند کے ثبوت میں حساب اور منازل کا اعتبار نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے:

ولا عبرۃ بقول الموقتین [۲]

چاند کا وقت بتانے والوں کے قول کا اعتبار نہیں ہے۔

البتہ امام سبکیؒ شافعی کے بارے میں ہے۔

وللامام السبکی الشافعی تالیف مال فیہ الی اعتماد قولھم [۳]

امام سبکیؒ شافعی کی ایک تصنیف ہے جس میں ان کا رجحان موقتین کے قول پر اعتماد کی جانب ہے۔

اسی طرح ابن شریح کے بارے میں ہے۔

---

[۱] کتاب المیزان للشعرانی الجزء الاول کتاب الصیام [۲] رد المحتار ج مطلب ولا عبرۃ بقول الموقتین۔ [۳] رد المحتار۔

الّا فی وجہ عن ابن شریح بالنسبۃ الی العارف بالحساب[۱]　　ماہرین فن کی بات ماننے کے لئے ابن شریح کی جانب منسوب (عام فقہا کے خلاف) ایک وجہ ہے۔

لیکن محققین فقہاء نے ان لوگوں کے خیالات کی تردید کی ہے[۲]

امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کی توجیہہ

امام ابو حنیفہ کے نزدیک چوں کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں ہے اس بناء پر کسی حصہ میں بھی رویت ہونے سے ساری دنیا میں (بہ شرط شرعی ثبوت) عید منائی جا سکتی ہے۔

ولا عبرۃ لاختلاف المطالع فی ظاہر الروایۃ[۳]　　ظاہر الروایۃ میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

حتی لو رُئی فی المشرق لیلۃ الجمعۃ وفی المغرب لیلۃ السبت وجب علی اہل المغرب العمل بما رآہ اہل المشرق[۴]　　یہاں تک کہ اگر چاند مشرق میں جمعہ کی رات اور مغرب میں سنیچر کی رات کو دیکھا گیا تو مغرب والوں پر مشرق کے لوگوں کے مطابق عمل واجب ہے۔

امام صاحب کا یہ مسلک رویت کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ البتہ ہیئت کے لحاظ سے صحیح ہے جسکا انکے نزدیک اعتبار ثابت نہیں ہے ـــ ظاہر حالت میں اس مسلک کی صرف ایک توجیہہ ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ خلیفۃ المسلمین کسی جگہ کی رویت کی بناء پر چاند ہونے کا فیصلہ کرے۔ اور پھر اختلاف مطالع کی بحث ختم ہو کر یہ فیصلہ ساری دنیا کے لئے قابل عمل قرار پائے۔[۵]

---

[۱] کتاب المیزان　[۲] ردالمحتار　[۳] فتاویٰ عالمگیری۔ ج ۱، کتاب الصوم الباب الثانی فی رویۃ الہلال۔　[۴] ردالمحتار ج ۲ باب اختلاف المطالع۔　[۵] مطالع کی بحث میں محترم حاجی احسان الحق صاحب ایم ایس سی ریٹائرڈ لیکچرر طبعیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے بہت مدد ملی ہے۔ وہ فن ہیئت پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

کتبۂ مارگلہ

از پروفیسر شیخ فرید برہان پوری

(صدر شعبۂ اردو و فارسی جبلپور یونیورسٹی)

عرصہ ہوا "کتبۂ مارگلہ" کے عنوان سے جناب لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب (جہلم پاکستان) کا ایک مقالہ برہان اپریل ۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔

جو مدیرِ برہان کے قول کے مطابق ایک مخصوص دماغی کاوش کے اعتبار سے لائق قدر اور مستحقِ داد ہے۔[۱]

جناب ڈاکٹر زبیر احمد صاحب ——— سابق صدر شعبہ عربی و فارسی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی ——— نے مدیرِ برہان کے نام اپنے نامۂ سامی میں اس "دلچسپ" مضمون کی ایک "اہم فردگزاشت" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس کا اقتباس نظرات برہان میں دیا گیا ہے۔[۲]

سطورِ ذیل میں اس کتبہ اور مضمون پر ایک متعلمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ان "چند اہم پہلوؤں" کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان کی صحت پر غور کیا گیا ہے۔ جو کرنل صاحب موصوف کے قول کے مطابق "پہلے منظرِ عام پر نہ تھے۔"[۳]

---

[۱] برہان مئی ۵۶ء نظرات ۲۵۸ [۲] ایضاً نظرات ص ۲۵۸

[۳] برہان اپریل ۵۶ء ص ۲۱۱ "ہم اپنی تحقیق کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ تاہم اس میں کچھ اہم پہلو اجاگر ہو گئے ہیں جو پہلے منظرِ عام پر نہ تھے۔" (کرنل صاحب) باقی حاشیہ ص ۲۷ پر)

ناظرین کرام کی دل چسپی کے لئے مقالہ کے چند اجزا کا خلاصہ پیش کرنا ضروری ہے۔

نکلسن یادگار (Nicholson Monument) کے عقب میں ٹیکسلا سے تولہ میں[۲۶] کے فاصلے پر درہ مارگلہ پر کلکتہ سے پشاور تک جانے والی "شاہراہ سوری" کی اصل ساخت دیکھی جا سکتی ہے۔

"نکلسن یادگار کے عقب میں جنوب مغرب کی طرف پرانی سڑک کا ایک ٹکڑا پہاڑوں کے دامن کی طرف نکل جاتا ہے۔ یہ ٹکڑا کچھ بلندی سے ہوتا ہوا، پہاڑ کا چکر کاٹتا ہوا، موجودہ سڑک کی طرف جاتا ہے۔[۱]

.... سڑک پہاڑ کو کاٹتی ہوئی قدرے بلندی سے گزرتی ہے سڑک کی سطح پختہ اور ہموار ہے۔ سڑک کے اس حصہ کے دونوں طرف چار چار فٹ اونچی دیواریں ہیں جن پر مزید مضبوطی کے لئے پتھر لگائے گئے ہیں۔[۲]

چار فیٹ اونچی دیواریں اس لئے بنائی گئی تھیں کہ اوپر سے دشمن کی گولیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ اور پتھر ڈھلک کر گرنے نہ پائیں۔

سڑک کے اس حصہ کے وسط میں جہاں یہ بلندی پر ہے۔ دائیں جانب سے سڑک کے کوئی پندرہ فیٹ اوپر ایک چٹان میں فارسی زبان میں ایک کتبہ ہے کتبہ کے الفاظ ابھرے ہوئے ہیں۔[۳]

کرنل صاحب کا خیال ہے کہ

"یہ پتھر اس وقت لگایا گیا تھا۔ جبکہ شاہ راہ سوری کی مرمت ......

بقیہ حاشیہ صہ ۲۶ — ان پہلوؤں کے بعض حصے کرنل صاحب موصوف کی توجہ اور نظر ثانی کے محتاج رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں ان کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے — فرید

۱۔ برہان اپریل صہ ۲۰۹ / ۲۔ ایضاً صہ ۲۱۰ /

۳۔ برہان اپریل ۵۶ء صہ ۲۱۰

آخری مرتبہ مغلوں نے کی تھی۔"

اس پر سالِ مرمت ۱۰۸۳ھ (؟) ہجری لکھا ہوا ہے۔ [۱]

یہاں "مرمت" اور "سالِ مرمت" بھی کرنل صاحب موصوف کی نظرِ ثانی اور توجہ کے محتاج رہ گئے۔

ذیل کے ماہرین نے کاغذی عکس کی مدد سے اس کتبہ کو حل کیا تھا۔

۱۔ بلوخمین ــــــ ۱۸۷۱ء

۲۔ ریہالٹسک ــــــ ۱۸۷۴ء

۳۔ ڈاکٹر یزدانی ــــــ ۱۹۲۳ء

۴۔ اور کرنل صاحب نے اس کتبہ کو ۱۹۵۴ء میں لیے گئے ایک فوٹو کی مدد سے حل کیا ہے۔ موصوف نے بلوخمین، ریہالٹسک اور یزدانی صاحب کی خواندگیوں کے ذکر کے بعد تاریخی پسِ منظر میں اپنی خواندگی اور اس کے نتائج کو پیش کیا ہے۔

کاغذی عکس کی چند خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کرنل صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ

"ایسے عکس میں یہ نقص ہوتا ہے کہ بعینہ وہی چیز کاغذ پر منتقل ہو جاتی ہے، جو پتھر پر نظر آتی ہے اگر کوئی چیز جو بخوبی پتھر پر پڑھی نہیں جاسکتی۔ وہ اس عکس پر بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات متعدد حروف اور ان کی ساخت خاص طور پر ایسے حروف جو مکمل نہ ہوں اور ٹوٹے ہوں وہ ظاہر نہیں ہوتے۔ [۲]

یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کرنل صاحب موصوف ۱۸۷۱ء سے ۱۹۳۳ء تک اور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۴ء تک کے طویل عرصہ میں کتبہ کے پتھر پر موسم کے اثرات اور ان اثرات کی وجہ سے الفاظ کی شکست وریخت کے اہم نکتہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔

---

[۱] برہان اپریل ۵۶ء ص ۲۱۰ [۲] برہان ص ۲۱۱

۱۹۵۴ء میں کرنل صاحب موصوف نے کتبہ کا ایک فوٹو لیا۔ اور اس کی مدد سے اپنا حل پیش کیا۔ [1]

مذکورہ بالا ماہرین کے حل موصوف کو محکمۂ آثار قدیمہ پاکستان کے افسر اعلیٰ جناب فضل قادر صاحب کی مدد سے کے توسط سے دستیاب ہوئے۔ [2]

گویا کرنل صاحب کے پیش نظر مستشرقین کے مضامین اور یزدانی صاحب کے عکس کا فوٹو نہ تھا بلکہ فضل قادر صاحب کی فراہم کردہ نقلیں تھیں۔ [3]

مذکورہ بالا ماہرین کے حل نقل کرنے کے بعد موصوف نے کتبہ کے اشعار کا تجزیہ اور تاریخی پس منظر پیش کیا ہے۔ مآثر عالمگیری کے حوالہ سے اس پس منظر میں سڑک کی مرمت کی تاریخ ۱۰۸۳ھ کو صحیح تسلیم کرنے میں موصوف کو تردد ہوا ہے۔ [4]

مآثر عالمگیری کے حوالہ سے کرنل صاحب نے اورنگ زیب عالمگیر کے حسن ابدال میں ۲ ربیع الاول ۱۰۸۴ھ کو پہنچنے اور شاہی کیمپ میں مہابت خاں، لطف اللہ، داروغہ شیخ عبدالعزیز اور تہل داس (؟) کی موجودگی ذکر کیا ہے۔ [5]

لطف اللہ بن احمد معمار کے تذکرہ کے بعد کرنل صاحب کا حل منقول ہے

کتبہ کے تینوں حلوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد کرنل صاحب کی سمجھ میں ذیل کی چند باتیں آتی ہیں۔

اوّلاً ——— پہلے شعر سے پتہ چلتا ہے کہ مہابت خاں کو اس کام پر مامور کیا گیا تھا کہ یہ مرمت کا کام اسکی زیر نگرانی تکمیل پائے۔

---

[1] برہان ص ۲۱۸ / [2] ایضاً ص ۲۱۱ /

[3] عاجز راقم کو ریہا لٹسک کا مضمون نہ مل سکا۔ جناب ضیاء الدین صاحب ڈپٹی افسر محکمۂ آثار قدیمہ ناگ پور نے اس کی نقل فراہم کر دی۔

[4] برہان ص ۲۱۸ - [5] برہان ص ۲۱۵

ثانیاً ——— دوسرے شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام مارگلہ میں مکمل ہوا۔

ثالثاً ——— تیسرا شعر بتاتا ہے کہ یہ مرمت کا کام بحسن وخوبی سرانجام پایا۔

رابعاً ——— آخری شعر میں کام کی تکمیل کی تاریخ ۱۰۸۳ھ (؟) نکالی

گئی ہے۔ جو کتبہ میں صاف نہیں ہے۔" [۱]

اور خامساً ——— قطعہ تاریخ کے نیچے تفصیلات میں چند لوگوں کے نام دئے گئے۔

ہیں ان میں احمد معمار، مرزا محمد داروغہ، جوگی داس اور دیالداس قابلِ ذکر ہیں۔" [۲]

اس کے بعد کرنل صاحب موصوف نے ذیل کے امور پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ حسن ابدال میں اورنگ زیب کے ورود کی تاریخ اور مقصد۔ (برہان صہ ۲۱۴)

۲۔ شجاعت کا کا درۂ خیبر میں شکست کھاکر پنجاب کے میدانوں کی طرف دھکیل دیا جانا۔ [۵۳]

۳۔ اورنگ زیب کا افغانوں کی تنبیہہ کے لئے شمال کی طرف بڑھنا۔

۴۔ حسن ابدال میں کیمپ۔

۵۔ شاہی کیمپ میں ۲۷ رجب ۱۰۸۴ھ کو مہابت خاں کا آنا۔

---

[۱] برہان صہ ۲۱۴ ——— کرنل صاحب نے مرمت کا لفظ پڑھا ہے۔ "مرتب" صاف ہے اس سے تمام تاریخی پس منظر بدل جاتا ہے۔ ۱۰۸۳ھ پر جابجا سوالیہ نشان لگاکر "مہوش" کو "ماہ وش" بناکر ۱۰۸۴ھ حاصل کیا اور مصرعہ کو بے وزن بنادیا ہے۔ (فرید)

[۲] برہان صہ ۲۱۴ ——— کرنل صاحب نے جوگی داس اور دیالداس کو تحویلدار لکھا ہے اور بتلایا ہے کہ "تحویل دار درحقیقت خزانچی کو کہتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں ٹھیکہ داری کا کام یہی لوگ کیا کرتے تھے۔ اور اپنی جیب سے خرچ کرکے سرکاری خزانے سے بعد میں اخراجات کا بل پیش کرکے وصول کرتے تھے۔ (کرنل صاحب)

"دولت مغلیہ کی ہیئتِ مرکزی" میں مرقوم ہے کہ داروغہ کی طرح ہر کارخانہ میں ایک تحویلدار ہوتا تھا۔ اس کی تحویل میں وہ نقد رقم اور سامان ہوتا تھا جس کی ضرورت اس شعبہ کے لئے ہوتی تھی۔" صہ ۳۵۴ (فرید) [۵۳] (برہان صہ ۱۱۵)

اور ٹہل داس، داروغہ شیخ عبدالعزیز اور لطف اللہ کی اورنگ زیب کے ساتھ ہمراہی۔

۶ــــ قطعہ تاریخ پر بحث، ۱۰۸۳ھ کو تسلیم کرنے میں تردد۔

۷ــــ قطعہ کے نیچے تفصلات میں "پور استاد" کے اضافہ کے وجوہ، احمد معمار کا سنِ وفات، لطف اللہ خاں کی موجودگی سے تطابق۔

ــــ مذکورہ بالا تمام امور کرنل صاحب موصوف کی توجہ اور نظر ثانی کے محتاج رہ گئے ہیں۔

ــــ سطور ذیل میں اس عہد کے سیاسی حالات کی روشنی میں مندرجۂ بالا امور کا جائزہ لیا گیا ہے ــــ

ــــ سرحدی قبائل کی شورش ہندوستان کی حکومت کے لئے ہمیشہ سر درد بنی رہی ہے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں سرحد کے آفریدی پٹھانوں کی سرکوبی کے لئے اکبر کے عہد میں جو سخت مہم گئی تھی۔ اس کا انجام فروری ۱۵۸۶ء کی خطرناک تباہی پر ہوا۔ جس میں آٹھ ہزار فوجی اور راجہ بیربل سوات کی جنگ میں کام آئے [1]

افغانوں کی طاقت کا رعب اور پہاڑیوں میں لڑنے کا خوف، پوری سلطنتِ مغلیہ پر غالب آگیا تھا۔ قبائلی سرداروں کو روپیہ دے کر ان سے صلح کرنی پڑی۔

جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں یہی حالت رہی۔ بلخ اور قندھار میں مغل فوج کی کوچ نے قبائلی سرداروں اور عوام کو ہمیشہ خوفزدہ رکھا۔ ان کا خوف ایک خاموش شورش کی شکل اختیار کرتا رہا۔

شاہ جہاں کے آخری ایام میں افغانوں کی شورش اور فتنہ ایک دم بڑھ گیا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد اس فتنہ نے شدید شکل اختیار کرلی۔

---

[1] تاریخ اورنگ زیب (جادو ناتھ سرکار ۱۹۱۶ء ص ۲۵۳

History of Aurangzeb (1916) P. 253

۱۶۶۷ء میں یوسف زئی پٹھانوں کی تحریک شروع ہوئی۔ ان کے ایک سردار بھاگو نے کسی کو محمد شاہ کے نام سے بادشاہ بنا کر دریائے سندھ کو عبور کرکے پکھلی پر حملہ کر دیا۔ جہاں ایک مقامی سردار شادمان اور مغل افسر اس مقام کی حفاظت کے لئے مامور تھے۔ یوسف زئی پٹھانوں نے ——— چھاچھل ——— شادمان کے قلعہ پر ——— قبضہ کر لیا۔ [1]

اس فتح نے دیگر قبائلی سرداروں کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ مغربی پشاور اور اٹک میں ان قبائلیوں نے لوٹ مار شروع کر دی[2]۔ پشاور اور دہلی سے مدد طلب کی گئی۔

اورنگ زیب نے ان کی سرکوبی کے لئے سخت اقدامات کئے۔ کامل خاں (اٹک کے فوج دار) کو حکم ہوا کہ مضافات سے کوچ کرکے ان پر حملہ کرے۔ [3]

پایۂ تخت سے محمد امین دس ہزار چیدہ سواروں کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ کامل خاں نے دریائے سندھ کو عبور کرکے کثیر التعداد یوسف زئی فوج کو شکست دی اور دریائے سندھ کے جنوبی رخ کا علاقہ ان سرکشوں سے خالی ہو گیا۔ [4]

دریائے سندھ کے شمالی رخ پر مغل فوج میں آفریدیوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ کامل خاں ہارون نامی ایک مقام پر ٹھہرا رہا۔

اپریل تک کمک آتی رہی۔ ۲۰ مئی کو شمشیر خاں افغانستان سے اٹک پہنچا اور فوج کی کمک اپنے ہاتھ میں لے کر یوسف زئی علاقہ میں داخل ہو گیا۔

---

[1] مختصر تاریخ مغل صـ۱۳۱/ تاریخ اورنگ زیب صـ۲۵۵ (History of Aurangzeb (1916)

[2] ایضاً صـ۱۳۲ Short History of Aurangzeb

[3] تاریخ اورنگ زیب (۱۹۱۶ء) صـ۲۵۵

(History of Aurangzeb (1916)

[4] ایضاً صـ۲۵۶

اٹک سے سولہ میل دور ---- اوہند ---- (Ohund) مقام پر وہ مقابلہ کے لئے صف آرا رہا۔

یہاں ان سے کئی جنگیں ہوئیں۔ ماندور کے یوسف زئی میدانی علاقہ پر قبضہ کر کے ان کی فصلیں تباہ کر دیں۔ [1]

شمشیر خان اوہند سے بھاگوا پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ کئی گاؤں فتح کر لئے گئے مکانات جلادئے گئے، املاک لوٹ لی گئیں اور کھیتاں تباہ کر دی گئیں [2]

اس تباہی کے بعد یوسف زئی قبیلہ کی مدد کے لئے سوات اور تیراہ کے آفریدی بڑھے مگر ان کو شکست ہوئی۔

پایۂ تخت سے بادشاہ کے حکم سے محمد امین خاں کی سرداری میں ۹ ہزار افراد کی ایک فوج روانہ کی گئی۔

محمد امین خاں دریائے کابل کو پار کر کے لاکھی (Lakhi) پہنچا۔ یہاں اس نے شمشیر خاں سے فوج کی کمان لے لی۔ اور شہباز گڑھی کی طرف روانہ ہوا اور نواحی دیہات کو لوٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

یوسف زئی دب گئے اور ۱۶۷۲ء تک کوئی شورش نہیں ہوئی۔ [3]

۱۶۷۲ء میں جلال آباد کے حاکم کی کسی ناشائستہ حرکت نے خیبر کے قبیلوں میں شورش پھیلادی۔ آفریدی اکمل خاں کی سرداری میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے اپنا سکہ رائج کیا۔ اور مغلوں کے خلاف قومی تحریک میں تمام پٹھانوں کو شریک ہونے کی دعوت دی اور درۂ خیبر بند کر دیا۔ [4]

---

[1] تاریخ اورنگ (۱۹۱۶ء) صہ ۲۵۵ History of Aurangzeb (1916)

[2] تاریخ اورنگ زیب صہ ۲۵۷ [3] ایضاً صہ ۲۵۹ / مختصر تاریخ اورنگ زیب صہ ۱۳۲

[4] مختصر تاریخ اورنگ زیب صہ ۱۳۳

۱۶۷۲ء میں بہار کے موسم میں محمد امین خاں پشاور سے کابل کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے ہمراہ اس کا خاندان، فوج اور بے شمار اسباب تھا۔ جامرود (Jamrud) کے مقام پر اسے معلوم ہوا کہ افغانوں نے راستہ بند کر دیا ہے۔

عالی مسجد کی طرف آگے بڑھتے ہی وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔ وہ چاروں طرف سے گھر گیا تھا۔

رات کے وقت آفریدیوں نے پہاڑیوں سے اتر کر چشمہ کا پانی اس پر بند کر دیا۔ گرمی کی وجہ سے آدمی اور جانور پیاس کی وجہ سے گھبرانے اور مرنے لگے۔ افغانوں نے تیر و تبر کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ لشکر پراگندہ ہونے لگا۔ اور گھوڑے ہاتھی ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ [1]

ہزاروں لوگ پہاڑ کی بلندی سے گر کر غاروں میں ہلاک ہو گئے۔ تقریباً دس ہزار آدمی مارے گئے۔ دو کروڑ روپیہ اور اسباب لوٹ لیا گیا۔ بیس ہزار مرد اور عورت گرفتار ہوئے۔ محمد امین خاں کی ماں، بیوی اور لڑکی بھی قید ہو گئے۔ گراں بہا معاوضہ دے کر ان کو چھڑایا گیا۔ [2]

محمد امین خاں کے ملازم معرکہ کارزار سے اس کو سلامت لے آئے۔ رشید خاں، فرزند عبداللہ خاں اسی معرکہ میں قتل ہوا۔ اور امین خاں تمام مال و اسباب سے دست بردار ہو کر بحال تباہ لاہور واپس آیا۔ [3]

صاحب ماثر عالمگیری نے لکھا ہے کہ "اکبر بادشاہ کے عہد میں زین خاں کوکہ، حکیم عبدالفتح اور راجہ بیربر کو جو حادثہ پیش آیا تھا وہی سامنے آیا"۔ [4]

---

[1] مختصر تاریخ اورنگ زیب ص ۱۳۳ / ماثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ص ۸۱

[2] ایضاً ص ۱۳۳

[3] ماثر عالمگیری ص ۸۱ } مختصر تاریخ اورنگ زیب میں مرقوم ہے کہ محمد امین خاں پشاور کی طرف نکل گیا۔ ص ۱۳۳

[4] ایضاً ص ۸۱

اس فتح نے آفریدیوں کی ہمت بڑھادی اور مالِ غنیمت کی فراوانی اور افراط کے قصے سن سن کر بہت سے لوگ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔

خٹک قبیلہ بڑا جنگ جو تھا۔ پشاور کے جنوب میں اور کوہاٹ بنوں کے علاقہ میں کثرت سے آباد تھا۔ اور یہ قبیلہ یوسف زئی پٹھانوں کا سخت دشمن تھا۔ ان دونوں قبیلوں کی سرحد پشاور میں ملتی تھی۔

خوش حال خان خٹک ـــــ "افغان بغاوت کا رہنما" "پشتو شعراء کا سرتاج" اور "صاحبِ سیف و قلم تھا۔[1]

سالہا سال تک اس نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔ اب وہ اکمل خاں سے مل گیا اور بغاوت کا قومی رہنما اور سردار بن گیا۔

حکومت کے لئے خطرہ بڑھ گیا۔ قندھار سے اٹک تک ساری افغان دنیا اس تحریک سے متاثر ہوگئی۔ اس تحریک کے سردار وہ فوجی تھے۔ جنہوں نے دکن اور ہندوستان میں مغل فوج کیساتھ میدانِ جنگ میں زبردست معرکے سر کئے تھے۔ اور انتظامی امور اور سرکاری ترکیبوں سے بخوبی واقف تھے۔

دونوں طرف ایک ہی قسم کا سامان جنگ تھا۔ مگر ان کے پاس ایک بھاری توپ خانہ نہ تھا۔ چوں کہ وہ پہاڑوں میں لڑنے کے عادی اور جفاکش تھے۔ ان کو مغل فوج پر برتری حاصل تھی۔[2] مغل فوج پہاڑیوں میں لڑنے سے خوف زدہ تھی۔

بادشاہ نے افغانوں کے حملہ سے پشاور کی مدافعت اور حفاظت کے لئے سخت اقدامات کئے۔ محمد امین خاں کو معزول کر کے مہابت خاں کو چوتھی مرتبہ کابل کا عامل بنا کر بھیجا۔ مہابت خاں تین مرتبہ اس سے پہلے افغانستان کا عامل رہ چکا تھا۔ اس نے کامیابی

---

[1] رود کوثر صہ ۴۲۹ / مختصر تاریخ اورنگ زیب صہ ۱۳۴

[2] مختصر تاریخ اورنگ زیب صہ ۱۳۴

کے ساتھ آفریدیوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھے تھے۔ بادشاہ نے اسے دکن سے طلب کر کے کابل جانے کا حکم دیا۔

مہابت خاں اپنے پیشرووں کا انجام دیکھ چکا تھا۔ اس نے افغانوں کی قرار واقعی تنبیہ سے چشم پوشی کی۔ اس باغی گروہ کو پامال کئے بغیر "ما بخیر و شما بہ سلامت" کہہ کر کابل چلا گیا۔ ؎

"بادشاہ کو خان مذکور کی یہ ادا پسند نہ آئی"۔ ۷ا شعبان/ مطابق ۱۷ نومبر ۱۶۷۳ء کو شجاعت خاں کو افغانوں کی سرزنش اور تنبیہ کے لئے کثیر فوج اور ساز و سامان کیساتھ رخصت کیا گیا۔ ؎

شجاعت خاں کی مدد کے لئے جسونت سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔

شجاعت خاں معمولی خاندان کا فرد تھا۔ ست نامیوں سے جنگ اور ان کی بغاوت کو فرو کرنے میں میدانِ کارزار میں جو ہر مردانگی دکھائے تھے۔ اور رعد انداز خاں سے شجاعت خاں ہو گیا تھا اس کے منصب میں اضافہ ہوا۔ وہ سہ ہزاری پانصدی دو ہزار سوار کے مرتبہ پر فائز کیا گیا۔ ؎

مہاراجہ جسونت سنگھ اور مہابت خاں جیسے عالی نسب لوگ اس سے متنفر ہو گئے اور حسد کرنے لگے۔

شجاعت خاں نے مہاراجہ کی صلاح کو نہ مانا۔ ۱۶۷۴ء کی تباہی کا سبب مغل افسروں میں عدم تعاون تھا۔

شجاعت خاں نے کابل کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ ۷ ذیقعدہ [۵۳] (۱۰۸۴ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۶۷۴ء کنڈاب سے گزر کر کوتل کرپہ عبور کرنے کا خواہاں تھا لشکر آراستہ

؎ مآثر عالمگیری ص ۱۲۸ / ۱۶ محرم کو بادشاہ کو معلوم ہوا کہ مہابت خاں حوالی پشاور یعنی باغ ظفر سے کوچ کر کے کابل روانہ ہوا۔ (ص ۸۷) ؎ مآثر عالمگیری ص ۸۰ (؎ کا حاشیہ ص ۲ پر دیکھیے)

ہوکر آگے بڑھ رہا تھا۔ افغانوں کا گروہ کمین گاہ میں مقیم تھا۔ ایک تنگ پہاڑی راہ پر شجاعت خاں کے مقابلہ کے لئے آیا۔

اس رات سخت برف باری ہوئی۔ سردی اور نمی کی وجہ سے سپاہی موت کے دروازے تک پہنچ گئے۔ اس مصیبت زدہ فوج کو افغان پہاڑوں کے دونوں طرف سے ستانے لگے۔ سردی سے اکڑی ہوئی فوج پر صبح کے وقت افغانوں نے چاروں طرف سے حملہ شروع کر دیا۔ شجاعت خاں اور سپاہیوں کی ایک معقول تعداد میدانِ جاں نثاری میں کام آئی۔ [1]

شاہی رعب داب کو برقرار رکھنے کے لئے اورنگ زیب خود حسن ابدال پہنچا۔ اس کے ہمراہ کثیر فوج اور بھاری توپ خانہ تھا۔ مضبوط اور مسلح فوج اور جنگی سامان دشمن کے علاقہ میں بھیجا گیا۔ [2]

اغر خاں دکن سے طلب کیا گیا۔ اور خیبر علاقہ میں راستہ صاف کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔

شیخ عبدالعزیز فوجدار سرہند کو دلاور خاں کا خطاب مرحمت ہوا۔ دو ہزار پانچ سو سواروں اور توپ خانہ کی جمعیت کے ساتھ دامن کوہ سے راستہ طے کرنے پر لئے مامور کیا گیا۔ [3]

۱۸ ربیع الاول کو سربلند خاں، بدیع السلطان اور ناصر خاں وغیرہ کے ہمراہ پشاور سے روانہ کیا گیا۔ [4]

۲ ربیع الثانی (۱۰۸۴ھ) کو بادشاہ حسن ابدال پہنچ گئے۔ [5]

۷ رجب (۱۰۸۴ھ) کو فدائی خاں ——— مہابت خاں کا بھائی ———

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۶۔ [3] ——— مآثر عالمگیری کے اردو اور انگریزی ترجموں میں تاریخ میں دو ایک روز کا فرق ہے۔ [1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) صفحہ ۸۹ [2] ——— ترک امیر جو افغانوں سے لڑنے میں ممتاز ہو چکا تھا ——— مختصر تاریخ اورنگ زیب ۱۳۱

[3] مآثر عالمگیری (اردو) صفحہ ۹۰ / [4] ایضاً صفحہ ۹۰ / [5] ایضاً صفحہ ۹۱

کابل کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔

بادشاہ زادہ محمد اکبر اور اسعد خاں کو کوہاٹ کی راہ سے کابل روانہ ہونے کا حکم ہوا۔ شہامت خاں اور غیرت خاں وغیرہ امیرانِ دربار شاہزادہ کے ہمراہ ہوئے۔ ؎۱

تقریباً ڈیڑھ سال تک اورنگ زیب اس علاقہ میں رہا۔

جمادی الاول (۱۰۸۵ھ) میں مکرم خاں اپنے بھائی شمشیر خاں کے ہمراہ ایک شائستہ فوج لے کر کتلی خابوش کے افغانوں پر حملہ آور ہوا۔

۲۷ ربیع الاول کو بادشاہ کو معلوم ہوا کہ مکرم خاں نے غنیم پر حملہ کیا اور ان کے اکثر گھروں کو تاراج اور بے شمار افراد کو نظر بند کر دیا۔

"ایک روز فتنہ پردازوں کی ایک قلیل جماعت نمودار ہوئی، مکرم خاں نے اس پر حملہ کیا۔ کمر کوہ کے ہر دو جانب سے حریف کے دو دستے نکل کر شاہی فوج پر حملہ آور ہوئے۔ شمشیر خاں اور میر عزیز اللہ خاں نے غیرت مردانگی سے کام لیا۔ اور مردانہ وار میدانِ جنگ میں کام آئے۔ سپاہیوں کی کثیر تعداد قتل ہوئی۔ اکثر سوار اور پیادے، بے آبی اور برگشتہ راہی کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

مکرم خاں چند زندہ سواروں کے ساتھ باجوڑ کے تھانہ دار عزت خاں کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ ؎۲

۳۰ ربیع الاول کو بخشی الملک سردار بلند خاں ایک جرار فوج اور ساز و سامان کے ساتھ شورہ پشت افغانوں کی تنبیہ کے لئے روانہ ہوا۔

اغر خاں جلال آباد کی تھانہ داری پر مقرر ہوا۔

ہز بر خاں جگد لک کا تھانہ دار مقرر کیا گیا۔ ؎۳

؎۱ مآثر عالمگیری (اردو) ص ۹۳

؎۲ ایضاً ص ۹۸ ؎۳ ایضاً ص ۹۹

فدائی خاں نے اپنے بہادر سپاہیوں کی مدد سے افغانوں کو بے حد پامال کیا۔ ان کے مکانات اور املاک سب تاخت و تاراج کر دیئے۔

۴ جمادی الاول کو معلوم ہوا کہ ہزبر خاں (تھانہ دار جگدلک) اور افغانوں میں مقابلہ ہوا۔ وہ اپنے فرزند اور دیگر سواروں کے ساتھ میدان جنگ میں کام آیا

مختصر عرصہ میں غورائی، شرانی، یوسف زئی قبیلوں کو شکست دے کر ان کے علاقوں سے باہر کر دیا گیا۔ بہت سے قبیلوں کو جاگیر اور انعام و منصب دے کر ان کے لیا گیا۔

۱۵ شوال (۱۰۸۶ھ) کو بادشاہ نے حسن ابدال سے تخت گاہ کی طرف کوچ کیا۔[۱]

مذکورہ بالا تاریخی حقائق کی روشنی میں عاجز راقم کی ناقص رائے یہ ہے کہ مذکورہ سڑک مہابت خاں نے اپنے لئے بنوائی۔ اس کو اس کام پر مامور نہیں کیا گیا تھا۔ سڑک مرتب کی گئی۔ ساخت[۲] کا لفظ بھی اس کی وضاحت کر رہا ہے۔

اورنگ زیب کے حسن ابدال پہنچنے سے پہلے مہابت خاں اس راہ سے گزر کر کابل پہنچ چکا تھا۔ بادشاہ کے لئے سڑک تعمیر کروائی جاتی تو کتبہ کے کسی مصرعہ میں اس کا اشارہ ہوتا۔

کتبہ کی مختلف خواندگیوں کو ملاحظہ کیجیے۔

بلوخمین (Blochmann)[۳]

۱۸۷۱ء

مارگلہ

خان قوی پنجہ مہابت شکوہ شیرز سرپنجہ او ناتواں

---

[۱] ماثر عالمگیری ص ۱۰۱

[۲] ساخت چناں شاہ زہے باشرف

[۳] عربی و فارسی کتبات پر اشارات ـــــ رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۸۷۱ء ص ۲۵۹

گفت مغل رومی تاریخ شان ناصیہ ہوش ہندوستان

۱۰۸۳ھ

باہتمام مرزا محمد داروغہ[1] واحمد معمار اوستاد دجو گیداس و دیبی داس تحویلدار

ریہاٹشک (Rehatsek)[2]

۱۸۷۴ء

ہوالقادر

خان قوی پنجہ مہابت شکوہ — شیر زسر پنجہ او ناتوان

در کتل مارگلہ آں کہ بود — باکرہ چرخ برین توامان

ساخت چناں را روئے شرف — یومیہ دید چرخ زدر زمان

گفت مثل از پے تاریخ سال — ناصیہ ہوشِ ہندوستان

بایام مرزا محمد داؤد داستان ۔ ۔۔ ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔۔۔۔۔

---

[1] ـــــ کرنل رشید صاحب نے "داروغہ" کے بعد چند نقطے لگا کر خالی جگہ چھوڑ دی ہے اور ۱۰۸۳ھ "تحویلدار" کے بعد لکھا ہے۔ برہان اپریل ۵۶ء ص ۲۱۲
کرنل صاحب نے "۱۰۸۳ھ" صحیح مقام پر نقل کیا ہے۔ مگر اصلی کتبہ میں "ہجری" لفظ کی تحریر کی گنجائش نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجئے ـــــ ہندو مسلم کتبات ـــــ عکس مارگلہ مقابل ص ۲۰
Epigraphica - Indo - Moslemica P. 20

[2] برہان اپریل ۵۶ء ص ۲۱۳-۲۱۲
Indian Antiquary Vol: III P. 205
جناب ضیاء الدین صاحب ڈیسائی نے راقم السطور کو جو نقل فراہم کی ہے اس میں آخری مصرعہ یوں نقل ہے ـــ "ناصیہ ہوش شدہ داستان" (کرم نامہ ڈیسائی صاحب ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء)

حمد معمار و جوگیداس و شرف دیال داس

تحویلدار ۱۰۸۱ھ مرمت شد

یزدانی ۱۹۳۳ء[1]

ہوالقادر

خان قوی پنجہ مہابت شکوہ شیر ز سر پنجۂ او ناتواں

در کتل مارگلہ آنکہ بود باکرۂ چرخ بریں تواماں

ساخت چناں شاہراہی شرف ..... چرخ ..... بوزمان

گفت مغل در پئے تاریخ سال ناصیہ ہوش ہندوستان

باہتمام میرزا احمد .... داروغہ ....

احمد معمار و جوگیداس .... شرف و دیالداس

تحویلدار ۱۰۸۳ھ مرتب شد

رشید ۱۹۵۶ء[2]

خان قوی پنجہ مہابت شکوہ شیر ز سر پنجۂ او ناتواں

در کتل مارگلہ آں کہ بود باکرہ چرخ بریں تواماں

---

[1] برہان اپریل ۵۶ء ص ۲۱۴

Epigraphica Indo Moslemica P. 20

دیسائی صاحب کا کرم نامہ ۶ ستمبر ۶۶ء

[2] برہان اپریل ۵۶ء ص ۲۱۸ خط کشیدہ الفاظ کرنل صاحب کے اضافے ہیں۔ جو گزشتہ مستشرقین نے بیان نہیں کیے۔

ساخت چناں راہ بروی شرف — کہ سر برد چرخ برصد زماں
گشت مغل در پئے تاریخ سال — ناصیہ ماہ وش ہندوستان

....

(خالی سطر جہاں سے الفاظ گر گئے ہیں۔) ....

باہتمام مولانا محمد میاں و داروغہ شیخ عبدالعزیز

(و پور استاد) احمد معمار و جوگی داس ....

و دیال داس تحویلدار ۱۰۸۴ھ

مرمت شد

عاجز راقم کی رائے میں کتبہ مارگلہ کی مذکورہ بالا چار خوانندگیاں نامکمل ہیں۔ اور مزید غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

موجودہ کتبہ کا تازہ ترین عکس یا چربہ حاصل کرنے کی مسلسل سعی میں ناکامی کے بعد یزدانی[1] صاحب کے فوٹو کی روشنی میں اس ہیچ میرز نے اپنا حل پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔

ہوالقادر

یزدانی صاحب ــــ "ہوالقادر" میں ل اور ر جھڑ گئے ہیں۔

بلوخمین نے مارگلہ لکھا ــــ

مصرعہ اوّل ــــ

"بنجہ" کا پ نہیں ہے۔

---

[1] یزدانی عکس Epigraphica Indo Moslemica 1933 P. 20

برہان اپریل ۱۹۵۶ء ص ۲۱۲

"مہابت" ـــــ کا ہے ہوز (ہ) کا شوشہ نہیں ہے۔

"شکوہ" ـــــ کی ہ نصف آخر رہ گئی ہے۔

مصرعِ دوئم ـــــ

"شیر" کے ش کا ایک دندانہ اور نقطے غائب ہیں۔

ر نصف رہ گئی ہے۔

"پنجہ" ـــــ پ اور ج کے گھر نہیں ہیں۔ نقطے غائب ہیں۔

ہ ـــــ (ہ) کا آخری حصہ جھڑ گیا ہے۔

او ـــــ کا واؤ (و) دال جیسا معلوم ہوتا ہے۔

"ناتواں" ـــــ میں نا کا الف (ا) بیچ میں سے کٹ گیا ہے۔

"تواں" میں ت کے نقطے غائب ہیں۔

پہلا شعر سب نے یکساں پڑھا ہے

دوسرے شعر کو بلوخمین نے چھوڑ دیا ہے۔ ریہالٹسک، یزداتی اور کرنل صاحبان کا حل

یکساں ہے۔

در کشتن مارگلہ آں کہ بود   باکرہ چرخ بریں تو امان

مصرعِ سوم ـــــ

"کشتن" ـــــ کا ت بیچ میں سے ٹوٹ گیا ہے۔

"مارگلہ" کی ر نصف رہ گئی ہے۔

"آں کہ" میں نون کا نقطہ نہیں ہے۔

الف (آ) کا مد غائب ہے۔

کاف ("ک") کا مرکز جھڑ گیا ہے۔

مصرعِ چہارم ـــــ

"بکرہ" ـــــ ح اور ر کے نچلے حصے ٹوٹ گئے ہیں۔

"چرخ" ـــــ خ کے دائرہ کا بالائی حصہ کٹ گیا ہے۔

"برین" ـــــ ر نصف رہ گئی ہے۔

ی (یہ) کا گھر غائب ہے۔

صرف نقطے رہ گئے ہیں۔

تیسرا شعر بلوخمین نے نہیں پڑھا۔ باقی فضلاء نے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

ساخت چنان را روئے شرف یومیہ دید چرخ ز در زماں

(ریہالٹسک)

ساخت چناں شاہراہی شرف ..... چرخ ..... بو زماں

(یزدانی)

ساخت چناں راہ بروی شرف کہ سر برد چرخ برصد زماں

(کرنل رشید صاحب)

ساخت چناں راہ روی شگرف بوسہ دہد چرخ بداں ہر زماں

(ضیاء الدین صاحب دیسائی)[1]

مصرعہ پنجم ـــــ

مصرعہ پنجم کے دونوں الفاظ ـــــ "ساخت" اور "چنان" برابر حل ہو گئے ہیں

"ساخت کے لفظ پر غور کیجئے۔ بتلا رہا ہے کہ سڑک بنائی گئی "مرتب" ہوئی۔ نہ کہ "مرمت" کی گئی۔

---

[1] راقم السطور کے نام اپنے کرم نامہ مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء میں دیسائی صاحب نے اس شعر کو یوں حل کیا ہے۔

ریہالٹسک اور کرنل صاحب نے "مرمت" لکھا ہے۔ غالباً لفظ "ساخت" کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یزدانی صاحب نے مرتب لکھا ہے۔

"ساخت" ـــــ س کے دندانے جھڑ گئے ہیں۔

اور ت کے نقطے غائب ہیں۔

"چناں" ـــــ چ کا بالائی حصہ نصف رہ گیا ہے۔

"شاہ رہی" ـــــ کا حل مختلف ہے [۱]

"ش" گم گیا ہے۔

"الف" (ا) رہ گیا ہے۔

شکستہ ش کا صرف ایک نقطہ نظر آتا ہے۔

"شا" کے "الف" (ا) کے اوپر ہ کا بائیں جانب کا حصہ رہ گیا ہے۔

"رہی" ـــــ میں (ہر) کا گھر جھڑ گیا ہے۔ اور نیچے کا شوشہ رہ گیا ہے۔

"با" ـــــ خطاط سنگ نے کتبہ میں ہر جگہ الف (ا) ترچھا لکھا ہے۔

"با" کا ترچھا الف (۱) جھڑ گیا ہے۔

صرف ب کا نقطہ رہ گیا ہے۔ جو "شاہ رہی" کے بعد صاف نظر آتا ہے۔

---

[۱] "شاہ راہی" ـــــ یزدانی صاحب نے "شاہ راہی" پڑھا ہے۔ مصرعہ وزن سے خارج ہو جاتا ہے۔

بلوخمین نے یہ شعر چھوڑ دیا ہے۔

ریہالٹسک نے "را روئے" پڑھا ہے۔

کرنل رشید صاحب نے "راہ بروئے" پڑھا ہے۔

یزدانی صاحب نے با کی جگہ حل میں سوالیہ نشان (؟) بنا دیا ہے[1] یزدانی صاحب کا حل نقل کرتے وقت کرنل صاحب نے سوالیہ نشان کو چھوڑ دیا ہے[2] ممکن ہے کہ جناب فضل قادر صاحب نے کرنل کو ویسی ہی نقل بھیجی ہو[3]

"شرف" ——

صرف یزدانی صاحب اور کرنل صاحب نے "شرف" پڑھا ہے۔

"شرف" کے شین کے دندانے، ر کا نصف حصہ اور "ف"، شکستہ ہو گئے ہیں۔

مصرعہ ششم کو نہایت عجیب طریقہ سے حل کیا گیا ہے۔ اس کا کوئی وزن نہیں، کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔

یزدانی صاحب کے عکس کی روشنی میں عاجز راقم نے مصرعہ ششم کو یوں پڑھنے کی کوشش کی ہے۔

رشک برد چرخ بر او ہر زماں

"رشک" —— ر ٹوٹ گیا ہے نیچے کا ۳/۴ حصہ رہ گیا ہے۔

"ش" —— (شہ) کے کچھ مٹے ہوئے دندانے باقی ہیں۔

جوڑ کے بقیہ حصے کے ساتھ ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"ک" —— باقی ہے۔ کاف کا آخری حصہ جھڑ گیا ہے۔

شکست و ریخت کے بعد "رشک" سے جو کچھ بچا اس کو کرنل صاحب نے "کہ سر" پڑھا۔

"برد" —— "برد" میں سے "بر" گر گیا ہے

---

[1] Epigraphica Indo-Moslemica P. 21

[2] برہان اپریل ۱۹۵۶ء ص ۲۱۳

[3] ایضاً ص ۲۱۱

"ب" کی نوک جھڑ گئی ہے۔ صرف موڑ "ر" کے اوپری حصہ سے ملا ہوا ہے۔

"ر" کا نچلا حصہ جھڑ گیا ہے۔

"د" —— دال کے دونوں مڑے ہوئے سرے جھڑ گئے ہیں۔ بالائی اور زیریں جھکے ہوئے سروں کے جھڑ جانے کے بعد صرف درمیانی حصہ رہ گیا ہے۔

"چرخ" —— چرخ بالکل صاف پڑھا جاتا ہے۔

"چ" کے نقطے جھڑ گئے ہیں۔

"ر" ہلکا سا شکستہ معلوم ہوتا ہے۔

"خ" کا نقطہ ٹوٹ گیا ہے کچھ نشان سا باقی ہے۔

"برو" —— بے (ب) موجود ہے۔ "ب" کا نقطہ تاریخ کی ی کے پاس ہے نصف رہ گیا ہے۔

"ر" جھڑ گئی ہے۔

"و" صاف پڑھا جاتا ہے۔

"بر" کرنل صاحب کے فوٹو میں صاف آیا ہوگا۔ کرنل صاحب موصوف نے اسے بر پڑھا ہے۔

"ہر" —— "ہر" کے شوشہ کا موڑ —— "ہ" کا ابتدائی سرا جھڑ گیا ہے۔ صرف نچلا حصہ نقطے کی شکل میں موجود ہے۔ جس کو پڑھنے میں "بر" کا دھوکا ہوتا ہے۔

کرنل صاحب کے فوٹو میں "ہر" بھی برابر صاف آیا ہوگا۔ کرنل صاحب نے "و" کے ایک حصے کو "ص" اور ہائے ہوز (ہ) کے ایک حصہ کو "د" بنا کر "صد" بنا لیا۔ موصوف نے اسے "صد زماں" پڑھا ہے۔ مصرعہ بے معنی اور غیر موزوں ہو جاتا ہے اس کو کسی بھی صورت میں صد نہیں پڑھا جا سکتا۔

"زماں" صاف پڑھا جاتا ہے۔

کتبہ کے آخری شعر کی خواندگی بھی کافی دلچسپ ہے۔

مصرعہ ہفتم ——

"گفت" کا "گ" کا مرکز اور "ف" کا نقطہ رہ گیا ہے۔

"ت" باقی ہے۔

"گفت" کو کرنل صاحب نے "گشت" بنا دیا۔ اور اس کے نیچے خط کھینچ کر اسے اضافہ قرار دیا[1]۔ اس لفظ کو "بلوخمین" "ریہالٹسک" اور "یزدانی" صاحب نے "گفت" پڑھا ہے۔

"ف" اور "ت" کے درمیان "ش" کے لئے کوئی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔

اور بقول ڈاکٹر نذیر احمد صاحب "یہاں گفت ہی صحیح معلوم ہوتا ہے"۔[2]

"مُغل" —— ریہالٹسک نے اسے مثل پڑھا ہے۔

"غ" کا کچھ بالائی حصہ پردہ ہو گیا ہے۔

"از" —— ریہالٹسک نے "از" پڑھا ہے۔

یزدانی اور کرنل صاحب نے "در" پڑھا ہے۔

بلوخمین نے "رو" پڑھا۔

"از" سے الف (۱) کا نصف حصہ ... گیا ہے۔

"ز" کا "نقطہ" غائب ہو گیا ہے اور وہ خود بھی نصف رہ گیا ہے۔

الف (۱) کے نصف حصہ کو بلوخمین نے "ر" پڑھا۔ اور بغیر نقطہ کے "ر" واو (و) پڑھا۔ قریب ہی پتھر ٹوٹ کر پھول گیا ہوگا۔

---

[1] برہان اپریل ۱۹۵۶ء ص ۲۱۸ [2] نظرات برہان

"از" کا جو حصہ باقی رہ گیا ہے اسے "در" نہیں پڑھا جا سکتا۔ مگر یزدانی اور کرنل صاحب نے "در" پڑھا ہے۔

چونکہ "گفت" کو کرنل صاحب نے "گشت" بنا دیا۔ اس لئے "در پے" کر دیا۔

"پی" ــــ پ کے نقطے غائب ہیں۔

"تاریخ" ــــ ر نصف رہ گئی ہے۔

"سال" ــــ الف (ا) تقریباً نصف رہ گیا ہے۔

مصرعہ ہشتم ــــ

یہ مصرعہ مادہ تاریخ ہے۔ تمام خواندگیوں میں یہ مصرعہ صاف پڑھا گیا ہے۔

ریہا لٹسک نے اس مصرعہ پر غور نہ کرتے ہوئے تاریخ ۱۰۸۱ھ لکھ دی ہے[1]۔ کرنل صاحب نے "مہوش" کو "ماہ وش" بنا دیا۔ "اس سے مصرعہ میں سکتہ پڑ جاتا ہے"[2] اور سال میں ایک کا اضافہ ہوتا ہے۔

"ناصیہ" ــــ "ی" اور "ہ" (یہ) جھڑ گئے ہیں۔ صاد (ص) پر "ع" کا دھوکہ ہوتا ہے۔

"مہوشں" ــــ یزدانی صاحب کے عکس میں "مہوشں" صاف نظر آتا ہے۔

"ہ" (ہر) کا شوشہ نہیں ہے۔

"شں" کا نصف حصہ جھڑ گیا ہے۔ جس پر "رہ" کا دھوکہ ہوتا ہے۔

---

[1] Indian Antiquary Vol III P. 205 کے برہان ص ۲۱۳

[2] برہان نظرات، اپریل ۱۹۵۶ء

"کرنل رشید صاحب نے لکھا ہے:

" ان کے فوٹو سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ "مہوش" نہیں بلکہ "ماہ وش" ہے

اور گزشتہ محققین کو پڑھنے میں اشتباہ ہوا ہے۔........"

اگر ہم لفظ مہوش کو ماہ وش پڑھیں تو یہ بات پایۂ تصدیق کو پہنچ جاتی ہے۔

کہ اصل مادۂ تاریخ یوں ہوگا۔

ناصیہ ماہ وش ہندوستان

جس کے اعداد پورے ۱۰۸۴ھ بنتے ہیں۔ جو وہی سال ہے۔ جب اورنگ زیب حسن ابدال

میں وارد ہوا۔ [1]

اس عبارت پر حیرت خیز اور فکر انگیز اضافہ ملاحظہ فرمائیے۔

لفظ مہوش کو ماہ وش لکھنے سے مصرعہ کا وزن بدستور قائم رہتا ہے۔ اور معانی

میں بھی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ حرف الف کے اضافہ سے اعدادِ تاریخ بھی پورے ہو جاتے ہیں۔

جن میں ایک کی کمی پڑ رہی تھی۔"

ڈاکٹر زبیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ "ماہ وش" سے مصرعہ میں سکتہ پڑ جاتا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ اگر ۱۰۸۴ھ صحیح سال تسلیم کر لیا جائے تو شاعر نے تعمیۂ داخلی سے کام

لیا ہوگا۔ [2]

کرنل صاحب نے ماثر عالمگیری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اورنگ زیب حسن ابدال میں

۲ ربیع الاوّل ۱۰۸۴ھ کو وارد ہوتا ہے۔ [3]

مگر بادشاہ نے ۱۱ محرم کو حسن ابدال کی طرف کوچ کیا۔ [4] (باقی آئندہ)

---

[1] برہان اپریل ۱۹۵۶ء ص ۲۱۵ / [2] ایضاً ص ۲۱۵ / برہان مئی ۱۹۵۶ء نظرات

[3] برہان اپریل ۱۹۵۶ء ص ۲۱۴ / [4] اردو ترجمہ ماثر عالمگیری ص ۹۰ / ماثر عالمگیری

انگریزی ترجمہ ص ۸۲۔

قسط نمبر ۱۹

ہندو تہذیب اور مسلمان

از جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاذ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی

محمد شاہ بادشاہ کے دربار سے وابستہ نجومیوں میں مشیر خاں، منجم خاں اور مرزا محسن تاریخ نویس کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں [1]۔ احمد شاہ بادشاہ نے نجومیوں کو جاگیریں عطا کی تھیں۔ پنڈت رائے عرف نین سکھ کے اولاد کے نام ایک فرمان جاری ہوا تھا جس کی رو سے انہیں اپنے والد کی جاگیر بطور حقِ مداشت عطا کی گئی تھی۔

"کہ دو لک ہشتاد و ہزار دام از پرگنہ ملانواہ سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ کہ ۱۷۷۶ روپیہ و کسرے حاصل آنست و نبابر وطن بجاگیر پنڈت رائے عرف نین سکھ منجم تنخواہ بود در وجہ انعام فرزندان و متعلقان منجم مذکورہ بطریق التمغا بلا قید اسامی وقسمت ...... نسلِ بعد نسلاً خالداً و مخلداً تبصرف آنہا باز گزارند" [2]

دہلی کے مشہور بازار چاندنی چوک میں نجومیوں کی ٹولیاں اپنی دکانیں سجائے بیٹھی رہتی تھیں

---

[1] تاریخ شاکر خانی (قلمی) ص ۱۱۲ الف

[2] فرامین سلاطین (مرتبہ بشیر الدین احمد دہلوی) ص ۱۵۸ تا ۱۶۰

مشیر خاں منجم کے کہنے پر احمد شاہ بادشاہ نے صفدر جنگ سے مقابلہ کرنے میں توقف سے کام لیا۔ تاریخ احمد شاہی (قلمی) ص ۴۴ الف ۴۵ الف نیز سیر المتاخرین (ا۔ ت) ۲/ص ۱۱۵

درگاہ قلی خاں چشم دید منظر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"آگے بڑھئے تو آپ کو رمالوں، نجومیوں اور جوتشیوں کی جماعت کا جال، بچھا ہوا نظر آئے گا جن کے پھندے سے نکل جانا مشکل بات ہے۔ یہاں خلقت اپنی تقدیر کے نوشتے کو معلوم کرنے کے لئے بیٹھی ہے۔ کوئی ہے جو خوش آئند واقعات سُن کر مسرور ہو رہا ہے۔ اور کوئی ہے جو آئندہ کی پریشانیوں کو سن کر متفکر ہے۔ نجومیوں کی آمدنی اس بازار میں بہت کافی ہوتی ہے۔"[1]

میر حسن دہلوی نے اپنی منظوم مثنوی سحر البیان میں ایک بادشاہ کا حال بیان کیا ہے۔ جو لاولد تھا جب اس نے ہر جتن کر لئے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس نے بیحد مایوسی کے عالم میں تخت و تاج کو خیرباد کہنے کا ارادہ کر لیا۔ جب اس بات کا علم اس کے وزراء کو ہوا تو انہوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ مایوس نہ ہوں اور ہم نجومیوں کو بلا کر اس سلسلے میں دریافت کرتے ہیں۔ ان نجومیوں اور رمالوں نے بادشاہ کے ہاں اولاد نرینہ ہونے ہونے کی بشارت دی۔ میر حسن دہلوی کا بیان ملاحظہ ہو۔

بلاتے ہیں ہم اہل تنجیم کو	نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو
تسلی تو دی شاہ کو اس نمط	ولے اہل تنجیم کو بھیجے خط
نجومی و رمال اور برہمن	غرض یاد تھا جن کو اس ڈب کا فن

جب یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے ان سے کہا۔

نکالو ذرا اپنی اپنی کتاب	مرا ہے سوال اس کا لکھو جواب
نصیبوں میں دیکھو تو میرے کہیں	کسی سے بھی اولاد ہے یا نہیں
یہ سُن کر وہ رمال طالع شناس	لگے کھینچنے زائچے بے قیاس

---

[1] مرقع دہلی ص ۱۵

دھری تختی آگے لیا قرعہ ہاتھ | لگا دھیان اولاد کا اس کے ساتھ
جو پھینکیں تو شکلیں کئی بیٹھیں ہل | کئی شکل سے دل گیا اُن کا کھل
جماعت نے رمّال کی عرض کی | کہ ہے گھر میں امید کی کچھ خوشی[1]

میدانِ جنگ کے لئے روانگی سے پہلے نجومیوں کو طلب کیا جاتا تھا۔ اور ان کی بتائی ہوئی مبارک گھڑی میں کوچ کا نقارہ بجتا تھا۔ تخت نشینی کے سال بہادر شاہ نے راجپوتوں کی سرکوبی کے لئے کوچ کیا اس نے ۱۷ شعبان ۱۱۱۹ھ کو نجومیوں کی ہدایت کے مطابق اس مہم کے لئے قدم اٹھایا۔ اور درباری نجومیوں کے مشورہ کے مطابق اس نے خیرات تقسیم کی۔[2]

اسی طرح سرفراز خاں (والیٔ بنگال) نے اپنے درباری نجومیوں کے مشورہ پر ایک مبارک گھڑی میں اپنے دشمنوں سے مقابلہ کیا۔[3] حیدر بیگ[4] نجومیوں کا بڑا معتقد تھا۔ ان کے مشورہ کے مطابق بے حد خیرات کیا کرتا تھا۔ اور اس موقع پر لوٹ لاٹ میں لوگوں کا ہاتھ پیر زخمی اور مجروح ہو جاتے تھے۔ بعض مرتبہ وہ لوگ حیدر بیگ کو چاندی، تانبا اور کپڑوں میں تولا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی تانبا غربا میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ مزید براں جب کبھی اس کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا تھا تو اس موقع پر بھی وہ ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔[5] محمد فرخ سیر جب پٹنہ پہنچا تو اس نے وہاں پڑاؤ کیا۔ کیوں کہ کئی نجومیوں اور بالخصوص محمد رفیع نامی حکیم نے جو "از علم تنجیم بہرہ وافر داشت" اسے یہ مژدہ سُنایا تھا کہ وہ ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوگا۔[6]

---

[1] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۷-۲۰ [2] اروِن لیٹر مغلس (انگریزی) ۱/ص ۴۶، نیز ۱۳۶-۱۳۰
[3] FRANCIS GALDWIN: NAVRAFINE IN THE TRN SAETION OF BENGAL (1788) N.162
[4] نواب آصف الدولہ کا درباری امیر۔ [5] ابوطالب، تاریخ آصف الدولہ (انگریزی ترجمہ) ص ۷۹-۸۰ [6] خافی خاں ۲/ص ۷۰۸

میر قاسم (والیٔ بنگال) بھی ان پر پورا اعتقاد رکھتا تھا۔ اور ایک بار معزول ہونے کے بعد نجومیوں کی بشارت کے مطابق تمام عمر دوبارہ مسند حاصل کرنے کا انتظار کرتا رہا۔ [۱]

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس فن میں مہارتِ کلی رکھتی تھیں اور شمالی ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں موجود تھیں۔ جوان عاشق مزاج ان سے دریافت کرتے تھے کہ ان کو اپنی محبوبہ مل جائے گی یا نہیں۔ [۲]

اٹھارہویں صدی میں بہت سے لوگوں کو اس فن میں دستگاہ حاصل تھی۔ مثلاً محمد شاکر ناجی[۳]، قلندر بخش جرأت (در علم نجوم ہندیان ... مہارتے دارد)[۴] مرزا فدائی حسین خاں فدا[۵] اور حکیم محمد مومن خاں مومن۔ نجوم میں ان کو وہ مہارت حاصل تھی کہ بڑے بڑے منجم ان کا منہ دیکھا کرتے تھے[۶]۔ ایسے سینکڑوں ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

فال دیکھنے کا عام رواج تھا۔ اورنگ زیب بھی اس پر عقیدہ رکھتا تھا۔ اور دیوان حافظ سے فال دیکھا کرتا تھا۔ [۷]

شاہ عالم ثانی نے ایک موقع پر یہ کہاوت بیان کی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں

---

[۱] POLIR: SHAH ALAM II AND HIS COURT. P. 102-103

[۲] JAMES FORBES QRIENPAL HEWOIRS (1734) 1, P. 261 ,
262-264

[۳] تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی) ص ۱۲۳

[۴] تذکرہ ہندی (مصحفی) ص ۶۳

[۵] ایضاً ص ۱۰۲

[۶] مختصر تاریخ ادب اردو (از سید اعجاز حسین اعجاز) الہ آباد ۱۹۳۵ء ص ۱۱۸

[۷] منوچی جلد دوم۔ ص ۱۴۸

تعالوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور ان کی آمدنی بہت تھی۔ اس نے کہا

"نقل مشہور است کہ آنچہ بود دزد برد و آنچہ از دزد باقی ماند، رمال گرفت" [۱]

سحر افسوں پر اعتقاد

سحر اور افسوں گری کے فن کی ابتدا کب اور کس ملک میں ہوئی۔ اس موضوع پر بحث کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ لیکن اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ اسلام سے ماقبل وما بعد ایشیائی ممالک میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص جادوگری کا عام رواج پایا جاتا تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی ہندوستان کا پہلا مسلم سلطان تھا جس نے جادوگری کے فن کے قلع قمع کرنے کے لئے" اقدام کیا۔ بہ قول امیر خسرو سلطان نے "سحرۂ خون آشام" کو گردن تک زمین دوز کرواکر سنگسار کروادیا تھا۔ جادوگروں کا یہ گروہ بچوں کو زندہ کھا جاتا تھا۔ [۲]

اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ان مسلمانوں نے جو ہندی الاصل تھے۔ اور اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ اس فن سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ اور اس پر عمل کرتے رہے۔ باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں نے بھی رفتہ رفتہ اس فن میں دسترس کرلی اس کا بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسلمان جادوگری پر اعتقاد رکھنے لگے۔ کیوں کہ قرون وسطی میں افسوں گری کے کچھ ایسے واقعات منظرِ عام پر آئے کہ جاہل عوام ان سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ [۳]

---

[۱] روزنامچہ شاہ عالم (قلمی) جلد اول ص ۱۱۸ ب

[۲] خزائن الفتوح۔ ص ۲۰

[۳] منوچی کا بیان ہے "میں وضاحت اور تفصیل سے بیان نہیں کرسکتا کہ کس حد تک ہندستان کے ہندو اور مسلمان جادوگری کے عامل ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ لوگ ایک ایسے آدمی کے پیٹ میں مرغ کی بانگ کرادیتے ہیں جس نے مرغ کھایا تھا۔ تو کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کرے گا۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ میں نے بارہا پیٹ میں مرغ کو بانگ دیتے ہوئے سنا ہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۵۷ پر)

بہارستان غیبی کے مصنف (مرزا ناتھن) نے ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ جب میر شمس نے جو فنِ سحر گری میں کمالیت کا مرتبہ رکھتا تھا اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے شاہ کمال پر افسونگری شروع کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ کمال کے منہ سے خون بہنے لگا اور اسی ہفتے اس کا انتقال ہو گیا۔ بعد ازیں میر شمس نے مرزا ناتھن کو اپنا شکار بنانا چاہا۔ بدیں وجہ مرزا ناتھن سخت اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ اس زبوں حالی میں اس نے ڈھاکہ کے ایک درویش میاں عقیل محمد کو اس بارے میں لکھا۔ انہوں نے ڈھاکہ سے مرزا ناتھن کی صحت کی دعا کی۔ اور انہوں نے میر شمس پر جادو کیا۔ آخر میں مرزا ناتھن صحت یاب ہوا اور میر شمس موت کے منہ میں چلا گیا۔[1]

محمد فرخ سیر بادشاہ کے دور میں تقی نامی بھگتیہ سحرِ سامری[2] کا ایک کہنہ مشق اور کامل جادوگر تھا۔ شیوداس لکھنوی اس کے متعلق لکھتا ہے۔

"تقی نام بھگتیہ در علم موسیقی و فنون رقاصی و جادوگری و سحر سامری بکار بردہ، دلِ شاہ و حاضرینِ مجلس را غارت نمودہ نقدی نمایاں بطریق انعام بدست آوردہ در باب برفاہِ ساکنان محلہ خود معروض داشتہ"[3]

محمد امین خاں[4] (وزیر محمد شاہ بادشاہ) کا انتقال جادو کے اثر سے ہوا تھا۔ طباطبائی نے

بقیہ حاشیہ صہ ۵۵ : اس طرح کی مثالیں مجھے بارہا سنائی گئی ہیں۔" جلد دوم ص ۱۴۴

پھر وہ لکھتا ہے کہ مسلمان جادو کے اثر سے مگرمچھ کو مسحور کر لیتے ہیں۔ اور بڑی آسانی سے اس کو مار لیتے ہیں۔ جلد دوم ص ۹۴

---

[1] بہارستان غیبی (انگریزی) جلد دوم ص ۶۷۱ - ۶۷۲

[2] نام ایک شخص کا جو سامرہ نامی مقام کا باشندہ تھا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو گئوسالہ بنا کر گمراہ کیا تھا۔

[3] تاریخ فرخ سیر بادشاہ (قلمی) ص ۲۶۶

[4] برائے سوانحعمری ملاحظہ ہو ماثر الامرا (فارسی) جلد اول ص ۳۴۶ - ۳۵۰

اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔ نمود و انمود [۱] نے اپنی شعبدہ بازیوں اور سحر کاریوں سے اتنی مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ محمد فرخ سیر بادشاہ تک ایک عقیدت مند سائل کی طرح اس کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا لوگوں پر اور زیادہ اثر غالب آگیا اور اس سبب سے اپنے مقاصد کی برآری میں اسے بڑی تقویت ملی۔ جب محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں محمد امین خاں نے پایۂ وزارت حاصل کیا تو اس نے اس ملعون کو قید اور قتل کرنے کا حکم جاری کیا۔ جب سرکاری سپاہی نمود و انمود کے تکیہ میں پہنچے تو اس خبر سے وہ حیران اور متفکر ہو گیا۔ مگر صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو جس کا نام دید تھا مع چند نان کے جو جو اور گندم کی پکی ہوئی تھیں۔ باہر بھیجا اور پیغام دیا "آپ لوگوں نے تکلیف کی ہے۔ لہٰذا کچھ تناول فرمائیے۔ فقیر بھی ابھی آتا ہے۔" ابھی وزیر کے بھیجے ہوئے سپاہی نمود و انمود کے دروازے پر ہی تھے کہ انہوں نے یہ خبر سنی کہ وزیر کی حالت نازک ہو گئی ہے۔ یہ سنتے ہی وہ لوگ الٹے پاؤں وزیر کے دروازے پر آئے۔ جب وزیر کو بے ہوشی سے کچھ افاقہ

---

[۱] نام محمد حسین اور وطن مشہد تھا۔ جس زمانے میں عمدۃ الملک امیر خاں کابل کا گورنر تھا۔ محمد حسین اپنے وطن سے کابل آیا۔ اور عمدۃ الملک کی سرپرستی حاصل کی۔ اور اس نے اپنی متبنیٰ لڑکی کا اس سے عقد کر دیا۔ لہٰذا اس نسبت کی وجہ سے شاہی خوشبو خانہ کی داروغگی کے عہدہ پر اسے مامور کیا گیا۔ عمدۃ الملک کی وفات کے بعد محمد حسین لاہور وارد ہوا اور وہاں اس نے اورنگ زیب کی رحلت کی خبر سنی۔ جو مال و اسباب پشاور سے اپنے ساتھ لایا تھا، اس کو ساٹھ ستر ہزار میں فروخت کر کے فقیری کا لباس زیب تن کیا۔ اور مکر و فریب کے ذریعہ اپنا اقتدار بڑھانے لگا۔ ملاحظہ ہو۔ سیر المتاخرین۔ (ا۔ ت) ج ۲/ص ۷۰۔ ۷۱ برائے اولاد ایضاً۔ ج ۲/ص ۷۳۔ ۷۴

آخر میں اس کی اولاد مرشد آباد چلی گئی۔ اور عبدالقادر خانی نے 'دید فر' نامی کا ذکر کیا ہے:

علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اوّل۔ ص ۱۵۵

ہوا تو اس نے حکم کی تعمیل کا حکم صادر کیا۔ مگر ابھی اس کو موت سے مفر نہ تھا۔ وزیر کے لڑکے نے نمودوالنمود کی خدمت میں نذر بھیجی اور تعویز کی استدعا کی۔ اس نے جواب دیا "تیر از شست جستہ و آب از جوی رفتہ باز نمی آید" آخر میں محمد امین خاں نے اس جادو کے اثر سے رحلت فرمائی۔ [1]

مرزا مظہر جان جاناں نے خاص طور پر عورتوں میں افسوں گری کے عقائد کے قلع قمع کرنے کی بے حد کوشش کی۔ اور ان کو بیعت کرنے کی دیگر شرطوں کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ سحر و افسوں گری پر عقیدہ نہ رکھیں گی۔ [2]

انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں اہلیہ میر حسن علی نے لکھا تھا:

"مجھے مشکل سے کوئی شخص ایسا ملا ہوگا۔ جو اس بات کا عقیدہ نہ رکھتا ہو کہ افسوں اور وسائل خبیثہ کسی نہ کسی کے قبضے میں ہیں۔ اکثر بے پڑھیوں پر اس کی مشق کی جاتی تھی" [3]

دیوالی کے تہوار کے زمانے میں عام طور پر جادو اور ٹونے ٹوٹکوں پر عمل کیا جاتا تھا۔ بقول مرزا قتیل اس زمانے میں لیمو بھی بچوں کے گلے میں ڈالتے تھے۔ یہ عمل اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ ان دنوں اور راتوں کو اکثر جادوگر اپنے دشمنوں کے لئے جادو ٹونا کرتے تھے۔ اور مختلف قسم کی چیزیں مثلاً کیڑا یا مسور کی دال، زیرہ اور زرد چوب یا اسی قبیل کی کچھ چیزیں یا آٹے کا ایک پتلا بناتے تھے۔ جسے بزعم خود اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ پھر اسے رات کی تاریکی میں کسی گلی کے کونے میں یا سر بازار گاڑ دیتے تھے۔ تاکہ دشمن وہاں سے گزرے تو بلا میں مبتلا ہو جائے۔ یا کسی مرض میں

---

[1] سیر المتاخرین (ا-ت) جلد دوم ص ۷۲-۷۳

[2] معمولات مظہری۔ ص ۴۳

[3] نیز مراۃ الاصطلاح ص ۵۴ ب Observation etc. II, WH: 357-73

گرفتار ہو جائے۔[1]

ہندوستان میں قدیم زمانے سے بنگال کے جادوگر بڑے مشہور تھے۔[2]

بیدمشک نامی ایک درخت کے پتوں کو جھاڑ پھونک اور دفع سحر و افسوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔[3]

شادی بیاہ کے موقعوں پر اوہام پرستی

شادی بیاہ کے موقعوں پر قسم قسم کے اوہام پر عمل کیا جاتا تھا۔ اور آج بھی ان کی ادائیگی لوازم میں سے ہے۔ مثلاً نوشہ کے مکان کی باہری دیواروں پر عقائد باطلہ کے تحت تیل یا چونے سے کچھ نشانات بنائے جاتے تھے[4] موسل سے ناڑا باندھا جاتا تھا۔[5] ان کے علاوہ ایسی بہت سی رسمیں تھیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور ہندوستانی ماحول کے زیر اثر مسلمانوں میں مروج تھیں۔ ان رسموں کا شادی بیاہ کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔[6] برات کی روانگی سے ماقبل ٹونے ٹوٹکے کئے جاتے تھے۔ رشتے کی بات چیت شروع ہونے سے پہلے لڑکے کا باپ شگون نکلواتا تھا۔ اہلیہ میر حسن کا بیان ہے کہ کاغذ کے کئی پرزے کاٹے جاتے تھے۔ اور ان میں سے نصف پرزوں میں "ہونا" اور بقیہ نصف پر "نہ ہونا" لکھ دیا جاتا تھا۔ ان تمام پرزوں کو خلط ملط کر دیا جاتا تھا۔ اور جا نماز کے نیچے رکھ دیا جاتا تھا۔[7]

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو "ہفت تماشا" (ا۔ت)، ص ۸۲-۸۳۔ [2] خلاصۃ التواریخ ص ۴۸۔ [3] مرأۃ الاصطلاح ص ۴۴ ب۔ ۴۵ الف [4] تقویۃ الایمان (از مولانا اسماعیل شہید) ص ۷۷۔ [5] اس رسم کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ ناڑا: بہت سے نیلے اور سرخ رنگوں کے دھاگوں کو ملا کر بٹ کر بنایا جاتا تھا۔ اور موسل لکڑی کا بنا ہوا دھان کوٹنے کا آلہ ہوتا ہے جس سے کوٹ کر دھان سے چاول الگ کرتے ہیں۔ یہ رسم بنیادی طور سے ہندوانہ تھی۔ Observation etc. I, P. 392

[6] (Observation etc. I, PP 352-354 نیز قانون اسلام (انگریزی) ص ۸۴-۸۹

[7] برائے تفصیل مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی (نول کشور ۱۹۴۵) ص ۱۲۷

لگن دھرنے، برات کی روانگی اور نکاح کے لئے ساعت سعید کا بڑا دھیان رکھا جاتا تھا سلہ
اگر شادی کے بعد یا اسی زمانے میں کوئی حادثہ پیش آجاتا تو اس کی وجہ ساعت بد میں رشتہ کرنے
کی وجہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت امام قاسم کی شادی کے موقع پر جو حادثات پیش آئے اس کی وجہ
سودا نے بدشگونی بتایا ہے۔

یارو ستم تو یہ سنو چرخ کہن کا ٹھانا ہے عجب طرح سے بیاہ ابن حسن کا
بجوگ یہ کچھ باندھا ہے دولہا نے دلہن کا جو تار کفن کا ہے سو ڈورا ہے لگن کا سلہ

اسی طرح بابا فرید کے پوڑہ کا بالخصوص بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ بقول مرزا قتیل " اگر کوئی چاہے کہ
شادی میں بابا فرید کا پوڑا نہ ہو تو ممکن نہیں کہ اس کی بات اثر کر جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان
میں شادی عورتوں کے اختیار میں ہوتی ہے۔ اور عورتیں اگر وہ چیزیں جو شادی بیاہ کہ لوازم میں سے
ہیں، شادی میں نہ پائیں تو ملول و کبیدہ خاطر ہو جاتی ہیں۔ اور شادی کو مبارک نہیں سمجھتی ہیں۔۔۔۔
اب یہ رسم ہر گھر میں رائج ہو گئی ہے۔ اگر کوئی شخص اسے توڑتا ہے تو عورتوں کو بدشگونی کے خیال سے
ساری رات نیند نہیں آتی اور اس قسم کی شادی کو بہت برا اور منحوس خیال کرتی ہیں۔ اور شادی
کے بعد جو کچھ مثلاً دردِ سر، دردِ شکم، داماد کی قوت باہ میں فساد اور اولاد کی موت یا دولہا دلہن
کی موت سامنے آتی ہے۔ اس کو اس رسم کے توڑنے کے سبب سے سمجھتی ہیں۔ عورتوں کے نزدیک
جو کچھ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ رسومات کا ترک کرنا ہوتا ہے۔" سلہ

نثار اتارنا یا نچھاور کرنا | نظرِ بد اور غیر متوقع مصائب اور بلاؤں سے محفوظ۔۔۔۔

سلہ کلیات سودا۔ جلد دوم ص ۱۴۳-۱۴۶، ۱۷۰، ۱۹۰، ۳۰۸، ۲۹۶

سلہ ایضاً ص ۱۴۳

سلہ ہفت تماشا ص ۱۴۱-۱۴۲

رکھنے کی غرض سے نثار اتارنے کا رواج تھا۔ مثلاً جب نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے مراسم ادا ہوتے تھے۔ یا وہ کسی مہم کو فتح کر کے بخیر و عافیت واپس آتا تھا تو اس موقع پر نثار اتار کر وہ رقم غربا اور مساکین میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے جشن کے موقع پر یہ رسم عمل میں آئی تھی۔ محمد ساقی مستعد خاں کا بیان ہے۔ "بے شمار روپے اور اشرفیاں بادشاہ پر نچھاور کی گئیں۔ اہل استحقاق کو انعام واکرام عطا[1] ہوا۔ سید عبداللہ خاں[2] کے مقابلہ میں فتح مند ہو کر جب محمد شاہ بادشاہ شاہی محل میں داخل ہوا تو مستورات نے دروازہ پر اس کا خیر مقدم کیا، مبارکباد دی اور روپوں سے بھری تھالیں اس کے سر پر وار کر وہ روپیہ غربا میں بانٹ دیا گیا[3]۔

شاہ عالم ثانی نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں اپنے بارھویں تخت نشینی کے جشن کے موقع پر ذیل کے شعر میں اس رسم کا ذکر کیا ہے

حضرت رسول مقبول کی نیابت کیجئے اور دیجئے وار وار ہیرا موتی لال
شاہِ عالم بادشاہ تم کو مبارک ہوں جشن ہزاروں ایسے جیسے بارواں سال[4]

اسی طرح دیگر موقعوں پر بھی یہ رسم ادا ہوتی تھی۔ مثلاً جب دلہن کو ڈولی میں سوار کر دیا جاتا تھا اور کہار ڈولی اٹھا کر سوار ہوتے تھے تو اس موقع پر دولہا کے گھر والے پالکی یا ڈولی پر زر نثار کرتے چلتے تھے۔

چلے لے کے چنڈول جس دم کہار کیا دو طرف سے زر اس پر نثار[5]

(باقی آئندہ)

---

[1] مآثر عالمگیری۔ (ا۔ت) ص ۴۱۔ [2] برائے سوانح عمری ملاحظہ ہو مآثر الامراء (فارسی) جلد سوم ص ۱۳۵-۱۴۰
[3] سیر المتاخرین (ا۔ت) جلد دوم ص ۶۹۔ [4] نادرات شاہی ص ۸۲۔ [5] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی ص ۱۲۸

کرے ہے رخ پہ ترے مہ طباق زر کو نثار دکابی سیم کی ہی مہر ہر سحر وارے
دیوان جہاندار (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور، ۱۹۶۶ء) ص ۱۳۳

باب التقریظ والانتقاد

براعظم پاک وہند کی ملتِ اسلامیہ

سعید احمد اکبر آبادی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا شمار برِ صغیر پاک وہند کے نامور مورخین میں ہوتا ہے موصوف آج سے تیس برس پہلے اس وقت تاریخ وادب کے میدان میں اترے جب اس میدان میں خال خال شہسوار نظر آتے تھے۔ سلطنتِ دہلی کے نظم مملکت پر آپ کی پہلی کاوش بازار میں آتے ہی آپ کی شہرت برِ صغیر پاک وہند کے علاوہ یورپ اور امریکہ تک جا پہنچی۔ اور آپ عہدِ سلطنت کے ایک بڑی سند سمجھے جانے لگے۔ علمی اور ادبی مشغلے کے ساتھ آپ نے تحریک آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور آپ کی خدمات کو خود بانیٔ پاکستان نے سراہا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد آپ کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں بحیثیت صدر شعبۂ تاریخ ہوا لیکن جلد ہی لیاقت علی خاں مرحوم نے آپ کو اپنی کابینہ میں شامل کرلیا۔ جب وزارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو آپ امریکہ چلے گئے۔ اور وہاں کی بلند پایہ درسگاہوں میں علمِ تاریخ پڑھاتے رہے۔ اسی زمانہ میں آپ نے اپنی قابلِ قدر تصنیف THE MUSLIM COMMUNITY OF THE INDO-PAKISTAN SUB CONTINENT. کے لیے مواد جمع کیا

لہ از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی - مترجم ہلال احمد زبیری - ضخامت ۳۹۶ صفحات، فہرست اسناد محولہ، اشاریہ خوبصورت ٹائپ، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۶ روپے - پتہ: شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی کراچی۔

جسے آپ نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جسے جناب ہلال احمد زبیری نے کراچی یونیورسٹی کی طرف سے شائع کیا ہے۔

برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی کا جو مقام ہے، وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف تاریخ داں بلکہ ایک ماہر تعلیم اور مفکّر کی حیثیت سے بھی ممتاز ہیں۔ آپ نے برسہا برس کے غور و فکر کے بعد زیر تبصرہ کتاب تحریر فرمائی ہے اور اس عرصہ میں آپ کے خیالات میں جو پختگی آئی ہے اس کی نمایاں جھلک زیر تبصرہ کتاب میں نظر آتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ تاریخ کے طلبا کے لیے نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ فاضل مصنّف نے حضرت مجدّد الف ثانیؒ، اورنگ زیب عالمگیر، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، اور سر سید احمد خاں پر جو ابواب لکھے ہیں وہ اس کتاب کی جان ہیں۔ ان ابواب میں آپ نے ایک نیا انداز، ایک نئی فکر اور تحقیق کا ایک نیا میدان اہل علم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ زیر نظر کتاب کا نصف آخر نصف اوّل کی بہ نسبت بدرجہا بہتر ہے۔

بایں ہمہ اس کتاب میں کچھ خامیاں بھی رہ گئی ہیں جن کی ذمہ داری فاضل مصنّف کی بجائے مترجم پر عاید ہوتی ہے۔ اکثر جگہ ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی صفحہ پر ایک نام مختلف ہجوں میں لکھا گیا ہے مثلاً جیمور اور جمور، شیواجی اور شواجی، مہارانا پرتاپ اور مہارانا پرتاب ڈی گو بجے اور ڈی گوئرٹے، وینٹورا اور دینتورا، وغیرہ۔ ایک عام قاری اس سے یہی تاثر لیتا ہے کہ مترجم کو خود یہ معلوم نہیں کہ ان لفظوں کے اصلی ہجے کیا ہیں۔ اسی طرح مترجم نے بعض لفظوں کے ہجے اس طرح اپنائے ہیں کہ پڑھنے والے کی طبیعت پر گراں گذرتے ہیں مثلاً سمہ کی بجائے سماء، بلہرا کی بجائے بلہاما، چمبہ کی بجائے چمبا، سومرہ کی بجائے سمرا، دیبل کی بجائے دابل، بھڑوچ کی بجائے بڑوچ اور کارو منڈل کی بجائے کرد منڈل۔ وغیرہ۔

علاوہ ازیں کچھ ٹائپ کی غلطیاں بھی کتاب میں رہ گئی ہیں مثلاً صفحہ ۲۰۰ پر A.G. ARBERRY کی جگہ A.J. ARBERRY ہونا چاہئے۔ اسی طرح الکامل فی تاریخ کی جگہ، الکامل فی التاریخ، آثار صنادید کی جگہ، آثار الصنادید۔ قلعہ الاموت کی جگہ قلعہ الموت، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی کتاب کا نام ردّ رفاوض کی جگہ ردّ روافض، اور ان کا سال وفات ۱۰۲۴ھ کی جگہ ۱۰۳۴ اور بحر المواج کی جگہ بحر مواج ہونا چاہئے تھا۔

اسی طرح اکثر جگہ محاورات کا استعمال اور انداز بیان بھی قابل اعتراض ہے۔ مثلاً ایک جگہ "یہ خبر دربار میں آئی" (ص ۱۷۳) تحریر ہے اور "خبر آنا" کا محاورہ ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ بعض جگہ مترجم نے انگریزی زبان کو اردو میں ڈھالنے میں بڑی لاپروائی سے کام لیا ہے۔ مثلاً ص ۵۲ پر یہ عبارت پڑھنے والے کی طبیعت پر گراں گذرتی ہے:

" سنیوں کے اسلحہ خانہ میں صرف ایک ہتھیار ایسا تھا جو مذہبی تبلیغ کے ماہر اسمٰعیلی مبلغین کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا اور جس کی کامیابی کا کوئی امکان تھا" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح کے ترجمہ سے گریز ہی بہتر ہے۔ اسی طرح ص ۲۱۳ پر یہ عبارت: "اگر اکبر کو اودے پور کے مہارانا پرتاب سے بھگتنا پڑا تھا تو دارا شکوہ کو شیواجی سے بھگتنا پڑتا" بالکل مہمل اور بے معنی ہے۔ اسی طرح ص ۱۷۹ پر مشہور اسلامی اصول کی جگہ مسلّمہ اسلامی اصول ہوتا تو مناسب معلوم ہوتا۔ اسی طرح مترجم نے اکثر مواقع پر تصوّف کی بجائے صوفیت کی نئی اصطلاح استعمال کر کے عبارت کا مزہ کرکرا کر دیا ہے۔

جہاں تک فاضل مصنف کا تعلق ہے وہ بھی معصوم عن الخطا نہیں ہیں اور ان سے بھی کئی قابل گرفت لغزشیں ہوئی ہیں۔ مثلاً ص ۵۸ پر انھوں نے سید جلال الدین (سرخ پوش) بخاری اور سید جلال الدین (مخدوم جہانیان) جہانگشت کو ایک ہی ہستی ظاہر کیا ہے حالانکہ مؤخر الذکر، اول الذکر کے پوتے ہیں۔ اسی طرح ص ۶۱ پر انھوں نے سلطان سخی سرور (متوفی ۱۱۸۱)

کو سید علی ہجویریؒ (متوفی ۱۰۷۵ء) کا مرید بنایا ہے۔ جو حقیقت سے بعید ہے۔ اسی طرح صلہ ۲۰
کے مطالعہ سے قاری یہ تاثر لیتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی اکبر کی بجائے دارا شکوہ کے خلاف
برسرپیکار رہے اور یہ کہ یہ دونوں ہمعصر تھے۔ فاضل مصنف نے صفحہ ۷ پر یہ تحریر فرمایا ہے کہ
ملا شیری نے سورج کی مدح میں ایک ہزار اشعار لکھ کر اکبر کو دیئے تھے حالانکہ اس جگہ یوں
ہونا چاہئے تھا کہ ملا شیری نے سنسکرت زبان میں سورج کے ہزار نام اکبر کو منظوم کر کے
دیئے تھے۔ اسی طرح صلہ ۲۳۱ پر نظام الملک آصف جاہ اول کو مغل حاکم لکھا ہے
جو حقیقت سے بعید ہے۔ صلہ ۱۴۷ پر ڈاکٹر صاحب نے بیرم خاں اور شیخ گدائی کے شیعہ
ہونے پر شبہ ظاہر فرمایا ہے جو مزید ثبوت کا محتاج ہے۔ اسی طرح صلہ ۱۷۰ پر آپ ملا عبد النبی کو حنفی
ظاہر کرتے وقت یہ فراموش کر گئے ہیں کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کی نسل سے تھے۔ اور اسی وجہ سے علماء
ان کے خلاف تھے کہ وہ امام صاحب کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی قتل مرتد کے
مسئلہ میں امام صاحب کے مسلک کے پابند نہ تھے۔ آپ نے صلہ ۲۶۷ پر جو یہ تحریر فرمایا ہے
کہ سکھوں نے معرکۂ بالاکوٹ کے بعد سید احمد شہیدؒ کی میت کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہا دی
تھی، ابھی مزید ثبوت کا محتاج ہے۔

یوں کہنے کو تو یہ "برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کی تاریخ" ہے لیکن اس میں مسلم لیگ
کے علاوہ دوسری سیاسی تحریکوں کا ذکر تک نہیں آیا۔ مجلس احرار اور خاکسار تحریک کے ذکر
سے یہ کتاب یکسر خالی ہے۔ اسی طرح ملت اسلامیہ کی تاریخ کی تدوین کے وقت دار العلوم
دیوبند کی ایک صدی کی دینی خدمات سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد
گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد الیاس کی خدمات کا ذکر
سرے سے بھی نہیں آیا۔ مولانا ظفر علی خاں تو تحریک آزادی کے علمبردار تھے اور ان کا شمار ان
بزرگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اس صدی کے آغاز میں ملتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے
بیدار کیا۔ اگر مولانا ابو الکلام آزاد کا ذکر اس کتاب میں آسکتا ہے تو مولانا ظفر علی خاں سے

کیا قصور سرزد ہوا جو ان کا ذکر تک اس کتاب میں نہیں آیا۔ اس سے بھی زیادہ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ سرسید احمد خاں اور علی گڈھ تحریک پر فاضل مصنف نے بڑا لمبا چوڑا باب باندھا ہے لیکن اس میں نواب وقار الملک کا نام تک نظر نہیں آتا۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی تحریک کا ذکر بھی اس کتاب میں مفقود ہے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی خدمات اور سابق صوبہ سرحد میں صاحبزادہ عبدالقیوم کی اشاعتِ علم کی سرگرمیوں کے ذکر سے بھی یہ کتاب یکسر خالی ہے۔ حالانکہ انجمن اور صاحبزادہ نے وہی کام کیا جس کے لیے سرسید احمد خاں عمر بھر کوشاں رہے۔ ان وجوہات کی بنا پر ایک عامی یہ کتاب پڑھ کر یہ تاثر لیتا ہے کہ یہ کتاب ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک خاص سیاسی نظریہ کے تحت لکھی گئی ہے حالانکہ اگر یہ "ملت اسلامیہ" کی تاریخ تھی تو اس میں ان تحریکوں کا بھی ذکر آنا چاہیے تھا جن کے نظریات سے فاضل مصنف کو اتفاق نہیں۔ ان باتوں کے باوجود اس کتاب کا مطالعہ تاریخ کے طلبا اور اہل علم کے لیے سودمند ہوگا۔

اردو کتابوں پر انعام   میر ایوارڈ

آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۶۷ء کی حسب ذیل کتابوں پر میر ایوارڈ دیا گیا۔

۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھنؤ یونیورسٹی کی کتاب ـــــ رجب علی بیگ سرور پر چھ سو روپے

۲۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی کتاب ذوق و جستجو چار سو روپے۔

۳۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی کتاب ـــ گلشنِ ہند۔ پر دو سو پچاس روپے

۴۔ پنڈت بال مکند عرش ملسیانی کے شعری مجموعہ ـــ شرار و سنگ پر دو سو پچاس روپے

آل انڈیا میر اکادمی کی طرف سے ہر سال اردو کی بہترین علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی، تخلیقی، اور شعری مطبوعات پر میر ایوارڈ پندرہ سو روپے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۶۸ء کی مطبوعات جو ایوارڈ میں شامل کرنے کے لئے بھیجی جائیں۔ ان کی پانچ پانچ جلدیں جناب مظفر احمد لاری صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا میر اکاڈمی، اقبال منزل، وزیر گنج، لکھنؤ کے پتے پر ۱۰ دسمبر ۱۹۶۹ء تک پہنچ جانی چاہیئیں۔

اکادمی کی طرف سے ہر سال ساڑھے تین تین سو روپے کے چھ ادبی وظیفے بھی دئے جاتے ہیں۔
۱۹۶۸ء کے لئے یہ وظیفے اکادمی نے اصحاب ذیل کو پیش کئے جانے کا اعلان کیا ہے۔

۱۔ محمد اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر بمبئی۔ ۲۔ وفا ملک پوری ایڈیٹر صبح نو پٹنہ۔ ۳۔ سید منتخب الاکرام، مرزا پور۔ ۴۔ سکھدیو پرشاد بسمل الہ آباد۔ ۵۔ نازش پرتاب گڑھی، پرتاب گڑھ۔ ۶۔ مائل ملیح آبادی، ملیح آباد۔

ادبیات

معارف .. .. الم مظفر نگری

صبح آتی ہے لئے خندۂ شوخ وبیباک — اور ہے شام کے چہرے پہ نقاب صد چاک
خامشی رات کی ہے ایک سکوتِ مادر — اور دن کی ہے یہ شورش کوئی طفلِ چالاک (۱)

وہ خیالات جو لفظوں سے حیا کرتے ہیں — دل کے نغمات میں یوں رقص کیا کرتے ہیں
جس طرح باغ میں بادِ سحری کے جھونکے — ہمرہِ سایۂ گل ناچ لیا کرتے ہیں (۲)

اوس نے جب کششِ ذوقِ تجلی دیکھی — وقتِ پرواز گلستانِ جہاں سے بولی
پھول بن کر ہوں مرے خواب بھی تا زینتِ باغ — اس لئے کرتی ہوں سورج سے محبت میں بھی (۳)

قطرۂ شبنم ترپھول پہ جو رقصاں ہے — دُرِ خوش آب ہے یا انجم سحر تاباں ہے
چشم تحقیق سے دیکھا تو ہوا یہ معلوم — انقلابوں کا جو خالق ہے یہ وہ طوفاں ہے (۴)

مے گلرنگ سے لبریز ہیں پھولوں کے ایاغ — بوئے گل مرکز خوشبو کا لگاتی ہے سُراغ
کعبۂ عشق کی ہر شام اسی فکر میں ہے — مردِ مومن کوئی لے آئے یہاں اپنا چراغ (۵)

صبح دم ہنس کے یہ سورج سے گل تر نے کہا — کون سا میں ترے جلووں کو سناؤں نغما
سن کے سورج نے کہا اس سے کہ اے جانِ چمن — تیری خاموشی ہی نغمہ ہے اسے گائے جا (۶)

غزل .. .. سعادت نظیر

کس سے دیکھا جائیگا ایسا قیامت کا سماں — درمیاں دل ہے، ادھر بجلی، ادھر ہے آشیاں
نغمۂ دل رفتہ رفتہ نالۂ دل بن گیا — واہ، فرطِ کیفِ الفت! آہ، صد ظلمِ جہاں
ہے جنونِ شوق سے حیرت میں دنیائے خرد — آج راہِ کارواں بننے لگی ہے کہکشاں
نالۂ بے ساختہ ہو ترجمانِ دل تو ہو — اضطرابِ غم کہاں پابند الفاظ و بیاں؟
آتشِ غم نے جلا کر کر دیا ہے گرچہ خاک — پھر بھی رہ رہ کے دلِ غمگیں سے اٹھتا ہے دھواں
دل کی دل ہی میں مرے لے کاش اڑ جاتی نظیر — سننے والوں نے کہاں سے بات پہنچائی کہاں

تبصرے

انگریزی ترجمہ قرآن مجید، از ڈاکٹر سید عبداللطیف، تقطیع متوسط، ضخامت ۵۸۰ صفحات، ٹائپ، روشن، قیمت مجلّد -/۳۰ - پتہ:-

اکاڈمی آف اسلامک اسٹڈیز، حیدر آباد دکن

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت برصغیر ہند و پاک کے علمی اور اسلامی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ موصوف ایک عرصہ تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں انگریزی زبان و ادبیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے ہیں۔ اس خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ اسلامیات کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد قابل قدر کتابیں آپ کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ اب یہ آخری کارنامہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ہے جو دوسری مشغولیتوں کے ساتھ بیس برس کی مدت میں تکمیل کو پہنچا ہے۔ اس کا آغاز دراصل مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمائش اور خواہش پر ان کے ترجمان القرآن کے ترجمہ سے ہوا تھا جو چھپ کر الگ سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ لیکن ترجمان صرف اٹھارہ پاروں پر مشتمل تھا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے مزید بارہ پاروں کا ترجمہ کر کے قرآن مکمل کر دیا۔ اور اسے ایک ہی جلد میں شائع کر دیا ہے۔ آغاز چونکہ مولانا کی فرمائش اور خواہش سے ہوا تھا اس بنا پر انگریزی میں اس ترجمہ کا انداز بعینہٖ وہی ہے جو اردو میں ترجمان القرآن کا ہے (اور یہی انداز مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کے ترجمہ کا بھی ہے) یعنی ترجمہ لفظ بلفظ یا جملہ بجملہ نہیں ہے جس سے مطلب اور مراد کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ بلکہ قرآن مجید کی ایک یا زیادہ آیتوں میں جو ایک بات کہی گئی ہے اس کو محاورہ اور زبان کی رعایت کے ساتھ انگریزی میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ زبان کی شگفتگی اور اس کی فصاحت و بلاغت کا کیا کہنا! پروفیسر آربیری کے بعد اس معیار کا ہم نے یہ دوسرا ترجمہ دیکھا ہے۔ اور اس

لیے امید ہے کہ انگریزی دانوں میں یہ کافی مقبول ہوگا۔ شروع میں ۳۶ صفحات کا ایک طویل مقدمہ بھی ہے جس میں قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات اور علم کلام کے بعض مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن غالباً ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر آج کل کے اعلیٰ تعلیمیافتہ غیر مسلموں کو قرآن اور اسلام سے قریب لانا رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ ان پر تصوّف کا غلبہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے اوّلاً عبادات کا ذکر بہت سرسری کیا ہے۔ اور ثانیاً بعض مسائل کی تشریح اس انداز میں کی ہے کہ علماء کا ایک بڑا طبقہ اس سے اتفاق نہیں کرسکتا، یا کم از کم اس پر مطمئن نہیں ہوسکتا۔ مثلاً وحدتِ ادیان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے گویا ترجمان القرآن کے اس حصّہ کو ہی انگریزی کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اور خود مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے بعض خطوط میں جو چھپ بھی گئے ہیں اس سلسلہ میں بطور تشریح و توضیح جو کچھ لکھا تھا اسے نظر انداز کرگئے ہیں۔ اسی طرح شرک اور مشرک کے بارے میں (ص ۳۰) جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شرک سیاسی بغاوت کا ہی نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خیال سے زیادہ لائق توجّہ تو وہ ہے جو علامہ سیّد رشید رضا نے تفسیر المنار میں آیت وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ کے ماتحت لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلّے اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ تمام دنیا کی طرف ہے اس لیے سب انسان آپ کی امّت ہیں۔ البتّہ امّت کی دو قسمیں ہیں ایک امّتِ اجابت اور دوسری امّتِ دعوت۔ مسلمان پہلی قسم میں داخل ہیں اور غیر مسلم دوسری قسم میں۔ اس بنا پر اب دنیا میں کوئی مشرک ہی نہیں ہے۔ اور قرآن میں جن کو مشرکین کہا گیا ہے ان سے مراد صرف مکّہ کے لوگ ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہرحال اس نوع کے چند مباحث سے قطع نظر ترجمہ کا یہ مقدمہ بھی مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قرآن مجید کا ہندی ترجمہ

از جناب نند کمار صاحب اوستھی۔ تقطیع کلاں ضخامت ایک ہزار تیس صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت -/۳۶۔ پتہ: نیپالی پریس، رانی کٹرہ، لکھنؤ ۳۔

اوستھی جی جو ہندی زبان کے مشہور مصنف اور مقالہ نگار ہیں لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے سالہائے دراز کی مسلسل محنت وکاوش کے بعد آخر قرآن مجید کا ہندی ترجمہ مکمل کر کے شائع کر دیا۔ ترجمہ کی زبان اس قدر سہل ہے کہ گویا اگرچہ رسم الخط دیوناگری ہے لیکن زبان ہندوستانی ہے۔ ترجمہ کے ساتھ تشریحی نوٹ بھی ہیں۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ترجمہ و تشریح کے معتبر و مستند ہونے کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ ایک ذمہ دار عالم اور ہندی کے فاضل مولانا مفتی محمد صدیق صاحب دار المبلغین لکھنؤ نے ترجمہ و تشریح کا ایک ایک لفظ بڑی احتیاط اور توجہ سے پڑھا ہے۔ اور اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ: "مجھ کو پورا اطمینان ہے کہ یہ ترجمہ صحیح اور قابل اعتماد ہے۔ مستند مفسرین کے ترجموں اور تفسیر کے مطابق ہی ہندی میں ترجمہ اور تفسیری نوٹ لکھے گئے ہیں۔" مولانا کی یہ تحریر اور مولانا سید ابوالحسن علی میاں کا پیش لفظ دونوں شروع میں درج ہیں۔ پھر لائق مترجم نے صرف ترجمہ اور تشریح و تفسیر پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ قرآن مجید کے اصل عربی متن کے ساتھ اس متن کو ہندی رسم الخط میں بھی لکھا ہے اس سلسلہ میں ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چونکہ عربی میں وہ حروف جو اسی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں ان کو صحیح مخارج کے ساتھ ادا کرنے کے لیے ہندی میں پہلے نہ حروف موجود تھے اور نہ اصطلاحات، اسی بنا پر فاضل مترجم نے ہندی رسم خط میں کچھ ایسے اضافے کیے اور ایسی اصطلاحات مقرر کیں جن سے عربی حروف کو ان کے صحیح مخارج کے ساتھ ہندی میں ادا کرنے کی دشواری حل ہو سکے۔ ظاہر ہے یہ کام انتہائی صبر آزما اور محنت طلب ہے لیکن فاضل مترجم اس منزل سے بھی بڑی ہمت اور استقلال کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ امید ہے کہ ارباب ذوق

اس ترجمہ اور حواشی سے فائدہ اٹھا کر فاضل مترجم کی محنت و مشقت اور ان کے جذبہ شوق کی داد دیں گے۔

تفہیم المسلم جزو اوّل ، مرتبہ : ہلال صاحب عثمانی ۔ تقطیع کلاں ۔ ضخامت ۱۱۸ صفحات ۔ کتابت وطباعت بہتر ۔ قیمت ۳/۵۰ ۔

پتہ :- دار المعارف ، دیوبند ضلع سہارن پور ۔

کتب حدیث میں مسلم کا جو مرتبہ ہے محتاجِ بیان نہیں ۔ بخاری اور مسلم دونوں کو ملا کر ہی صحیحین بولتے ہیں ۔ اس اہمیت کے باعث ہر دور میں علماء نے اس کتاب کی کبھی شرح لکھ کر ، کبھی اس کا اختصار کر کے اور کبھی اس پر تخریج کر کے ، مختلف صورتوں میں اس کی خدمت کی ہے ۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے ۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ۔ نوجوان لائق مرتب مولوی فضل الرحمن ہلال جو دیوبند کے عثمانی خانوادہ علم و فضل کے چشم و چراغ ہیں اور اس بنا پر ذوقِ مطالعہ و تالیف ان کا خاندانی ورثہ ہے ۔ انھوں نے صحیح مسلم کی شرح اس انداز میں لکھنے کا منصوبہ بنایا ہے کہ کتاب کے درس یا اس کی شرح کی تالیف کے سلسلہ میں متعدد اکابر علماء و اساتذہ دیوبند نے جو کچھ فرمایا یا لکھا ہے اس سب کو اپنی سلیس اور شگفتہ زبان میں یکجا کر دیا ہے اور اس طرح یہ کتاب ایک نہیں متعدد شروح کا مجموعہ اور اس بنا پر اس کی افادیت بھی دو چند بلکہ سہ چند ہو گئی ہے ۔

زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جو امام مسلمؒ کے حالات ، مختصراً اصولِ حدیث ، کتب حدیث میں صحیح مسلم کا مقام اور ترجمہ صحیح مسلم کے مقدمہ اور کتاب الایمان پر مشتمل ہے ۔ اگر یہ سلسلہ مکمل ہو گیا تو اس میں شبہ نہیں کہ اردو میں حدیث کی بڑی اہم خدمت ہو گی جس سے عام اردو داں حضرات کے علاوہ مدارس عربیہ کے اساتذہ اور طلباء بھی

استفادہ کر سکیں گے۔

نفسِ مناظرہ

جلد دوم۔ از جناب سید نہال احمد صاحب نقوی مرحوم تقطیع خورد ضخامت ۳۶۸ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد -/۴/- پتہ:- سید شفیق المرتضیٰ صاحب نقوی۔ ۱۹۲۹ حویلی میر فضل لال کنواں، دہلی ۶

اس کتاب کی پہلی جلد پر چند ماہ ہوئے ان صفحات میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ یہ دوسری جلد ہے جس میں فدک، متعہ، حضرت غوث اعظم کا نسب (بعض شیعہ ان کی سیادت کا انکار کرتے ہیں)، ان تین مباحث پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف مرحوم کی محنت اور شوق بیحد قابل داد ہے کہ ایک پنشن یافتہ سرکاری افسر ہوتے ہوئے شیعہ اور سنیوں کی تمام کتابیں کھنگال ڈالیں اور پھر اپنے حاصلِ مطالعہ کو بڑے سلیقہ اور خوش اسلوبی سے مرتب کر دیا۔ مناظرہ کی نفسیات یہ ہے کہ فریق ثانی پر تو اس کا اثر ہوتا نہیں ہے بلکہ بات کی پیچ اور بڑھ جاتی ہے البتہ سنیوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے اس سے ان کو معلوم ہوگا کہ ان کے اور شیعہ حضرات کے درمیان مختلف فیہا مسائل کون کون سے ہیں اور ان کے دلائل کیا ہیں؟

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد ۶۳ | شوال المکرم ۱۳۸۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۹ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

(۲)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

النبار العظیم

نظرات

۱۸۵۷ء میں ہندوستان غلام ہوا اور دس کم ایک سو برس بعد ۱۹۴۷ء میں آزاد لیکن جہاں تک عملی حقائق کا تعلق ہے۔ ان دونوں مواقع پر مسلمانوں کے لیے صورت حال یکساں ہی رہی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مسلم ہو گیا تو ان کے غیظ و غضب اور جذبۂ انتقام کا سب سے بڑا نشانہ مسلمان بنے۔ یہ تختۂ دار پر چڑھے جلا وطن کیے گئے۔ ان کی جائدادیں اور جاگیریں ضبط ہوئیں۔ قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اور جو نہ ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ سوچیے! آزادی کے صدقہ میں مسلمانوں کو جو حالات و واقعات پیش آئے اور جن کا سلسلہ اب بھی ختم نہیں ہوا۔ کیا وہ کسی درجہ میں ان سے کم تھے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ زیادہ ہی تھے۔ حالانکہ دونوں صورتوں میں جو فرق تھا وہ ظاہر ہے پہلی صورت استعمار کی تھی اور اس میں سابقہ ایک ایسی قوم سے پڑا تھا جو اجنبی اور پردیسی تھی اور جو زبان۔ کلچر۔ مذہب شکل و صورت اور تمدن غرضکہ ہر چیز میں مسلمانوں سے مختلف تھی اس کے علاوہ وہ حاکم تھی اور یہ محکوم۔ وہ فاتح تھی اور یہ مفتوح۔ اس کے برخلاف ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا واسطہ ایسی قوم سے تھا جس کے ساتھ مسلمانوں کے ملکی اور وطنی روابط عرصۂ دراز سے تھے اور جس کے ساتھ میل جول سے اس ملک میں ایک نئی زبان اور ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی تھی پھر یہاں سوال حاکم و محکوم اور فاتح و مفتوح کا نہیں تھا بلکہ ہندو اور مسلمان سب باہم برادران وطن تھے اور اسی بنا پر انگریز کی غلامی سے نجات پانے میں دونوں برابر کے شریک۔ اب سوال یہ ہے کہ جب معاملہ یہ تھا تو پھر یہاں کے مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء دونوں میں ایک ہی قسم کے حالات و واقعات سے کیوں دوچار ہونا پڑا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غلامی اور آزادی۔ اجنبی اور ملکی کے فرق و امتیاز کے باوجود

۱۸۵۷ء میں ملک کی حکومت اس قوم کے ہاتھ میں آئی تھی جس کے دل پر صلیبی جنگوں کی ہیبت کاریاں اب تک نقش ہیں، اور اسی طرح ۱۸۵۷ء میں اقتدار ان لوگوں کو ملا تھا۔

جنہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

اور جن کو اورنگ زیب اور شیواجی کی معرکہ آرائیاں فراموش نہ ہوئی تھیں۔ انگریزی کہاوت TIME IS THE BEST HEALER کے مطابق امتداد زمانہ سے پرانے زخم بھرنے لگتے ہیں چنانچہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں دونوں فرقوں کے تعلقات خوشگوار ہو گئے اور پرانی داستانیں بھولی بسری یاد بن گئیں لیکن ملک پر انگریزوں کے اقتدار کے بعد حکومت وقت کی ایک خاص پالیسی اور اس پر خاموش عمل کے باعث دونوں فرقوں کے تعلقات پھر خراب ہونے شروع ہوئے اور نوبت آئے دن کے فسادات تک آ گئی۔ اس دوران تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادی کے شروع میں ایک مرتبہ پھر ایسا زمانہ آیا جسے ہم عہد اتفاق و دوستی کہہ سکتے ہیں لیکن تحریک پاکستان نے گذشتہ صدیوں کی پوری تاریخ پر پانی پھیر دیا۔ پرانے زخم ایک ایک کر کے سب ہرے ہو گئے اور پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ! ہندو اور مسلمان دونوں کے باہمی تعلقات کی یہ فضا تھی جس میں ملک تقسیم ہوا۔ اس تقسیم کے نتیجہ میں پاکستان کے نام سے جو ایک اسلامی ملک بنا تھا چونکہ اس کی بنیاد ہی دو قومی نظریہ تھا اس بنا پر ہندوؤں میں شعوری یا نیم شعوری طور پر اس احساس کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ جس طرح پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اسی طرح بھارت کو بھی ایک ہندو راشٹر ہونا چاہیئے۔ اور یہ احساس صرف مسلمانوں کے مقابلہ میں ہی ہو سکتا تھا کیونکہ انکے علاوہ ملک کی کسی اور اقلیت نے نہ دو قومی نظریہ کا پرچار کیا اور نہ اس کی اساس پر ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ بھارت کے مسلمانوں کے حق میں تقسیم کے اور جو بھی ثمرات ہوں ایک سب سے برا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے ہندو مسلم تعلقات پر اثر انداز ہونے والا ایک مستقل ملک عالم وجود میں آ گیا۔ اگر ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات خوشگوار اور دوستانہ ہوتے تو یقیناً اس کا اثر یہاں کے ہندو مسلم تعلقات پر اچھا اور خوشگوار ہوتا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے اور دونوں ملک ایک دوسرے کے حلیف نہیں بلکہ حریف ہیں۔ اس بنا پر جب کبھی پاکستان

کی طرف سے اینٹی انڈیا کوئی حکومت ہوگی ہندو ذہن پر مسلمانوں کے خلاف اس کا ردِ عمل ہونا ناگزیر ہوگا

غرضکہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ ملک غلامی سے آزاد تو ضرور ہوا لیکن ان ہولناکیوں تباہ کاریوں اور قسم قسم کے خطرات اور وساوس کے ساتھ اس صورت حال کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اس میں شبہ نہیں کانگرس کا یہ کارنامہ بہت زیادہ قابل تعریف اور لائق داد ہے کہ اس زہرآلود اور متعفن فضا میں بھی ملک کے لیے ایک سکولر اور ہر لحاظ سے جمہوری دستور منظور کر لیا گیا۔ لیکن فسادات اس کے بعد بھی نہیں رُکے۔ بلکہ ان میں شدت اور زیادتی ہی پیدا ہوتی چلی گئی اور صرف فسادات کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ ابھی حال میں یہ راز بھی کھلا ہے کہ سردار پٹیل نے اپنی وزارتِ داخلہ کے زمانہ میں حکومتوں اور دفتروں کے نام ایک سرکلر اس مضمون کا بھیجا تھا کہ فلاں فلاں ملازمتوں میں مسلمانوں کو نہ لیا جائے۔ سنا ہے کہ اس سرکلر کو حال میں ہی منسوخ کیا گیا ہے۔ بہرحال سرکلر کا اس طویل مدت تک نافذ رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ ملک کی آزادی اور تقسیم کے سلسلہ میں جو سخت بھیانک قسم کے واقعات پیش آئے ان کے باعث عوام تو عوام خود خداوندان حکومت کا ذہن مسلمانوں کی طرف سے مسموم تھا۔ اب سوال ہو سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد چند سال تک حالات بڑے صبر آزما رہے لیکن جہاں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان ہوا گویا مطلع صاف ہو گیا۔ ملک میں امن و امان قائم ہوا اور زندگی کا معیار نارمل ہو گیا" لیکن ۱۹۴۷ء کے جلو میں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ آج اتنے عرصہ کے بعد بھی ان کا انسداد نہیں ہوا۔ حالانکہ ادھر دستور بھی ہے۔ حکومت کے اعلانات اور وعدہ وعید بھی اور قومی یک جہتی کونسل کی مساعی و کوشش بھی! یہ کیوں؟

اس کی ایک وجہ تو انگریز اور ہندو میں بحیثیت قوم کے جو فرق ہے وہ ہے انگریز عہد حاضر کی نہایت ترقی یافتہ۔ مہذب اور شائستہ قوم ہے۔ ان کے نظامِ حکومت طریق حکمرانی کی عظمت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ یہ جس ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اپنے مسائل و معاملات پر غور و فکر کرتی اور پھر جو رائے قرار پا جائے اس پر اجتماعی ہم آہنگی اور پختہ عزم و ارادہ کے ساتھ عمل کرتی ہے اس کا اعتراف دوست دشمن سب کو ہے۔ اس قوم کے کیرکٹر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے

جذبات ہمیشہ عقل کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو جن لوگوں سے واسطہ تھا وہ تعلیم و تربیت۔ تہذیب و شائستگی علم و فن اخلاق اور کیرکٹر کے اعتبار سے مقابلتہً جس درجہ اور معیار کے تھے یا رہیں وہ ظاہر ہی ہے۔ علاوہ ازیں ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا واسطہ صرف حکومت سے تھا اس بنا پر حکومت نے جب تک چاہا ظلم کیا اور جب اس نے ظلم کو خلافِ مصلحت سمجھ کر اپنا رُخ بدلا اور ایک نئی پالیسی کا اعلان کیا تو ظلم ختم بھی ہو گیا اور اعلان میں جو کچھ کہا گیا تھا اس پر عمل بھی ہونے لگا۔ اس کے برخلاف یہاں معاملہ یہ تھا کہ حکومت جمہوری تھی یعنی طاقت دراصل عوام کے ہاتھ میں تھی اور ظاہر ہے جمہوریت کی لغت میں عوام کے معنی ہمیشہ اکثریت کے ہوتے ہیں اور اکثریت جیسی کچھ تھی یا ہے وہ دنیا کو معلوم ہے اور اکثریت ہی کو کیا کہئے جیسا کہ سردار پٹیل کے مذکورہ بالا سرکلر سے ظاہر ہے سکولرزم اور جمہوریت کے دعاوی کے باوجود خود حکومت کا ہی دماغ مسلمانوں کی طرف سے صاف کب تھا؟ پنڈت جواہر لال نہرو اور ان جیسے چند آدمی کھلے اور صاف ذہن کے ضرور تھے۔ لیکن ان کو اپنی قوم کے ساتھ یا تو غیر معمولی حسن ظن تھا اور یا انہیں اپنی لیڈرشپ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا جس کے باعث وہ یہی سمجھتے رہے کہ قوم ان کے بنائے ہوئے دستور اور ان کے بار بار کے اعلانات اور تقریروں پر عمل کرے گی اور ان کی ہدایتوں کو گوش ہوش سے سنے گی انہیں اس کا اندازہ ہی نہیں ہوا کہ فرقہ وارانہ نفرت و فساد کا مادۂ فاسد کس طرح قوم کی رگ رگ میں رچ بس گیا ہے اور وہ کس طرح بہانہ بہانہ سے پھوٹ پڑنے کے لیے بے چین ہے۔

ہم نے آج کی صحبت میں ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے حالات و واقعات کا مسلمانوں کی نسبت سے ایک تقابلی جائزہ لے کر اس کے اسباب و وجوہ کا مختصراً تذکرہ کیا ہے۔ اب آئندہ قسط میں ہم اس پر گفتگو کریں گے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جو مسلم قیادت ابھری وہ ان حالات سے کس طرح عہدہ برآ ہوئی اور اگر اس طرح کی کوئی قیادت ۱۹۴۷ء کے بعد یہاں ہوتی تو اسے کیا کرنا چاہئے تھا۔

چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں

چند آفاقی دلائل کا جائزہ

مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی بنگلوری
(اسلامیہ لائبریری۔ چک۔ باآور۔ بنگلور نارتھ)

ایک تاریخی حادثہ امریکی خلابازوں نے چاند فتح کر کے بعض مذہبی حلقوں میں ایک کھلبلی پیدا کر دی ہے خصوصیت کے ساتھ ہندو فرقے کے عقائد متزلزل ہو چکے ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ان کے مذہبی ایوانوں میں صف ماتم بچھ گئی ہے۔ کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق چاند دیوتاؤں کا دیس ہے۔ اور انسان کا چاند کو مسخر کر لینے سے ان دیوتاؤں کی برتری ختم ہو جاتی ہے۔

چنانچہ مجھ سے ایک ہندو دوست نے (جو کچھ روشن خیال تھے) کہا کہ اب خدا بڑی مشکلوں میں پڑ گیا ہے (معاذ اللہ)۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا بھگوان ضرور مشکلوں میں پڑ گیا ہو جس کی حیثیت آپ لوگوں کی نظر میں "تینتیس کروڑ" تمام نہاد دیوتاؤں میں ایک بے دست و پا قیدی سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر الحمد للہ ہمارے خدا پر یہ بات صادق نہیں آتی جو وحدہٗ لاشریک، قادر مطلق اور خدائے جل جلالہ کہلاتا ہے اور ہماری کتاب برحق کی تصریحات کے مطابق تسخیر قمر سے ہمارے ایمان میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

بہرحال بعض ہندو لوگوں نے برملا کہنا شروع کر دیا ہے کہ امریکی باشندوں نے جس چاند پر تسخیر کے جھنڈے گاڑے ہیں وہ ہماری زمین کا چاند نہیں بلکہ کوئی اور چاند ہوگا۔ اسی کو کہتے ہیں کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ بغرض "اپالو ۱۱" کی کامیاب پرواز ایک ایسا تاریخی حادثہ ہے جس نے بعض فرسودہ مذاہب کی چولیں ہلا دی ہیں۔

چاند کی تسخیر اور موجودہ مسلمان

یہ تو ایک غیر اسلامی فرقے کا حال تھا جس کا معاملہ وہ خود جانے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن لوگوں کی فہم و دانش کو کیا ہو گیا ہے جو اپنے آپ کو اسلام کا نام لیوا سمجھتے ہیں اور ایک ایسی حیرت انگیز کتاب کے حامل ہیں جو اس عالم آب و گِل میں اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہے اور قیامت تک دینی معاملات کے ساتھ ساتھ ہر دنیوی معاملے میں بھی ان کی بصیرت و رہنمائی کے لیے کافی ہے؛ پھر ایسی یکتا و بے مثال کتاب کی تصریحات سے آنکھیں بند کر کے وہ بھی ہندو فرقے کی ہمنوائی یا کم از کم صریح توہمات کا مظاہرہ کس طرح کر سکتے ہیں؛ چنانچہ بعض مسلمان حلقوں تک میں بعض ایسے مضحکانہ خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے جن کو سن کر ہنسی آتی ہے۔ مثلاً بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا واقعی امریکی باشندے چاند پر ہو آئے ہیں یا خالی خولی ڈھونگ رچا رہے ہیں؛ یا مثلاً انسان آسمانی حدود میں کیسے داخل ہو سکتا ہے؛ فرشتوں نے ان لوگوں کو چاند پر کیسے پہونچنے دے دیا؛ اور آتشیں گرزوں سے ان کی خبر کیوں نہیں لی؛ کیا یہ بات خدائی امور میں مداخلت کے مترادف نہیں ہے؛ وغیرہ وغیرہ۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہیں۔ اور اس قسم کے تمام سوالات کتاب اللہ سے ناواقفیت کی دلیل ہیں۔

اسلام اور کلیسا

اب سب سے پہلے بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان اگر چاند کو مسخر کر لے تو اس سے آخر اسلام کے کون سے عقیدے پر ضرب پڑتی ہے اور اس کے کن کن تصورات کو دھکا پہونچتا ہے؛ کیا قرآن و حدیث میں کہیں یہ لکھا ہوا ہے کہ انسان چاند یا دیگر سیاروں پر نہیں پہنچ سکتا؛ یا معاملہ اس کے برعکس ہے؛

ظاہر ہے کہ اسلام کلیسا (CHURCH) کی قسم کا کوئی مذہب نہیں ہے جس نے دینی و دنیوی معاملات میں فرق نہ کر کے بڑی زبردست حماقت کا ثبوت دے دیا اور ہر نئی تحقیق کو خلافِ مذہب قرار دیکر فتنوں کے دروازے کھول دئے جس کے باعث بڑے تلخ نتائج اور خونیں ہنگامے برپا ہوئے۔ اور کلیسا کی اس مجرمانہ ناعاقبت اندیشی ہی کی بنا پر مادیت (MATTERIALISM) نے جنم لیا۔ جس کے عواقب و نتائج ہی کی بدولت آج تقریباً پورا عالم انسانی خدا فراموشی کا عالمگیر مظاہرہ اور پرچار کرتے

ہوئے عریاں تہذیب کا ننگا ناچ ناچ رہا ہے۔

یہ تھا عیسائی مذہب کا حال۔ اب اسلام کی طرف آیئے تو ہمیں اس کے سائے میں سکون و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے دامن میں افراط و تفریط کے درمیان ایک عدیم المثال توازن نظر آتا ہے۔ چنانچہ اسلام جس طرح دینی معاملات میں رہبری کرتا ہے۔ اسی طرح دنیوی امور میں بھی بڑی انوکھی اور کامیاب رہنمائی کرتا ہے جس کا تصور بھی ہمیں کسی دوسرے مذہب یا صحیفے میں نہیں مل سکتا۔

قرآنی علوم پنجگانہ

یہ بات خوب سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن حکیم میں جتنے بھی مضامین مذکور ہیں اصولی حیثیت سے ان کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ علم احکام دینی انفرادی و اجتماعی تمام معاملاتِ زندگی میں انسان کی رہنمائی۔

۲۔ علم مخاصمہ یعنی وہ علمی مذاکرات و مباحثات جو گمراہ فرقوں یعنی یہود و نصاریٰ اور منافقین و مشرکین کے ساتھ کئے گئے ہیں۔ ان ہی مباحثات سے تمام عقائد کی تنقیح ہو جاتی ہے اور ایمانیات کا ایک ایک باب کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

۳۔ صحیفہ تاریخ کے ذریعہ عبرت و بصیرت: چنانچہ گزشتہ پیغمبروں اور اقوامِ عالم کے حالات و واقعات قرآن اسی نقطۂ نظر سے بیان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اس علم کو قرآنی فلسفۂ تاریخ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ نظامِ کائنات کے ذریعہ تذکیر و انتباہ: یعنی مظاہرِ کائنات کے بیان سے خدا کے احسانات و نوازشات کے ذریعہ انسان کے جذبۂ احسان شناسی کو جھنجوڑتے ہوئے خدا پرستی کی دعوت دینا اور مظاہرِ کائنات کے حیرت انگیز نظام سے خدا کے وجود، اس کی قدرت، ربوبیت اور اس کی بے نظیر حکمت و مصلحت پر استدلال کرنا۔

۵۔ علمِ آخرت۔ یعنی اخروی زندگی کے حالات و تفصیلات۔

(ملاحظہ ہو الفوز الکبیر۔ از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ)

شاہ صاحبؒ کا کارنامہ

یہ بڑی فلسفیانہ تقسیم ہے۔ اور قرآن کا کوئی بھی بیان ان پانچ قسم کے مضامین

سے باہر نہیں جا سکتا۔ اور اس وقت میرا موضوع بحث چوتھے علم سے ہے یعنی "مظاہر کائنات کے ذریعہ تذکیر اور انتباہ" جس کو شاہ صاحبؒ نے "التذکیر بآلاءاللّٰہ" (اللہ کی نعمتوں کے ذریعہ سبق آموزی) قرار دیا ہے۔ موصوف نے یہ عنوان قائم کر کے اپنی تبحر علمی اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں یہ عنوان اتنا موزوں نظر آرہا ہے کہ شاہ صاحب کی علمی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے۔ اور پھر اس موضوع سے متعلق تمام قرآنی مباحث کی روح اس عنوان میں سمٹ آئی ہے۔

صحیفۂ ہدایت وبشارت

بہر حال قرآن مجید میں نظام کائنات ـــ جس کو آپ چاہیں تو سائنسی امور بھی کہہ سکتے ہیں ـــ کا بیان ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا مقصد وقتاً فوقتاً نوع انسانی کو مختلف حیثیتوں سے متنبہ کرتے رہنا اور خدا پرستی پر استدلال کرنا ہے۔ قرآن حکیم چونکہ ایک ابدی وسرمدی صحیفۂ ہدایت ہے اس لیے اس میں خدائی اسکیم ومنصوبے کے مطابق کائنات کے تمام راز ہائے سربستہ یا دوسرے لفظوں میں اسرار ربوبیت کا بیان پہلے سے رکھ دیا گیا ہے۔ جو اس کے کتاب الٰہی ہونے کی واضح ومستحکم دلیل ہے۔ اور قرآن کریم میں اسرار کائنات کے بیان کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سدا بہار کلام پر کسی بھی دور میں کہنگی کی پرچھائیاں پڑنے نہ پائیں اور وہ کبھی فرسودہ یا آؤٹ آف ڈیٹ نہ ہونے پائے۔

وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ۔

اور آسمان وزمین میں ایسی کوئی پوشیدہ چیز (سربستہ راز) نہیں ہے جو (اس) کھلی کتاب میں موجود نہ ہو (نمل: ۷۵)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ۔

(اے مخاطب) کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں سے واقف ہے؟ (مجادلہ: ۷)

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔

اور اس نے ہر چیز پیدا کی ہے اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ (انعام: ۱۰۱)

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ

جس نے پیدا کیا ہے کیا وہ خود ہی ناواقف رہ سکتا ہے بھلا؟

اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ۔ وہ بڑا باریک بین اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے (ملک: ۱۴)

حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ کو تمام مظاہر کائنات کا خالق ہونے کے ناطے ہر چیز کا علم حاصل ہے اور اس نے ہر چیز کی خبر پہلے سے اپنی کتاب میں دے رکھی ہے۔ اس لحاظ سے دنیا میں جتنی بھی سائنٹفک تحقیقات ہوں گی اور انسانی کوششوں سے جو بھی راز ہائے فطرت دریافت ہوتے جائیں گے ان کی روشنی میں کتاب الٰہی کا چہرہ مزید روشن ہو جائے گا۔ یعنی اس کے وہ بیانات جو نظام کائنات سے متعلق ربانی اسکیم کے مطابق پہلے سے اس میں درج ہیں، ان کی صداقت کھل کر سامنے آجائیگی پھر قرآنی بیانات اور نظام کائنات کی اس تطبیق و ہمنوائی کے نتیجے میں اہل ایمان کے چہرے تروتازہ ہو جائیں گے، ان کے بشرہ پر رونق آجائے گی اور ان کے پائے ثبات میں بجائے لغزش و کپکپاہٹ کے ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عظیم کو صحیفۂ ہدایت و رحمت کہنے کے ساتھ ساتھ اس کو صحیفۂ بشارت بھی قرار دیا گیا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (اے محمدؐ) ہم نے تجھ پر وہ کتاب اتاری جو ہر چیز کو خوب کھولنے والی ہے۔ اور فرمانبرداروں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے (نحل: ۸۹)

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ۔ کہدے کہ اس کلام کو روح القدس (جبریلؑ) نے تیرے رب کی طرف سے مطابقت کے ساتھ اتارا ہے تاکہ وہ ایمان والوں کے قدم جمائے رکھے۔ اور وہ مسلمین کے لیے ہدایت و بشارت ہو (نحل: ۱۰۲)

طٰسٓ، تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُبِينٍ۔ هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ طاسین یہ قرآن اور کتاب روشن کی آیات ہیں، جو ہدایت و بشارت ہیں ان اہل ایمان کے لیے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ (نمل: ۱-۳)

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ کیا ان کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر وہ کتاب اتاری

الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْھِمْ، اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَۃً جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے، یقیناً اس میں مومن قوم وَّذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ کے لیے رحمت اور یاددہانی (ہوشکاوا) موجود ہے۔ (عنکبوت: ۵۱)

قرآن ایک اپٹوڈیٹ کتاب

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ یعنی اس کے مضامین خمسہ (جن کی تفصیل اوپر گزر چکی) کا بیان اصولی حیثیت سے پوری وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جس کے بعد کسی قسم کی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ اسی بنا پر آخری آیت میں فرمایا کہ کیا یہ کتاب اور اس کے حیرت انگیز بیانات ان کے اطمینان قلب کے لیے کافی نہیں ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اس عجیب و غریب کتاب میں ہر قسم کی عبرت و بصیرت کا پورا پورا سامان جمع کر دیا گیا ہے۔ جس کے ملاحظہ سے ہر قسم کے امراض ذہنی کے جراثیم نکل جاتے ہیں اور ہر قسم کے دماغ کی ذہنی دھلائی (BRAIN WASHING) ہو جاتی ہے۔ اسی لیے فرمایا:-

مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ۔ ہم نے اس کتاب میں کوئی کوتاہی نہیں کی (انعام: ۳۸)

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ اور ہم نے نوع انسانی کے لیے اس قرآن میں ہر ایک مثال مِنْ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ۔ بیان کر دی ہے تاکہ وہ چونک سکے (زمر: ۲۷)

وَکُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰہُ تَفْصِیْلًا۔ اور ہم نے ہر چیز خوب تفصیل سے بیان کی ہے (اسراء: ۱۲)

قرآن عزیز کا بنیادی موضوع (BASIC SUBJECT) ہدایت و رہنمائی ہے اور اس کے مباحث وہ علوم خمسہ ہیں جن کا بیان اوپر گذر چکا ہے۔ ان میں سے علم احکام اور علم آخرت تو اصل سرچشمہ ہیں اور بقیہ علوم مذکورہ بالا اصل تک پہونچنے کے ذرائع ہیں۔ لہٰذا فلسفۂ تاریخ اور نظام کائنات کے ذریعہ دراصل اس سرچشمہ ہدایت کی طرف لانا اور متنبہ کرنا مقصود ہے۔

اس لحاظ سے ان تمام مباحث سے متعلق ہر چیز کی علیٰ وجہ البصیرت پوری پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ یعنی جس تفصیل سے علم احکام کا بیان ہوا ہے، اسی طرح علم مخاصمہ، نظام کائنات، فلسفہ، تاریخ اور علم آخرت کا بھی بیان ہوا ہے۔ اور یہ تمام ضمنی بیانات بطور تذکیر و تہدید بیان

ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی اس خصوصیت کو اجاگر کرنے کے لیے عموماً ذکر، ذِکری اور تذکرہ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ مثلاً:۔

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ یہ قرآن سارے جہان کے لیے ایک یاد دہانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ (قلم: ۵۲)

اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔

کیا ان لوگوں کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر ایسی کتاب اتاری ہے جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؛ یقیناً اس میں ایمان لانے والوں کے لیے رحمت و بصیرت موجود ہے (عنکبوت ۵۱)

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۔

بلاشبہ یہ ایک سبق ہے، پس جو چاہے اپنے رب کی طرف راہ اختیار کرے (مزمل: ۱۹)

یعنی اس میں ہر قسم کے ذہن و دماغ کو مطمئن کرنے کے لیے اسباق و معارف پوری طرح رکھ دیئے گئے ہیں۔ بس اب ہر ایک کو اختیار ہے کہ چاہے راہ ہدایت اختیار کرے یا ابدی خسران کا مستحق بن جائے۔

ذکر اور ذِکری ایک حیثیت سے مصادر ہیں جن کے معنی ہیں یاد کرنا، یاد آجانا اور چونکنا وغیرہ اور اسم (حاصل مصدر) ہونے کی صورت میں ان تینوں کے معنی ہیں: یاددہانی، موعظت بیان، چونکانے والی چیز یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ کوئی بھولی بسری حقیقت یاد آجائے یا تنبیہہ حاصل ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ الفاظ بیسیوں مرتبہ بکثرت استعمال کئے گئے ہیں۔ تاکہ نوع انسانی کو وقتاً فوقتاً چونکایا اور متنبہ کیا جاسکے۔

قرآن مجید ایک انوکھا کلام ہے جس میں اختصار کے ساتھ ہر قسم کے اسباق و معارف اس طرح جمع کردیئے گئے ہیں کہ کوئی ضروری چیز چھوٹنے نہیں پائی ہے۔ اور ربانی اسکیم کے مطابق اس کے وہ اسباق و معارف جو نظام کائنات سے متعلق ہیں صرف اسی وقت منظر عام پر آسکتے ہیں جبکہ

خود علم انسانی کسی نئی منزل سے آشنا ہو۔ بالفاظ دیگر انسانی کوششوں سے جیسے ہی کائنات کا کوئی سربستہ راز دریافت ہوتا ہے اس راز سربستہ کا انکشاف کتاب اللہ میں ایک بالکل اچھوتے اور سبق آموز انداز میں مل جاتا ہے جو دلائل آفاق یا تذکیر و انتباہ کا روپ دھار کر نوع انسانی کو چونکا دیتا ہے۔

اس لحاظ سے زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے، انسان چاند اور دیگر سیاروں پر کمندیں کیوں نہ ڈال لے اور ہمارے نظام شمسی کو پار کر کے دیگر ستاروں اور کہکشاؤں کو کیوں نہ فتح کرلے، کتاب اللہ کے روشن چہرے پر کہنگی کی پرچھائیاں کبھی اور کسی صورت میں نہیں پڑ سکیں گی۔ اور اس کے حیرت انگیز کلمات کسی بھی دور کے انکشافات و تحقیقات سے پیچھے نہیں رہ سکیں گے۔ بلکہ قیامت تک کے تمام احوال و کوائف اور علمی خبروں کا تذکرہ اس "سدا بہار خبر نامہ" میں ایک اعجازی انداز کے ساتھ مل جائے گا۔ بالفاظ دیگر اگر انسان زہرہ یا مریخ پر بھی پہونچ جائے تو قرآن عظیم اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا بلکہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہ کر ہمیشہ اس کو درس انسانیت دیتا رہے گا۔

بہرحال قرآن حکیم میں تازہ بتازہ حالات اور علمی خبریں کچھ اس انداز میں بیان ہوتی ہیں اور اجتماعی حالات و نفسیات کا نقشہ ایک ایسے معجز نما اسلوب (STYLE) میں کھینچا گیا ہے کہ اس میں تمام زمانوں کی مشترکہ روح یا مشترکہ عناصر سمٹ آئے ہیں گویا کہ ہر دور کی نمائندگی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری جس علم کا بھی ماہر اور جس دور کا بھی نمائندہ ہو قرآن حکیم میں اس کو اپنی اور اپنے ہی دور کی داستان نظر آئے گی گویا کہ ہر دور والوں کو قرآن کریم کے آئینے میں اپنی ہی صورت شکل دکھائی دیتی رہے گی۔ جیسا کہ فرمایا:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔

ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا تذکرہ (داستان) موجود ہے۔ کیا تم (اپنی ہی داستان) نہیں سمجھو گے؟ (انبیاء - ۱۰)

یہ قرآن حکیم کا اتنا عجیب و غریب اور حیرت ناک پہلو ہے جس کو دیکھ کر عقل انسانی دنگ اور

مبہوت و ششدر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر مضمون الگ الگ باب کے تحت مذکور نہیں
ہے بلکہ تمام مضامین ایک حکیمانہ ربط کے ساتھ باہم خلط ملط اور گڈمڈ کر دیئے گئے ہیں تاکہ ہر دو
میں غور و فکر کے ذریعہ اس سے نئے نئے نکات اور اسرار و معارف نکالے جاسکیں۔ بہر حال ایک
دوسرے موقع پر اس بات کی وضاحت بھی کردی کہ قرآن حکیم میں اس قسم کے تازہ بتازہ حالات
(نوعِ انسانی کا اجتماعی تذکرہ) بیان کرنے کی اصل غرض و غایت کیا ہے؛

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ۔ بَلْ أَتَيْنٰهُم بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَن ذِكْرِهِم مُّعْرِضُونَ۔

اگر (دینِ) حق ان لوگوں کی خواہشات کا تابع ہو جاتا تو ارض و سماوات اور ان میں موجود شدہ مخلوقات (کا نظام ہی) بگڑ جاتا نہیں بلکہ ہم تو ان کے پاس ان ہی کی داستان لے آئے ہیں مگر وہ اپنی ہی داستان سے منہ موڑ رہے ہیں (دو مومنون)

مطلب یہ کہ اگر وقتاً فوقتاً اس طرح تنبیہہ و انتباہ سے کام نہ لیا جائے تو پھر نئے حالات اور زما
کی نئی کرتوتوں کے باعث نظام عالم درہم برہم اور کائنات روحانی متاثر ہو جائے گا جیسا کہ آج تسخیر
کے باعث مذہبی حلقوں میں ایک کھلبلی پیدا ہو گئی ہے اور بعض علماء تک فکری انتشار کا شکار ہو کر
سٹپٹا گئے ہیں، اور انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ حالانکہ قرآن عظیم میں ہر چیز کا بیان موجود
ہے اور اس پر اوراقِ پارینہ ہونے کی چھاپ کبھی نہیں لگ سکتی جیسا کہ روشن خیال طبقوں کا خیا
خام ہے۔

اس بنا پر کتاب الٰہی میں تمام جدید مباحث سے متعلق کافی و شافی بیانات بھی موجود ہیں او
تذکیری حیثیت سے ان پر مختصر و جامع تبصرے بھی۔ تاکہ عصری علوم میں کتاب الٰہی کا مرتبہ ہمیشہ بالکل
ممتاز و نمایاں رہے۔ اور دوسری حیثیت سے ایک طرف اس کے پیروؤں کی تسکینِ قلب کا سامان
بھی مہیا ہوتا ہے تو دوسری طرف منکرین و معاندین پر حجت بھی پوری ہوتی رہے۔ بغرض یہی و
تمام وجوہات ہیں جن کی بنا پر اس کتاب حکمت کو گلہائے رنگ رنگ سے آراستہ کر کے ایک سدا بہ
گلدستہ حیات بنا دیا گیا ہے، جس کی عطر بیز بوں سے مشام جاں ہمیشہ معطر رہتا ہے۔ اس موضو

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب "قرآن مجید اور سائنس" یا "کلور وفل اور قرآن"۔

نظام کائنات اور دلائل آفاق

حاصل یہ کہ اسرار فطرت کا بیان قرآن مجید میں ایک ایسے انوکھے طریقے پر کیا گیا ہے کہ علم انسانی (نظام کائنات متعلق) جب کسی نئی منزل میں داخل ہوگا تو "ربانی انکشافات" (دلائل آفاق) اچانک ذکر، ذکری اور تذکرہ بن کر نمودار ہوجائینگے (شاہ صاحبؒ کی زبان میں التذکیر بآلاء اللہ کا روپ دھاریں گے (تفصیل اگلے صفحات میں آرہی ہے)۔

یوں تو قرآن مجید کے معانی و مطالب کسی بھی دور میں مہمل و بے معنی نہیں ہوتے، مگر بعض آیات کا جب اصل مفہوم واضح ہوتا ہے تو لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال "زوج کریم" ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ یہ قرآن حکیم کا اتنا انوکھا روپ اور اس کی نیرنگی کلام کا ایسا تحیر خیز معجزہ ہے جس کی مثال پیش کرنے سے پورا انسانی لٹریچر عاجز و بے بس ہے۔

قرآن مجید چونکہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی پیام ہدایت ہے اس لیے اس میں ہر قسم کے علمی و عقلی اور آفاقی و انفسی دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ اور نظام کائنات سے تعارض کرنے کی اصل غرض و غایت قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر آفاقی و انفسی دلائل فراہم کرنا ہے تاکہ وہ ایک درخشاں ستارے کی طرح آسمان ہدایت پہ چمکتا اور کائنات روحانی کو منور کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

ان ھو الا ذکر للعٰلمین۔ و لتعلمن نباہ بعد حین۔	یہ قرآن تو سارے جہاں کے لیے موعظت ہے۔ اور تم اس کی (سچائی) کی خبر ایک مدت کے بعد ضرور معلوم کروگے (ص: ۸۷ - ۸۸)
طٰسٓمٓ۔ تلک اٰیٰت الکتٰب المبین o لعلک باخع نفسک الا یکونوا مؤمنین۔ ان نشا ننزل علیھم	طا سین میم۔ یہ کتاب روشن کی آیات ہیں۔ شاید تم اس بات پر اپنی جان گنوا بیٹھو کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ایک ایسا نشان اتار دیں جس کے

مِنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (شعراء ۱-۹)

آگے ان کی گردنیں جھک جائیں۔ اور جب کبھی ان کے پاس خدائے رحمٰن کی جانب سے کوئی نیا تذکرہ آتا ہے تو وہ منھ موڑ لیتے ہیں پس یہ لوگ (خدائی تذکرہ کو) جھٹلا چکے ہیں۔ لہٰذا عنقریب ان کے پاس اس چیز کی خبریں پہونچ جائیں گی جس کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کیا انھوں نے روئے زمین کا مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے اس میں ہر قسم کے کتنے ہی شریف و معزز (نر و مادہ نباتات) اگا دیئے ہیں؛ یقیناً (نباتات کے اس قانونِ زوجیت) میں ایک بہت بڑی واضح نشانی موجود ہے۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور بلاشبہ تمہارا ہی رب غالب اور رحم دل ہے (جو ان منکرین سے تو سمجھ لے گا اور مومنین کے ساتھ رحمدلی کا برتاؤ کرے گا)

سورہ ص اور سورہ شعراء کی آیات کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے کلام کی حقانیت واضح کرنے اور منکرین پر حجت پوری کرنے کے لیے قطعی و فیصلہ کن آفاقی و انفسی دلائل فراہم کرے گا جن کے انکار کے بعد "سنت الہٰی" کے مطابق ان منکرین و معاندین کو سزا دی جائے گی۔

دلائل آفاقی کی ایک مثال پھر سورۂ شعراء کی ان ہی آیات میں معجزہ اور دلائل آفاق کی حقیقت پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ بجائے آسمان سے کوئی فوق العادۃ معجزہ اتار دینے کے ہم نے زمین ہی میں ہر قسم کی عبرت و بصیرت کا سامان پیدا کر دیا ہے جو درحقیقت معجزہ ہی کے قائم مقام ہے۔ یعنی ہر ایک پیڑ پودا اپنی جگہ پر ایک حیرت انگیز تخلیقی معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو ہے تو نظام فطرت یا سلسلۂ اسباب و علل ہی کے روپ میں، مگر اپنے بے مثال نظم و ضبط کے باعث ایک خارق عادت چیز سے کسی بھی طرح کم نہیں۔

اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی چونکہ ظلمت و تاریکی کا زمانہ لد گیا اور علم و تحقیق کی صبح نمود

ہونے لگی اس لیے اب بجائے فوق العادت معجزات کے آفاقی و انفسی دلائل کو جگہ دی گئی ۔ جو خلاق عالم کی مزاج شناسی کی بھی ایک بین دلیل ہے ۔ یعنی زمانے کی نبض اور رفتار کو دیکھتے ہوئے چند نئے قسم کے تیر بہدف نسخے تجویز کئے گئے جو آج کی بیمار اور جان بلب انسانیت کے لیے اکسیر کا حکم رکھتے ہیں ۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آیات زیر بحث میں بجائے ایک "آسمانی نشان" کے ایک "زمینی نشان" کو اہمیت دی گئی ۔ جیسا کہ فرمایا : " اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیَۃً " یہ نباتات کا تذکرہ ہے ، اور اسی تذکرہ میں نباتات کی سیرتوں کے ایک عجیب و غریب پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔ جس میں نوع انسانی اور خصوصیت کے ساتھ موجودہ عریاں تہذیب کے متوالوں کے لیے ایک آفاقی سبق موجود ہے ۔

یوں تو نباتات کی زندگی کے سارے ہی مظاہر معجزانہ حیثیت رکھتے ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ ان کے نظام ازدواج ــــ جس کو علم نباتات کی اصطلاح میں عمل زیرگی (POLLINATION) کہا جاتا ہے ــــ میں اتنے شریفانہ و کریمانہ اور منظم قوانین کی پابندی ہو رہی ہے کہ ایک خدا کا وجود تسلیم کئے بغیر ان منظم و منضبط قوانین کی کوئی صحیح توجیہہ و تعلیل ممکن ہی نہیں ہو سکی ۔

چنانچہ نباتات میں بھی حیوانات ہی کی طرح نر و مادہ پائے جاتے ہیں ، اور ان کی بارآوری کا ایک طریقہ یہ ہے کہ شہد کی مکھیوں ، حشرات ، پرندوں اور ہوا وغیرہ کے ذریعہ نر پھول کا زیرہ (POLLEN GRAINS) مادہ پھول تک پہونچ جاتا ہے ۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک نوع کا زیرہ دوسری نوع کا پھول قبول کر لیتا ہو ۔ بلکہ ہر نوع صرف اپنی ہی نوع کا زیرہ لیتا ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ جب کارخانۂ حیات کے مظاہر خود بخود رواں دواں ہیں تو آخر ایک نوع کا دوسری نوع سے زیرہ لینے میں کون سی چیز مانع ہے ؟ اب وہ کون ہستی ہے جو ان نباتات کی سیرتوں کی نگرانی کر رہی ہے ؟ آخر ان پیڑ پودوں میں حرامی نسل کیوں نہیں ظاہر ہو جاتی ؟ انار کے درخت میں سنترہ کیوں نہیں اگ جاتا ؟ یا گلاب کے پودے میں روئی کیوں نہیں نمودار ہو جاتی وَقِس علیٰ ذٰلک ۔

نقاش فطرت نے نباتات کو "زوج کریم" کے معزز خطاب سے نواز کر ان کے سروں پر کریمیت کا تاج رکھ دیا ہے۔ یہ نباتات کی سیرتوں میں نظم وضبط اور ڈسپلن یا اطاعت الٰہی کا اتنا زبردست ترین مظاہرہ ہے کہ خلاق فطرت کی حکیمانہ تخلیق کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے اور "کل لہ قانتون" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب " نباتات سے انسانیت تک"۔

" زوج کریم" کا یہ حیرت ناک اور عبرت انگیز مظاہرہ علم نباتات (BOTANY) کی ترقی کے باعث روشنی میں آسکا ہے۔ مگر آج کی سائنس نباتات کی سیرتوں کے اس پہلو سے بالکل آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔ اب یہ قرآن عظیم کا کمال ہے کہ جدید سائنس اپنے ہی علم و فن کے جس پہلو سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے قرآن عظیم ہاتھ پکڑ کر اس کو اس عبرتناک پہلو کی طرف متوجہ کر کے مادیت (MATTERIALISM) کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہا ہے۔ کیا یہ قرآن عظیم کی بے مثال استادی اور اس کی معجزانہ رہنمائی نہیں ہے؟ زوج کریم کا یہ مظاہرہ دراصل موجودہ ننگی انسانیت کے گال پر ایک تھپڑ کی حیثیت رکھتا ہے، اور ان دو الفاظ میں اسباق و بصائر کا ایک پورا باب سمو دیا گیا ہے تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب مذکور۔

واضح رہے کہ زوج کریم ذو معنی الفاظ ہیں اور یہ قرآن میں بطور تو یہ مذکور ہوئے ہیں یعنی "من کل زوج کریم" کا مطلب اب تک "ہر قسم کی عمدہ چیزیں" یا "ہر قسم کے اچھے اچھے نباتات" لیا جاتا رہا۔ مگر علم نباتات (BOTANY) کی ترقی کی بدولت اس کا اصل مفہوم اب واضح ہو سکا ہے۔ یعنی "ہر قسم کے معزز نر و مادہ"۔ یہ زوج کریم کا حقیقی مفہوم ہے اور پہلا مفہوم مجازی یا ثانوی۔ ظاہر ہے کہ مجازی یا ثانوی مفہوم صرف اسی وقت لیا جا سکتا ہے جبکہ حقیقی مفہوم بن نہ سکے اور نباتات کی سیرتوں سے ناواقفیت کے باعث کوئی مفسر و مترجم یہ حقیقی مفہوم کیسے لے سکتا تھا؛ اس لیے فرمایا "اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیَۃً" جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے:-

وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ اور ہم نے ہر چیز میں ایک جوڑا بنا دیا ہے تاکہ

تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَفِرُّوْا إِلَى اللّٰهِ ، إِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔

تم چونک سکو۔ پس دوڑو اللہ کی طرف، میں تو تمہارے لیے خدا کی طرف سے کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں۔

(ذاریات: ۴۹ - ۵۰)

اور حقیقت یہ ہے کہ زوج کریم کے مطالعہ کے بعد خدا کی طرف رجوع و انابت کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا سوائے کسی عذر لنگ کا سہارا لینے کے۔ کیونکہ یہ وجود خداوندی اور اس کی بیمثال ربوبیت پر ایک قطعی وفیصلہ کن اور مشاہد دلیل ہے، جس کے لحاظ سے مادیت (MAETERIALISM) کی چولیں ہل جاتی ہیں، اور نظریہ ارتقاء (EVOLUTION) کا مصنوعی شیش محل چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق اللہ تعالے ہر دور کے حالات و مقتضیات کے مطابق موزوں و مناسب دلائل فراہم کرتا رہتا ہے، تاکہ ہمیشہ خدا پرستی کا احیا رہوتا رہے اور باطل کی شکست وریخت ہوتی رہی۔

یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ قرآن حکیم میں اس قسم کے بے شمار اسباق و بصائر موجود ہیں مظاہر کائنات کے مطالعہ سے دراصل خدا کے وجود، اس کی وحدت، قدرت، ربوبیت اور حکمت و مصلحت کے قطعی دلائل فراہم ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے قرآن شریف میں جگہ جگہ نظام کائنات میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ مثلاً:

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۔

رات اور دن کے ہیر پھیر میں اور اللہ نے زمین اور آسمانوں میں جو جو چیزیں پیدا کر رکھی ہیں (ان تمام موجودات) میں بلاشبہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے بہت سے واضح نشانات (الہیہ) موجود ہیں

(یونس: ۶)

وَفِي الْأَرْضِ آيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْ أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔

اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں واضح نشانیاں موجود ہیں۔ اور خود تمہاری ہستیوں میں بھی۔ کیا تم نہیں دیکھتے؟ (ذاریات: ۲۰ - ۲۱)

اس قسم کی بہت سی آیتیں موجود ہیں۔ اور ان تمام آیات کا منشا و مقصد یہ ہے کہ نظام کائنات سے متعلق علوم یعنی سائنس کی ترقی ہو۔ اور اس ترقی کی بدولت قرآنی بیانات کی صداقت ظاہر و باہر ہو جائے۔ لہذا تحقیقات جدیدہ کے باعث قرآنی بیانات متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان کا چہرہ مزید روشن ہو جاتا ہے، اور الٹے منکرین و معاندین پر حجت پوری ہو جاتی ہے۔ گویا کہ نظام کائنات میں تحقیق و تفتیش سے الٹی آیتیں گلے پڑ جاتی ہیں۔ بہر حال قرآن کی صداقت انسان خود اپنی ہی کوششوں سے ظاہر کر دے گا۔ گویا کہ وہ کارخانۂ فطرت میں سر کیا مارے گا قرآن کی صداقت ہی کی خبریں لائے گا خواہ وہ چاند پر پہونچ جائے یا زہرہ اور مریخ پر۔ یہ خداوند جل وعلا کی بڑی عجیب غریب حکمت ہے۔ اس لیے فرمایا:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ۝ (حٰم السجدہ ۵۳/۵۴)

ہم انھیں اپنے واضح نشانات دکھادیں گے آفاق عالم میں بھی اور خود ان کی اپنی ہستیوں میں بھی تا آنکہ اس دکلام، کی حقانیت ان پر کھل جائے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب داس کائنات کی، ہر چیز سے آگاہ ہے (جیسا کہ اس نے اپنی کتاب میں پہلے ہی سے تمام باتیں بیان کر رکھی ہیں) ہاں یہ منکرین اپنے رب سے ملاقی ہونے کے بارے میں متردد ہیں۔ ہاں تو سن لو! کہ اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَأَيَّ آيَاتِ اللَّهِ تُنكِرُونَ۔

وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھا دے گا پھر تم اللہ کی کن کن نشانیوں کا انکار کرنے لگوگے؟ (مومن: ۸۱)

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ ..... وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَن يُنِيبُ۔

(مومن - ۱۳)

وہی ہے جو تم کو اپنے نشانہائے (قدرت) دکھاتا ہے مگر (خدا کی طرف) رجوع کرنے والے کے سوائے کوئی (ان باتوں پر) چونک نہیں سکتا (اور عبرت حاصل نہیں کر سکتا)

وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ

اور ہم تمہارے پاس یقیناً ایسے واضح و روشن دلائل بھیج

بَیِّنٰتٍ وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ہ چکے ہیں جن کا انکار سوائے بدکردار لوگوں کے اور کوئی نہیں کرسکتا (بقرہ : ۹۹)

چاند کی تسخیر اور آیات الٰہی بات کچھ طویل ہو گئی مگر ان اصولی مباحث کا ذکر کئے بغیر اصل بات چھیڑ دینا کچھ زیادہ مفید نہیں تھا اور بعض غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ آج کل ذرا ذرا بات پر جدت اور تجدد کا لیبل لگ جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر بات دلائل کی روشنی میں سمجھائی جائے۔

غرض یہ تھی دلائل آفاق کی حقیقت و نوعیت۔ اور دلائل آفاق (و انفس) ہی کا دوسرا نام "آیات الٰہی" ہے۔ مذکورہ بالا مباحث سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ قرآن عظیم کیا ہے اور کس پایہ کی کتاب ہے؛ اور انسانی و بین الاقوامی لٹریچر میں اس کی قدر و منزلت کا اصل مقام کیا ہے؟ نیز ان مباحث سے یہ حقیقت بھی بخوبی ظاہر ہو گئی کہ یہ کتاب عظیم عصری علوم سے کبھی شکست و ریخت قبول نہیں کر سکتی۔ بلکہ عصری علوم پر اس کا پلہ ہمیشہ بھاری رہے گا۔ خواہ یہ علوم کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائیں۔ اور اس کی عظمت کا پھریرا ہمیشہ آفاق عالم پر لہراتا رہے گا اور کسی انسان کی یہ مجال نہ ہو گی کہ اس کے علَم کو سرنگوں کر سکے۔ اس موضوع پر سیر حاصل تبصرہ اور جدید سائنس کی شکست و ریخت کے چند عبرتناک مناظر کے لیے ملاحظہ ہو "کلوروفل اور قرآن"۔

حاصل یہ کہ جس طرح "زوج کریم" کی اصل حقیقت اس وقت تک واضح نہیں ہو سکی جب تک کہ علم نباتات (BOTANY) کی ترقی نہ ہو گئی، بالکل یہی حال تسخیر قمر کا بھی ہے۔ چنانچہ جب تک راکٹ سازی کی ابتدا نہ ہوئی اور چاند مسخر نہ ہو گیا اس وقت تک اس سلسلے میں قرآنی آیات بھی خاموش رہیں، اور ان کا اصل مفہوم واضح نہیں ہو سکا۔ مگر جیسے ہی یہ حادثہ ہو گیا قرآن حکیم کے ان بیانات میں بھی جان پڑ گئی جو اس موضوع سے متعلق تھیں۔ اور یہی حال دیگر تمام عصری اکتشافات کا بھی ہے کہ اس میں ہر چیز کا بیان ایک عجیب و غریب اعجازی انداز میں مل جاتا ہے۔ گویا کہ وہ ہر دور کے لیے ایک "تازہ ترین خبرنامہ" ہے جس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور اسکے

رموز و اسرار کبھی ختم نہ ہو سکیں گے۔

زوج کریم کی مثال سے یہ غلط فہمی نہ رہے کہ قرآن مجید میں اسرار کائنات کا بیان "توریہ" کی شکل ہی میں ہوگا بلکہ اس قسم کے بیانات عموماً اشاروں کنایوں (اشارۃ النص، دلالت النص، اور اقتضاء النص جو اصول فقہ کی اصطلاحیں ہیں) کے روپ میں اور کہیں صراحتاً بھی مذکور ہیں، کہیں اصول و کلیات کی شکل میں اور تشبیہ و استعارہ کے قالب میں ملاحظہ ہو "قرآن مجید اور سائنس" یہی وجہ ہے کہ جس طرح نظام کائنات میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے بالکل اسی طرح قرآنی آیات میں بھی تفکر و تدبر کی تاکید کی گئی ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○	(یہ) ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے تیرے پاس بھیجی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور اہل دانش چونک سکیں (ص: ۲۹)
اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○	ہم نے اس کو تمہاری سمجھ بوجھ کے لیے فصیح و واضح قرآن بنایا ہے (زخرف: ۳)
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ○	کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟ (محمد: ۲۴)

اس غور و فکر اور قرآن عزیز و نظام کائنات کے تقابل کے باعث علم الٰہی کی ازیت کا حال آشکارا ہو جاتا ہے۔ اور بسا اوقات علم انسانی کی خامیاں بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید اس حیثیت سے بھی انسان کی بہت بڑی حد تک رہنمائی کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدائی علم قطعی و یقینی اور انسانی علم خام و ناپختہ ہے جس میں بعض اوقات چوک ہو جاتی ہے۔ اس حیثیت سے بھی قرآن مجید انسانی فکر و نظر سے متعلق غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ اکثر سوچ بچار کی نئی نئی راہیں بھی کھولتا ہے اور نئے نئے زاویہ ہائے فکر بھی عطا کرتا ہے۔ اور جہاں کہیں اس کے بھٹکنے کا اندیشہ ہو وہاں ہر ایک نشان راہ یا سنگ میل نصب کر کے صحیح راہ کی طرف اشارہ کر دیتا ہے جیسا

کہ اگلے صفحات میں "قرآنی نظریہ سماوات" کے سلسلے میں بحث کی جائے گی۔

خلاصہ بحث یہ کہ چاند کا فتح ہو جانا کسی بھی حیثیت سے اسلام یا اس کے کسی بھی عقیدے کو ضرب نہیں پہونچا سکتا۔ اور تسخیر قمر کوئی اتفاقی یا غیر متوقع حادثہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ خدائے علیم وخبیر کے منشا اور اسکیم ہی کے مطابق ہو رہا ہے اور قرآن عظیم میں اس موضوع پر واضح نصوص موجود ہیں جن کے ملاحظہ کے بعد مزید کسی ردو قدح کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اس لحاظ سے (قرآنی نقطۂ نظر سے) انسان کا چاند کو مسخر کر لینا خود اس کے لیے حجت اور گلے کا پھندا بن جاتا ہے، کیونکہ اس سلسلے کے قرآنی بیانات پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے جس کا انکار نوع انسانی سے بن نہیں پڑتا۔ اور "وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ" (اور تم ایک عرصہ کے بعد اس کی خبر ضرور جان لو گے) ایک صداقت بن کر نازل ہو جاتی ہے۔

غرض انسان چاند پر کیا گیا قرآن عظیم کی تصدیق وتائید کا کافی سامان ساتھ لایا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے دیگر فرسودہ اور آوٹ آف ڈیٹ مذاہب کا جنازہ نکل گیا ہو۔ اس توضیح و تمہید کے بعد اب میں اپنے ناقص علم کے مطابق بعض اسباق وبصائر آفاقی دلائل (آیات الٰہی) کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو تسخیر قمر کے باعث خدائی تازیانے بن کر جلوہ گر ہو رہے ہیں۔

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ، وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○

اور اس نے تمہارے لیے دن رات اور آفتاب وماہتاب مسخر کر دئیے، اور ستارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ یقیناً اس میں عقل والوں کے لیے واضح نشانات موجود ہیں (نحل: ۱۲)

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ۔

دن رات اور آفتاب و ماہتاب (سب) اس کے نشانہائے (قدرت) میں سے ہیں (حم سجدہ: ۳۷)

آیات کے چار معنی آتے ہیں: (۱) قرآنی آیات (۲) احکام (۳) معجزات (۴) نشانیاں اسباق

دلائل ۔ اور یہاں پر آخری معنی مراد ہیں ۔ لہذا آئیے اب مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے مطابق غور کریں کہ کرہ قمر اور اس کی تسخیر میں ہمارے لیے کون سے اسباق و دلائل اور آیات و نشانات موجود ہیں ؟

کائنات میں چاند کی حیثیت سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ چاند ہمارے نظام شمسی یا سورج کے خاندان (SOLAR SYSTEM) کا ایک معمولی سا فرد ہے ۔ کائنات میں ایسی کروڑوں بلکہ اربوں کہکشائیں موجود ہیں جن میں سے ہر کہکشاں (GALAXY) تقریباً دس کھرب ستاروں کا مجموعہ ہے اور ہر ستارہ ہمارے نظام شمسی کی طرح ایک مکمل نظام کا حامل ہے ۔ یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ امریکی رصدگاہ کے صدر ڈاکٹر ہارو شیلے کا بیان ہے ۔ اس لحاظ سے ہمارے نظام شمسی (ہماری زمین کی طرح کے نو سیاروں کا خاندان) کی حیثیت اس کائنات میں ایک رائی کے دانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ۔ اور چاند کی حیثیت تو اس سے بھی زیادہ حقیر ہے ۔ بہرحال یہ تمام ستارے ، سیارے اور کہکشائیں (GALAXIES) آسمان اول یا "سماء دنیا" کہلاتے ہیں کیونکہ قرآن کہتا ہے :۔

آسمانوں کا ذاتی وجود ایک حقیقت

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ	اور ہم نے نزدیکی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر دیا ہے (ملک : ۵)
وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ○	اور ہم نے آسمان دنیا کو قندیلوں سے مزین و محفوظ کر دیا ہے ۔ یہ ہے ایک زبردست اور ہمہ دان ہستی کا منصوبہ (حم سجدہ : ۱۲)
تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُّنِيرًا ○	بڑا ہی بابرکت ہے وہ خدا جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور روشنی دینے والا چاند بنایا (فرقان : ۶۱)
وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۔	اور قسم ہے برجوں والے آسمان کی (بروج : ۱)

مذکورہ بالا آیات میں مصابیح سے مراد ستارے اور سیارے ہیں اور بروج سے مراد کہکشائیں ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ "القرآن یفسر بعضہ بعضا" کے اصول کے مطابق ہمیں دوسرے مقامات پر اس کی تشریح یوں ملتی ہے:

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاۤءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ٍۨالْكَوَاكِبِ۔	ہم نے نزدیکی آسمان کو ستاروں کی رونق سے آراستہ کیا (صافات: ۶)
وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِى السَّمَاۤءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ	اور ہم نے آسمان میں برج بنا دیے ہیں اور غور سے دیکھنے والوں کے لیے انہیں مزین کر دیا ہے (حجر: ۱۶)

لفظ کواکب ٹھیک مصابیح کی تشریح ہے۔ یعنی کواکب کو مصابیح سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور ان کا اطلاق ہر قسم کے ستاروں اور سیاروں پر ہو سکتا ہے۔ اور برج سے مراد جس طرح مشہور و معروف بارہ برج لئے جاتے ہیں اسی طرح ان کے وسعت مفہوم میں کہکشائیں بھی داخل ہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم یہاں "وزینا ہا للنظرین" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ناظرین نظر سے مشتق ہے، جس کے معنی غور سے دیکھنے کے ہیں اور غور سے دیکھنے کے اس مفہوم میں دوربین سے دیکھنا بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور کہکشاؤں کا ہر ایک طبقہ دوربین سے بالکل صاف نظر آجاتا ہے۔ ان تمام طبقات کی تصویریں اتاری جا چکی ہیں۔ اور ہر طبقہ (کہکشاں) ایک مخصوص شکل و صورت کا حامل ہوتا ہے، اور ان گنت و لاتعداد ستاروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ بروج سے مراد کہکشائیں نہ لی جائیں۔

پھر سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام مواقع پر قرآن حکیم صرف السماء یا السماء الدنیا کے الفاظ لاتا ہے یعنی جمع کے الفاظ (سماوات) استعمال نہیں کرتا۔ اور سماء دنیا کے معنی ہیں نزدیکی آسمان (یا آسمان اول) اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس قسم کے مزید چھ آسمان اور بھی ہیں، جو اس سماء دنیا کے پرے موجود ہیں کیونکہ قرآن تو صاف صاف سات آسمانوں

کی تصریح کرتا ہے:

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۔

اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے جس نے اوپر تلے سات آسمان پیدا کئے (ملک: ۳)

پھر آسمان اول کی مزید توضیح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ زیادہ بلند اور اونچا ہے:

ءَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنٰهَا۔ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا۔

کیا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا؟ جس کو اس نے بنایا، اس کی چھت (خوب) اونچی کی، پھر اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ (نازعات: ۲۷ - ۲۸)

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ۔ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ۔

اور اُس نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں میزان رکھ دی (اور) ہر ایک کو حکم دیا کہ کوئی (اپنی) میزان سے تجاوز نہ کرے (رحمٰن: ۷ - ۸)

یعنی یہ حکم تمام اجرام سماوی کو دیا جارہا ہے کہ کوئی بھی اپنے حدود اور اصول و ضوابط سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے۔ میزان کی اس پابندی میں عالمگیر قانون تجاذب (UNIVERSAL LAW OF GRAVITATION) وغیرہ سب کچھ آجاتا ہے۔ یہ ہے حسب ذیل آیات کا ایمان افروز نظارہ:

وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ۔

ارض و سما کا کوئی ایسا سربستہ راز نہیں ہے جو (اس) کتاب روشن میں موجود نہ ہو (نمل: ۷۵)

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ... ... بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ۔

یہ قرآن رب العلمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے ایک واضح اور غیر پیچیدہ زبان میں۔

(شعراء: ۱۹۲ اور ۱۹۵)

اور — وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا۔

اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ (طلاق: ۱۲)

پھر سورہ نازعات کی مذکورہ بالا آیات ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آسمان اول

کی کوئی چھت بھی ہے ۔ پھر ایک دوسرے موقع پر اس چھت کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:
وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا ہے (انبیاء: ۳۲)

اب سوال یہ ہے کہ یہ چھت ہے کہاں؟ تو مذکورہ بالا تمام آیات پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یہ وہیں پر ہوگی جہاں پر دوربینوں سے نظر آنے والی ان اربوں عظیم الشان کہکشاؤں کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے ۔ کیونکہ یہ تمام کہکشائیں محض سماء دنیا کا حصہ ہیں (جیسا کہ تفصیل گزر چکی) اور آسمان چونکہ بہت بلند ہے لہٰذا اس کی بلندی میں تمام کہکشائیں سما جائیں گی ۔ پھر اس چھت کو محفوظ اس بنا پر کہا گیا ہے کہ وہ کوئی ٹھوس اور ناقابل روک (OPAQUE) چیز ہوگی جس کو نہ تو جنات و شیاطین ہی پار کر سکتے ہیں (جیسا کہ فرمایا: وحفظًا من کل شیطٰن مارد) اور نہ کوئی طاقتور سے طاقتور دوربین ہی اس پار جھانک سکتی ہے اس موضوع پر مزید تفصیلات اور قطعی دلائل کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون "قرآنی نظریہ سماوات"۔

قرآن کا کارنامہ

اس توجیہہ و تعلیل سے اس سلسلے کے تمام اشکالات رفع ہوجاتے ہیں اور کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی اور قرآن و حدیث میں بھی تطبیق ہوجاتی ہے ۔ پھر مذکورہ بالا بحث سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوجاتی ہے کہ قرآن عظیم نظام کائنات کے سلسلے میں زیور علم و تحقیق سے آراستہ جدید انسان کی بھی بخوبی رہبری کر سکتا ہے جس طرح کہ وہ علم احکام کے سلسلے میں رہنمائی کرتا ہے (اور یہ قرآن عظیم کا ضمنی موضوع ہے (نظام کائنات کے سلسلے میں رہبری کرنا)۔ اور قرآن کا کمال یہ ہے کہ جب انسان انہیں ترقی و تحقیق کے باعث ایک دوراہے پر آ کھڑا ہوتا ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اس کی منزل کہاں اور کس طرف ہے؟ تو اس وقت قرآن عظیم اس کا ہاتھ پکڑ کر منزل کا نام و نشان اور راستا پتا بتا دیتا ہے ۔ جیسا کہ زوج کریم اور سماء کے مذکورہ بالا مباحث سے ظاہر ہو رہا ہے ۔ بہرحال آسمانوں کا ذاتی وجود اور سمائے اول کے چھت ہونے کا نظریہ ایک حقیقت ہے ۔ جس کو جھٹلانا اور داستان ماضی قرار دینا بے سند و بے دلیل بات ہے۔

(باقی)

مفرح القلوب

سلطان ٹیپو کے دور کی ایک اہم تصنیف

سید محمود حسین صاحب - لکچرر فارسی شعبۂ تحقیق جامعہ میسور

عہدِ سلطنت خداداد تاریخ میسور کا روشن ترین باب ہے، مخالف اور دشمن قوتوں نے گو اس کے آثار بڑی حد تک مٹا دئے لیکن انہیں پوری طرح نیست و نابود نہ کر سکے، سری رنگ پٹن کے کھنڈر اس سلطنت کی شان و عظمت اور جاہ و سطوت کی یاد دلاتے ہیں تو اس دور کے بچے کھچے مخطوطات اس کی علمی اور فنی فتوحات کا پتا دیتے ہیں، اگرچہ یہ اڑتیس سال کا دورِ حکومت نہایت مختصر رہا اور نواب حیدر علی خاں بہادر اور ٹیپو سلطان شہید کے اکثر شب و روز میدان جنگ میں گزرے تاہم انھوں نے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت اور اہل علم و فضل کی قدر شناسی اور ہمت افزائی سے کوئی غفلت نہ برتی، علما فضلا شعرا اور ادبا اطراف و اکناف سے کھنچ کھنچا کر ان کے دربار میں جمع ہو گئے تھے، سری رنگ پٹن یا ظفر آباد علم و ہنر کا مرکز بنا رہا تو سلطنت کے دوسرے اہم مقامات پر بھی اہل علم اور اہل قلم مصروفِ عمل رہے، دونوں بادشاہوں نے دور دراز مقامات سے علما اور شعرا کو دعوت دے کر بلایا، ان کو وظیفے دئے اور انعام و اکرام سے مالا مال کیا اور دار الحکومت میں ان کی اقامت کا انتظام کیا، کہا جاتا ہے کہ شمالی ہند کے علاوہ ایران اور عرب سے بھی اہل علم و ہنر یہاں آکر جمع ہو گئے تھے، دہلی اور اودھ ــــــــــــ کے درباروں کے علاوہ ایران، افغانستان روم اور حجاز کے بادشاہوں سے بھی ان دونوں بادشاہوں کے قلبی تعلقات تھے، حیدر علی خاں نے شیراز سے ایک ہزار سوار اپنی فوج میں بھرتی کئے تھے اور ایران کا ایک

شہزادہ ٹیپو سلطان کے دربار میں دو سال مہمان رہا، حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان دونوں کو کتابیں جمع کرنے کا اتنا شوق تھا کہ مفتوحہ مقامات سے جو کتابیں حاصل ہوئیں ان کو اپنے شاہی کتب خانے بھجوا دیتے تھے، چنانچہ سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے ان کا کتب خانہ بھی مال غنیمت میں شامل کر لیا، اس کی وضاحتی فہرست سٹورٹ نے مرتب کر کے شائع کرائی تھی اس نے سلطانی کتب خانے کی کتابوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ بتائی ہے، ان میں طب، تاریخ، شعر و ادب، لغات، فلسفہ، ریاضی، نجوم، انشا، قصص، موسیقی وغیرہ پر عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں مختلف اور متعدد مستند کتابیں شامل ہیں شاہی کتب خانے کی بعض کتابیں مذہب اور مطلا بھی تھیں اور اکثر بڑی اچھی نستعلیق کتابت میں مرقوم تھیں، ان کو بڑے اہتمام سے رکھا گیا تھا، سب کی چرمی جلدیں تھیں جن پر چاروں طرف خلفاء راشدین کے اسماء گرامی، پیشانی پر "سرکار خدادادی" بیچ میں سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ - اور اس کے اوپر اور نیچے "اللہ کافی" کے نقش نہایت دیدہ زیب خط میں بنے ہوئے تھے، اور جا بجا شیر کی ببری کا نقش بنا ہوا ہوتا تھا جو گویا ٹیپو سلطان کا شاہی نشان تھا، کچھ کتابوں میں جو دربار سلطانی میں لکھی گئی تھیں سرینگ پٹن کے کارخانے کا کاغذ بھی استعمال ہوا تھا جس کا واٹر مارک یا آبی نشان تک شیر کی ببری کا تھا، ایسے کاغذ اور ایسی جلدوں والے دو چار مخطوطات جامع میسور کے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہیں، سلطان کی یہ بھی عادت تھی کہ اہم کتابوں کے متعدد نسخے تیار کراتے اور انہیں افسروں اور دوستوں میں تقسیم کراتے تھے اور بطور تحفہ بھیجتے تھے۔

حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان دونوں کے درباروں میں ملک الشعراء کا تقرر ہوتا تھا اور دوسرے شاعر بھی موجود رہتے تھے جو خاص موقعوں پر قصیدے کہہ کر پیش کرتے تھے، حیدر علی خاں پڑھے لکھے آدمی تو نہیں تھے لیکن مختلف زبانیں جانتے تھے، ٹیپو سلطان کی باقاعدہ تعلیم ہوئی تھی، مختلف علوم و فنون سے واقف تھے، متعدد زبانیں جانتے تھے، فارسی میں کافی مہارت حاصل تھی، اکثر فارسی بولتے اور فارسی ہی لکھتے تھے، مطالعہ باقاعدگی کے ساتھ کرتے تھے۔

تصنیف وتالیف کا بہت شوق تھا، زمانہ مہلت دیتا اور جنگ وجدل سے فرصت ملتی تو شاید اس میدان کے بھی شہ سوار نکلتے، سٹورٹ نے لکھا ہے کہ مختلف موضوعات پر سلطان نے پینتالیس کتابیں خود لکھیں یا اپنے درباری علماء سے لکھوائی تھیں، بعض اوقات املا کرادیتے یا آپ کے حکم پر کوئی چیز لکھی جاتی تو اسے ملاحظہ فرما کر صاد کردیتے تھے، چنانچہ ایسی کتابوں سے آئین حرب و ضرب پر فتح المجاہدین، نجوم پر زبرجد، فقہ میں فقہ محمدی، تاریخ سلطنت خداداد پر سلطان التواریخ موسیقی پر مفرح القلوب اور خطبات جمعہ کا مجموعہ مؤید المجاہدین مشہور ومعروف ہیں، لیکن افسوس صد ہزار افسوس کہ سلطنت خداداد کی علمی پیداوار اکثر وبیشتر تباہ وبرباد اور ناپید ہوگئی، شاہی کتب خانہ انگریز لوٹ لے گئے، مسلمان ایسے پریشان وہراساں ہوگئے کہ اپنے علمی سرمائے کی خاطر خواہ حفاظت نہ کرسکے، سلطان کے فرامین، خواب نامہ، ڈائریاں وغیرہ تک مال غنیمت میں گئے، جو سندیں وغیرہ افراد اور اداروں میں موجود تھے ان کو انگریزوں نے اپنے فرامین اور اسناد سے بدل ڈالا، اس طرح اس سلطنت کے آثار کو مٹانے کی مہم چلائی گئی۔ لیکن گذشتہ ڈیڑھ صدی میں کچھ چیزیں بازیافت ہوگئیں اور ہاتھ آہی گئیں تحقیق اور ریسرچ کرنے والوں نے اپنی سعی وکوشش سے بعض اہم چیزوں کو منظر عام پر لایا۔ بہر طور ایک دھندلا سا نقشہ اس دور کی علمی اور فنی فتوحات کا ہمارے سامنے آچکا ہے، تاہم یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے مکمل تصویر نہیں۔

دربار سلطانی میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں سے صرف فتح المجاہدین شائع ہوئی ہے۔ باقی سب مخطوطات کی شکل میں انگلستان، پاکستان اور ہندوستان کی مختصر مخطوطہ لائبریریوں میں بکھری ہوئی ہیں، دور حاضر میں مائکروفلم کی جو سہولت ہوگئی ہے اس کی بدولت ان سب سے گھر بیٹھے استفادہ کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ڈاکٹر شیخ علی صاحب ایم۔اے، پی ایچ ڈی (علیگ، پی ایچ ڈی (لندن)، صدر شعبہ تاریخ جامعہ میسور نے سلطان کے سارے مکاتیب وفرامین کا مائکرو فلم انگلستان سے منگالیا ہے جن میں سے صرف چند منتخب خطوط کا ترجمہ کرک پیٹرک نے شائع کیا تھا اسی طرح ڈاکٹر خضر علی خاں صاحب ایم۔اے۔پی ایچ ڈی (کنٹب)، وظیفہ یاب پرنسپل

مہاراجہ کالج وسابق پروفیسر اردو فارسی عربی جامعہ میسور کے پاس ٹیپو سلطان کے دست خاص سے لکھے ہوئے خواب نامے کا مکمل عکس موجود ہے جو آپ انگلستان سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

مفرح القلوب بھی دو بار سلطانی کی ایک نہایت ہی اہم تصنیف ہے جو توجہ کی مستحق ہے' اس کے نسخے مختلف مخطوطہ لائبریریوں میں بھی موجود ہیں' اور ریاست میسور کے بعض ذاتی کتب خانوں میں بھی مل جاتے ہیں' ایک مکمل نسخہ جامعہ میسور کے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی موجود ہے' جہاں دکھنی' فارسی اور عربی کے لگ بھگ ہزار قیمتی مخطوطات کا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے' خود ٹیپو سلطان نے اس کے متعدد نسخے تیار کرائے اور تقسیم کئے تھے' چنانچہ کرک پیٹرک کے "منتخب مکاتیب سلطانی" کے ایک مکتوب سے بھی اس کا پتا چلتا ہے جس میں ٹیپو سلطان نے سری رنگ پٹن کے داروغہ توشک خانہ شاہی کے نام حکم بھیجا ہے کہ مفرح القلوب کی دس نقلیں تیار کرا کے روانہ کی جائیں جن میں سے پانچ مکمل اور نقرئی جلدوں سے مزین ہوں اور پانچ فقط ملحض اور مختصر ہوں' نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے اپنی تصنیف یورپ میں دکھنی مخطوطات میں رقم کیا ہے کہ انڈیا آفس لندن میں اس کتاب کے نو نسخے موجود ہیں جن میں سے بعض پر خود سلطان کے دستخط ثبت ہیں اور جو شاہی کتب خانے کے معلوم ہوتے ہیں' اپنے ایک تازہ مقالے میں جو رسالہ اردو کراچی کے جولائی ۱۹۶۶ء نمبر میں شائع ہوا ہے آپ نے اس کے ایک اور نسخے کی نشاندہی کی ہے جو انجمن ترقی اردو کراچی کے ذخیرہ مخطوطات میں شامل ہے' کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے جس کا ذکر ہاشمی صاحب نے اپنی مرتبہ فہرست میں کیا ہے۔

مفرح القلوب بھی فتح المجاہدین کی طرح دربار سلطانی کا ایک علمی' ادبی اور فنی شاہکار ہے اور ایک ثقافتی یادگار' عہد سلطنت خداداد کی بڑی گراں مایہ اور بلند پایہ پیداوار ہے' اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کے کئی مختلف پہلو ہیں' یہ اس زمانے کی درباری تصنیف ہے جب سلطنت خداداد کا عروج نقطۂ کمال کو پہونچ چکا تھا' ٹیپو سلطان کی ایجادی اور اختراعی صلاحیت اور رجحان کی آئینہ دار ہے' دربار سلطانی کی علمی اور ادبی فضا کا عکس اس میں دکھائی دیتا ہے' حسن

علی عزت کا شاہکار ہے، ان کا فارسی اور دکھنی نظم و نثر کا گویا کلیات ہے جس میں انھوں نے انشا پردازی اور سخنوری کے جوہر دکھائے ہیں، سلطنت خداداد کی ادبی دکھنی زبان سب سے زیادہ اسی کتاب میں محفوظ ہے، فنی حیثیت سے موسیقی کے ادب میں ایک ممتاز اور دلچسپ اضافہ ہے، غرض یہ کتاب بہت سی خوبیوں کی مالک ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس پر اب تک بہت کم توجہ دی گئی ہے مورخوں نے تو اس کا ذکر تک نہیں کیا، دو چار تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے بھی تو اس کا صحیح تعارف نہیں کرایا بلکہ بعض مقامات پر تو کچھ عجیب غلط بیانیوں سے کام لیا ہے، مثلاً نصیر الدین ہاشمی یوروپ میں دکھنی مخطوطات میں رقم طراز ہیں کہ "کتاب کی ابتدا میں ایک طویل دیباچہ فارسی میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف عباد اللہ ہے نہ کہ حسن علی عزت، آخر پر تاریخ تصنیف ۱۱۹۹ھ مرقوم ہے" دیباچے کی اس عبارت سے دراصل ہاشمی صاحب کو مغالطہ ہو گیا "ہر چند ایں کم ترین عباد اللہ استعداد و قابلیت و طاقت حمل بارِ گراں ایں امر خطیر نداشت" ورنہ اس سے چار سطر پہلے ہی مصنف کا نام واضح طور پر یوں مرقوم ہے "حکم جہاں مطاع و عالم مطیع و دیریغ محکم وامر قضا توام با ضعف و احقر تمامی خلقت حسن علی المتخلص بعزت کہ یکی از خادمان حضور رو بساط بوسان محفل نور علی نور است شرف صدور یافت" آپ نے بلوم ہارٹ کی عبارت کا خلاصہ بھی رقم کیا ہے جس کا اختتام اس بیان پر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۱۹۷ھ میں شروع کی گئی اور دو سال میں ختم ہوئی، یہ بھی غلط ہے، کتاب کے آخر میں جو سال تاریخ ۱۱۹۹ھ مرقوم ہے دراصل شاہزادہ حیدر کی رسم ختنہ کے جشن کی تاریخ ہے اس موقع پر کہے ہوئے تین فارسی قطعہ ہائے تاریخ کتاب کے آخر میں موجود ہیں۔ اس کتاب میں کہیں سالِ تصنیف یا سالِ تکمیل مذکور نہیں ہوا، دیباچے میں ٹیپو سلطان کا سالِ جلوس البتہ ۱۱۹۷ھ مذکور ہے، دیباچے کی عبارتوں سے اتنا ضرور واضح ہوتا ہے کہ اسی سال فتح المجاہدین تصنیف ہوئی اور اس کے بعد مفرح القلوب کی باری آئی، بہر طور یہ یقینی امر ہے کہ ۱۲۰۱ھ تک یہ کتاب مکمل ہو چکی تھی کیونکہ اس سال سلطان نے اپنے مذکور فرمان میں اس کی نقلیں بھیجنے کا

حکم دیا تھا، محمد سعید عبدالخالق نے میسور میں اردو میں اس کے متعلق صرف دو جملے لکھے ہیں، اسٹیوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی وضاحت فہرست میں اسے غزلیات اور دوسری نظموں کا مجموعہ بتایا ہے جو فارسی اور دکھنی میں ہیں اور اسے درباری شاعر حسن علی نے لکھا اور سلطان کے نام سے منسوب کیا، ڈاکٹر حبیب النساء بیگم (پروفیسر اردو جامعہ میسور) نے اپنے تحقیقی مقالے میں جو ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما کے نام سے شائع ہوا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" انہوں نے ۱۷۸۵ء میں یہ کتاب دکنی زبان میں لکھی جو اسی نام کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے" حالانکہ یہ کتاب فارسی میں ہے اور اس کی اکثر نظمیں دکھنی میں ہیں، یہ ترجمہ نہیں بلکہ تصنیف ہے، ڈاکٹر آمنہ خاتون صدر شعبہ اردو جامع بنگلور نے ریاست میسور میں اردو میں اس کے فارسی دیباچے کا اقتباس پیش کیا ہے اور چھتیس ریختے، جن میں سے تیس قطعے ہیں اور چھ غزلیں، تو رباعیاں، اور اکھتر فردیات نقل کئے ہیں، آپ نے لکھا ہے کہ" میں نے اس مجلے میں مفرح القلوب کا صرف اردو کلام مکمل طور پر شائع کر دیا ہے" آپ کے پیش نظر جو نسخہ رہا وہ شاید ملخص اور مختصر ہے، ورنہ اصل کتاب میں تو ان کے علاوہ ایک سو اسی غزلیں دکھنی میں مزید موجود ہیں۔

مفرح القلوب کے مصنف حسن علی عزت ہیں، اسٹیوارٹ نے آپ کو ٹیپو سلطان کے دربار کا ملک الشعراء بتایا ہے، نصیر الدین ہاشمی اپنے آخری مقالے میں رقم طراز ہیں جو رسالہ اردو، کراچی، جولائی ۱۹۶۶ء میں فتح نامہ ٹیپو سلطان کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

"عزت کا حال کسی قدیم تذکرے میں نہیں ہے صرف کریم الدین نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کا بیان حسب ذیل ہے۔

عزت تخلص، حسن علی نام اس مصنف نے ایک تاریخ نظم میں فتوحات ٹیپو سلطان کے کارناموں پر لکھی تھی اور اس میں لڑائی نظام علی خاں اور مرہٹہ وغیرہ کی بھی صراحت ہے، اس کا نام فتح نامہ ہے، اس کی ایک جلد سرکار کمپنی کے کتب خانے میں ہے۔"

عزت کے حالات زندگی وغیرہ اس سے زیادہ اور کہیں نہیں ملتے، البتہ مفرح القلوب کے دیباچے

سے اتنی معلومات ضرور حاصل ہوتی ہیں کہ آپ سلطان کے دربار میں ایک معزز مصاحب اور شاعر کی حیثیت سے ممتاز تھے، سلطان نے آپ سے دو کتابوں کی تصنیف کا کام لیا، آپ خاص خاص موقعوں کے لیے قصیدے اور قطعے کہتے اور دربار میں سناتے تھے، آپ کی فارسی انشا پردازی کا کمال اور فارسی اور دکھنی کی شاعرانہ صلاحیتیں تو آپ کی تصانیف سے ظاہر ہیں، شاید موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے ورنہ مفرح القلوب کی تصنیف کے لیے سلطان آپ کا کیوں انتخاب کرتے، مذہباً شیعہ تھے مفرح القلوب کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد فقط حضرت علیؓ کی منقبت پر اکتفا کی ہے۔

مفرح القلوب کے دیباچے میں حسن علی عزت لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مطالب خود ٹیپو سلطان نے املا کرائے تھے، ان کا بیان ہے۔

"ایں کمترین ۔ ۔ ۔ ۔ بمصداق کلام بلاغت ارتسام حضرت حافظ شیرازی قدس سرہ بیت = درپس آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند۔ ہرچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم آنچہ از زباں گوہر بیان ارشاد رفت شروع بترقیم نمود"۔

بالکل اسی طرح کے بیان دوسری کتابوں میں بھی ملتے ہیں جو دربارِ سلطانی میں تصنیف ہوئی تھیں، مثلاً "فتح المجاہدین کے دیباچے میں میر زین العابدین شوستری بھی یہی لکھتے ہیں، نشان حیدری کے مصنف کرمانی تو اسے خود سلطان کی تصنیف شمار کرتے ہیں، سلطان التواریخ کے مصنف نے لکھا ہے"۔

"برارباب بصیرت پوشیدہ نماند کہ اکثر عبارات کہ بصفت خیر الکلام ما قل و دل موصوف است از زبان گوہر فشان آں جناب است"

دربار سلطانی میں مرتب کی ہوئی ایک اور کتاب فقہ محمدی کے دیباچے میں تحریر ہے کہ

"پس بموجب حکم قضا توام بحضور حضرت معلی الکمال ایں رسالہ کردہ شد باین وجہ کہ عبارت ہر مسئلہ وصورت استنباط آں از مسائل مختلطہ از حضور ارحم الفضلاء بمو لویان

مذکورہ ارشاد می شد ایشاں بعینہ بقید قلم می آوردند تا بحدی کہ بانجام رسید و نام ایں کتاب بفقہ محمدی موسوم گردید"۔

یہ کتاب حنفی فقہ کے روزمرہ کے مسائل کا مختصر سا مجموعہ ہے اور اس کا سلطانی کتب خانے کا ایک نسخہ ہماری جامعہ کے اورنٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے۔

یہاں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ٹیپو سلطان نے خود املا کرائی تھیں یا ایسے بیانات صرف ان کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے رقم کیے گئے ہیں۔ سلطان کے علمی ذوق اور تخلیقی صلاحیت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ان کی تعلیم باقاعدہ اور اچھی ہوئی تھی، وسیع مطالعہ تھا، مکاتیب، فرامین وغیرہ اکثر اوقات دستِ خاص سے لکھتے تھے، محفلوں میں سلاطینِ عرب و عجم کے واقعات آیات قرآنی، احادیث رسولؐ وغیرہ کا بیان ہوتا رہتا تھا، ان سب حقائق کے باوجود مفرح القلوب اور ان دوسری کتابوں کا اصل مصنف آپ کو قرار نہیں دیا جا سکتا، آپ کی خاص تحریروں اور ان کتابوں کی عبارتوں میں واضح فرق ہے، البتہ اتنا ضرور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تحریک اور تجویز آپ فرماتے تھے، خاکے بھی آپ ہی دیتے تھے، باقی خانہ پری، ترتیب اور تکمیل درباری علماء اور شعراء کرتے تھے، چنانچہ مفرحِ القلوب کا بھی یہی حال ہے۔

مفرح القلوب کے علاوہ حسن علی عزت کی ایک اور تصنیف بھی موجود ہے جو فتح نامہ ٹیپو سلطان یا اضراب سلطانی کے نام سے موسوم ہے، اس میں آپ نے ٹیپو سلطان کے ایک معرکے کا حال دکھنی نظم میں لکھا ہے جب سلطان نے نظام حیدرآباد اور مرہٹوں کی متحدہ قوت کو شکست فاش دی تھی، عزت نے یہ جنگ نامہ خود سلطان کے حکم پر لکھا تھا، ہاشمی صاحب نے اسے مکمل طور پر رسالہ اردو کے اس مقالے میں شائع کر دیا ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

مفرحِ القلوب بنیادی طور پر فارسی کتاب ہے کیونکہ اس کا دیباچہ اور دوسرے مطالب کا بیان فارسی نظم و نثر میں کیا گیا ہے، لیکن بعض مطالب کا بیان زیادہ تفصیل اور طوالت کے ساتھ دکھنی نظم میں ہوا ہے، اور دکھنی نظمیں فارسی نظموں سے تعداد میں دس گنی زیادہ ہیں، تاہم اس کا دکھنی

حصہ الگ کرلیا جائے تو ایک مبہم سی چیز رہ جاتی ہے کیونکہ اصل بنیادی مطالب کا بیان فارسی میں درج ہے، لسانیاتی نقطۂ نظر سے دکھنی حصے کی اہمیت ناقابل انکار ہے، یہ گویا سلطنت خداداد کی دکھنی شاعری کا سب سے بڑا اور بڑی حد تک نمائندہ مجموعہ ہے اپنی حیثیت سے فارسی اور دکھنی دونوں حصوں کی اہمیت مساوی ہے، یہ ایک مبسوط کتاب ہے جس کا موضوع موسیقی اور رقص ہے، یہ نہ ہندوستانی موسیقی معلوم ہوتی ہے نہ کرناٹکی، اسے سلطانی موسیقی کہنا بجا ہوگا کیونکہ اس کی ایجاد کا سہرا ٹیپو سلطان کے سر ہے، فن موسیقی کے ماہر اس کا تقابلی مطالعہ کرسکیں گے اور صحیح اندازہ لگاسکیں گے، اس کا آغاز سلطان کے دربار سے ہوا اور زوالِ سلطنت نے اسے بھی ناپید کردیا، سُر، تال، اونچ نیچ وغیرہ کے قواعد واصول اس میں بڑی صراحت اور اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، نغموں اور رقص کی بنیاد اوزان پر رکھی گئی ہے اور اوزان کے لیے افاعیل کا استعمال کیا گیا ہے، بہر طور جو کچھ بھی ہے ایک مسلسل اور مربوط نظام ہے، یہ بھی ٹیپو سلطان کی ایک ایجادی اور اختراعی یادگار ہے آپ نے جہاں سند محمدی یا مولودی کو رواج بخشا شہروں اور گاؤں کے نام بدلے، ہتھیاروں، پیمانوں وغیرہ کو نئے ناموں سے موسوم کیا وہاں اپنی جدت پسندی سے کام لے کر اصولِ موسیقی بھی وضع کئے، احکام شرع کی پابندی بڑی مستعدی کے ساتھ کرتے تھے لیکن محض تفنن طبع اور تفریح خاطر کے مقصد سے گاہے ماہے گانا سنتے اور رقص دیکھ لیتے تھے۔

کتاب کا آغاز تسمیہ سے ہوتا ہے اور اس کے مضامین مقدمہ، چھ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہیں، حمد و نعت میں عزت نے اپنے کمال انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں، کچھ عبارتیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

"حمد صانعی کہ چوں آفتاب جہاں تاب صبح صنعتش از افق مشرق اِذَا اَرَادَ اللہ شَیئًا اَن یَّقُولَ لَہٗ کُن فَیَکُون۔ طلوع نمودہ غنچہ ہائے دل ارباب نشاط و طرب را ابر نگ گل شگفتگی بخشید و شعلہ کار لطفش بفحوای زینا السماء الدنیا بمصابیح چراغ خورشید در شبستان عالم کون وفساد افروختہ فانوس قلب اہل مسرت و بہجت

رانور وضیائی قدرت کاملۂ خویش ابیض و منور گردانید نخل بندی کہ بلبل را از آتش عشق گل سراپا سوختہ و رگلستان رنگ و بوی الفت بسان بسمل پہلو بہ پہلو طپانید

ای بر کمال قدرت، تو عقل کل گواہ — بر لوح کبریائی تو توقیع لا الہ ا
از شبنم عطائی تو یک قطرہ بحر و کاں — وز بیدِ تو جمال تو یک ذرہ مہر و ماہ
بر یاد تست عیش جوانان می کدہ — وز شوق تست نعرہ پیران خانقاہ
عزت کہ نامہ عملش را نیامدہ — عنوان بغیر مظلمہ مضمون بجز گناہ

عالی ترین جواہر صلوات مسرت آیات و الاترین لالی تحیات بہجت سمات نثار جناب نبوت انتساب محمد مصطفیٰ خاتم الانبیاء صلوۃ اللہ و سلام اللہ علیہ و الہ الطیبین و الطاہرین واصحابہ۔

ای بردہ ز آفتاب بوجہ حسن سبق — ظاہر شد از تبسم تو صبح در شفق
از سرو خوش خرام تو شمشاد منفعل — وز روی لالہ فام تو گل برگ در عرق
از دفتر جمال تو توریت یک رقم — وز مصحف کمال تو انجیل یک ورق
عزت و نعت ذات تو فی الرو العلن — چندان کہ ہست ناطقہ را قوت نطق

حمد و نعت کے بعد حضرت علیؓ کی منقبت بڑے خلوص اور عقیدت سے کرتے ہیں اس کی کچھ عبارت اور ابیات ہدیہ ناظرین ہے۔

"مدح منقبت شاہنشاہیت کہ طناب سرادق اجلال و شوکت و حشمت و عزت و نعمتش قاف تا قاف ہستی کشیدہ و صدائے ہیبت فضائل و کمال وجود و سخایش در ندطاق گنبد خضرا پیچیدہ —

علی صورت قدرت کردگار — علی در جہاں حجت استوار
ہوا خواہ او جبرئیل امین — بفرمان او آسمان و زمین

اس کے بعد اصل موضوع کا بیان یوں شروع کرتے ہیں۔

"اما بعد بر آئینہ دلہائے اولوالابصار ظاہر و روشن و بمرات خاطر ارباب فطنت و ذکا ہویدا و مبرہن است کہ از بدو فطرت الی الآن بسیار پادشاہان ذی شان در اکثر ازمنہ واعصار فرمان روایان ذوالاقتدار بودند، احدی را غیر از خور د خواب و لہو و لعب و بیہودہ گوئی اشتغال امر دیگر نبود الخ"

دیباچے کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے

ابتدائے آفرینش سے اب تک دنیا میں بہت سے بڑے بڑے بادشاہ دنیا میں گذرے لیکن انھوں نے اور ان میں سے خاص طور پر ہندوستان کے بادشاہوں نے فضولیات میں عمر بسر کی اور عموماً لہو و لعب، خورد و خواب، عیش و عشرت، نشاط و انبساط، سیر و شکار، حسن و عشق اور شراب شراب میں مشغول رہے آئین فوج و سلطنت اور قواعد جہاں گیری پر انھوں نے شاذو نادر ہی توجہ دی نتیجہ یہ ہوا کہ رشتہ ریاست و خلافت ان کے ہاتھ سے جاتا رہا، بیدین نصاریٰ ان کی سلطنت پر قابض ہوتے چلے گئے، ان کے آلات اور ہتھیار سے شاہان ہند خوف زدہ ہو کر ان کی خوشامد اور چاپلوسی کرنے لگے، چنانچہ نصاری نے مساجد کو ڈھا دیا اور اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرتے چلے گئے، لیکن ٹیپو سلطان نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا اور ان سے جہاد پر کمر بستہ ہو گئے، ان کو ہر معرکے میں نیچا دکھایا، وہ قتل ہوئے یا راہ فرار اختیار کی یا آپ سے امان مانگ لی، ۱۱۹۷ھ میں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے آئین حرب و ضرب اور قانون جنگ و جدل پر فتح المجاہدین نامی کتاب ترتیب دی جو ایک نادر الوجود کتاب اور اپنی نظیر آپ ہے اس کے علاوہ بھی آپ نے اور بہت سے ایجادات اور اختراعات کئے، امور مملکت سے فارغ ہوئے تو آپ نے موسیقی کے قواعد و اصول از سر نو مرتب کئے، کیونکہ جس طرح جسم و جان لازم و ملزوم ہیں حرب و ضرب کے ساتھ تفریح و تفنن اور مسرت و بہجت بھی لازمی اور ضروری ہیں۔ چنانچہ آپ نے مفرح القلوب کے نام سے یہ کتاب قید تحریر میں لائی، زمانِ سابق میں کشن نامی ایک شعبدہ باز گزرا ہے جو کبھی

عورت کی شکل اختیار کرتا کبھی مرد کے بھیس میں آتا، کبھی بچہ، کبھی جوان اور کبھی بڈھا بن کر آتا، اس نے جو اصول موسیقی وضع کئے تھے وہی سارے جہان میں مشہور اور مروج ہو گئے، کسی نے ان پر تنقیدی نظر نہ ڈالی تھی اگرچہ وہ بے لطف اور لذت سے خالی تھے، مگر ٹیپو سلطان نے اپنی جدت پسندی سے کام لے کر ان کا رنگ ہی بدل ڈالا، آپ نے سازوں کا تعین کیا، چھے نغمے ٹھہرائے بارہ ضربیں اور نشیدیں مقرر کیں اور تیس اصول وضع کئے، نغموں کے نام آفتاب کے مختلف رنگوں اور حالتوں کے ناموں پر رکھے۔

اس کے بعد مختلف سازوں کا تعارف اور تفصیلات فارسی نظم و نثر دونوں میں بیان کئے گئے ہیں جیسے مردنگ، زنگولہ، صدر، ہلال، بدر، وغیرہ ان میں سے اکثر کو عزت ٹیپو سلطان کی ایجاد و اختراع بتاتے ہیں، اس مقدمے کے بعد چھ باب قائم کئے گئے ہیں اور ہر باب میں پہلے فارسی نثر میں ایک نغمے یعنی راگ کا بیان کیا گیا ہے، پھر اس کے قواعد فارسی نظم میں بیان کئے گئے ہیں جسے "غزل گوشوارہ" کا عنوان دیا گیا ہے، اس کے بعد ایک سلامیہ۔ باعی دکھنی میں رقم کی گئی ہے اور دکھنی نظم میں اس نغمے کی کچھ اور توصیف کی گئی ہے، ہر نغمے کے پانچ اصول قرار دئے گئے ہیں اور پانچوں کا بیان دکھنی نظموں میں مرقوم ہے، آخر میں تیس دکھنی غزلیں اور دو فارسی غزلیں جو اس نغمے کے لیے موزوں ہیں پیش کی گئی ہیں جو سب کی سب عزت کی کہی ہوئی ہیں، البتہ ہر دکھنی غزل کے بعد اسی کے وزن میں کسی فارسی شاعر کا ایک شعر لایا گیا ہے جسے عزت "جملہ معترضہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور ہر فارسی غزل کے بعد اپنی ایک دکھنی بیت لائی ہے، ہر باب میں نغمہ و اصول کے بیان کے ساتھ ہی ساتھ بارہ ضربوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں چھے نشست سے مخصوص ہیں اور چھے رقص سے متعلق۔

خاتمے میں مزید سلامیہ، رباعیاں، فارسی اور دکھنی غزلیں، متعدد فردیات منسلک ہیں جن کے مضامین بقول مصنف بہاریہ اور ثنائیہ ہیں آخر میں رقص کے مزید قواعد و آداب کا فارسی نثر میں بیان کیا گیا ہے کتاب کا اختتام تین فارسی قطعوں پر ہوا ہے جو شہزادہ حیدر کے جشن

رسم نغمہ کے موقع پر مخصوص راگوں میں گانے کے لیے کہے گئے ہیں، ان میں تاریخی مادے شامل ہیں جن سے سال ۱۱۹۹ھ حاصل ہوتا ہے، شاید انہیں سے مغالطہ ہوا ہے کہ یہ کتاب کا سال تکمیل ہے۔

ساری کتاب میں جملہ نظموں اور ابیات کی تعداد حسب ذیل ہے۔

فارسی قطعے ۔۵، فارسی غزلیں ۔۱۵، فارسی رباعیاں ۔۲، فارسی فرد ۔۱، دکھنی قطعے ۔۳۰، دکھنی غزلیں ۔۱۸۶، دکھنی رباعیات اور قطعات ۲۵، دکھنی فردیات ۔۳۷، جملہ دکھنی ابیات دو ہزار، جملہ فارسی ابیات تقریباً ساڑھے چار سو، جملہ معترضہ، لقب والے فارسی اشعار کے علاوہ سارا منظوم کلام عزت کا ہے، گویا آپ کا دیوان ہے، رباعیاں کم ہیں لیکن چار مصرع والے قطعوں کو بھی رباعی کا نام دے دیا گیا ہے، دکھنی کو ہندی بھی کہا ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، ہر جگہ دکھنی نظم کو ریختہ کہتے ہیں، خود مصنف کے قول کے مطابق ساری غزلیں بہاریہ اور ثنائیہ ہیں، سارے مضامین طربیہ ہیں، حزن و ملال اور یاس و حرماں کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا، بہاریہ اور عاشقانہ مضامین کے پہلو بہ پہلو جابجا سلطان کی مدح و ثنا کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ غزلیں سلطان کے سامنے گانے اور رقص کرتے ہوئے سنانے کے لیے کہی گئی ہیں، مختلف راگوں کے لیے موزوں اور ان سے مخصوص ہیں، ان کا مقصد تفریح و تفنن کے سوا کچھ نہیں، کتاب کا نام اپنے موضوع اور مضامین و مطالب کے لحاظ سے اسم بامسمی ہے۔

سلاست، روانی، حسن بیان اور اثر آفرینی عزت کے فارسی اور دکھنی کلام کی امتیازی خوبیاں ہیں۔

نغموں کا مختصر سا تعارف حسب ذیل ہے۔

۱۔ ابیض ۔ صبح کا نغمہ، اس کے پانچ اصولوں کے نام سحر کے پہلے حرف سے نکلنے والے رکھے گئے ہیں یعنی سلطانی، سہروسہی، سہروشی، سہرو نازی، سبزواری اس کی غزلوں میں تعریف صبح، حسن محبوباں، شگفتن گل، روشنی، مجلس شادی شجاعت، سخاوت، عدالت اور حسن کی تعریف کے مضامین آئے ہیں۔

(باقی)

کتبۂ مارگلہ

از: پرنسپل شیخ فرید برہان پوری
(صدر شعبۂ اُردو فارسی - جبل پور یونیورسٹی)

(۳)

ظاہر ہے کہ سڑک اگر بادشاہ یا کسی اور کے لیے بنائی گئی تو اتنی مضبوط اور پختہ سڑک ایک دو دن کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ۱۵۸۰ء صحیح سال تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

"ہندوستان" ــــــ ہند کا ایک حصّہ "ہ" کا شوشہ جھڑ گیا ہے۔ اور "دال" ـــ "د" اس طرح جھڑ گیا ہے۔ کہ "ر" پڑھا جاتا ہے۔

یزدانی صاحب کے عکس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان مصرعوں کے بعد خالی جگہ ہے کرنل صاحب کے خیال کے مطابق "خالی سطر ہے۔ جہاں سے الفاظ گر چکے ہیں"[1] اس مقام پر گرے ہوئے الفاظ کے نشانات نظر نہیں آتے۔ جہاں سے الفاظ جھڑے ہیں۔ اپنا نشان چھوڑ گئے ہیں۔ وہاں کچھ تو دھبے ہونا چاہیئے۔

قطعہ تاریخ کے تمام مصرعے ایک سائز میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور نیچے کی عبارت دوسری سائز میں ہے۔ وہ دوسرے مضمون پر مشتمل ہے۔ دو مختلف مضمون کی عبارتیں ہیں، اس لیے ان کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ بھی ہے۔

کتبہ کے نیچے کی عبارت کا حل ملاحظہ فرمایئے ـــ

"باہتمام" ـــ ہ اور ت گر گئے ہیں۔

---

[1] برہان ص ۲۱۸

"میرزا"[1] ــ "ی" کے نقطے موجود ہیں "زا" بھی صاف پڑھا جاتا ہے جس کے الف کا درمیانی حصہ شکستہ ہو گیا ہے۔

زمان ــــ ز کا نقطہ غائب ہے۔ آ کے میم کا کچھ حصہ جھڑ گیا ہے "ن" کا نصف دائرہ باقی ہے۔

"زمان" کے بعد کافی جگہ چھوڑی ہوئی ہے۔ کچھ حروف پریدہ ہو گئے ہیں۔ برنڈانی صاحب کے عکس میں جو نشانات ہیں۔ ان کو "داروغہ" نہیں پڑھا جا سکتا[2]

عاجز راقم کے خیال میں وہ "لطف اللہ خلف" کے باقی نشانات ہیں،

توجیہہ ملاحظہ فرمائیے۔

"لطف اللہ" کے کچھ ایسے حصے جھڑ گئے ہیں، جو باقی حصوں کو آسانی سے سمجھنے میں مدد نہیں دیتے۔ مگر "احمد معمار" کی وجہ سے ان کے مٹے ہوئے نقوش "لطف اللہ" کی نشاندہی کرتے ہیں۔

"لطف" کے اوپر "اللہ" کا لفظ تھا "اللہ" کے دونوں لام کے صرف زیرین حصے معلوم ہوتے ہیں

"لطف اللہ" کے اوپر "خلف" تھا جو "ب" معلوم ہوتا ہے یہ "ف" کا حصہ ہے جس کے ساتھ "خ" "اف" "ل" جھڑ گئے ہیں۔ "اللہ" کا "لہ" رہ گیا ہے۔ صرف الف (ا) جھڑا ہے۔

پتھر کا وہ حصہ جہاں "لطف اللہ" کا "ل" کندہ ہے شق معلوم ہوتا ہے۔ "ل" کا ایک حصہ پتھر کے ایک حصہ پر جدا نظر آتا ہے۔ اور زیرین حصہ مع "ط" اور ف کے دوسرے ٹکڑے پر رہ گیا ہے۔ جو صاف نظر آتے ہیں۔

"لطف" کے اوپر "اللہ" جیسا محسوس ہوتا ہے۔ اور لفظ "اللہ" کے اوپر "خلف" ہے۔ جس میں سے "خ"، "ل" اور "ف" کا بالائی مڑا ہوا حصہ جھڑ گیا ہے۔ "ف" کی لمبی لکیر ــــ صاف موجود ہے۔

---

[1] کرنل صاحب نے میرزا کو مولانا اور زمان کو میان پڑھا ہے (برہان اپریل ۵۶ء ص ۲۱۸)

[2] کرنل رشید صاحب نے داروغہ پڑھا ہے۔ (برہان اپریل ۵۶ء ص ۲۱۸)۔

کرنل صاحب نے "لطف اللہ خلف" کو داروغہ شیخ عبد العزیز پڑھا ہے[1]

"احمد معمار" — احمد معمار ٹھیک "باہتمام" کے نیچے ہے۔ دیگر نقلوں میں بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے[2]

کرنل صاحب نے "پور استاد" کے لیے جو جگہ بنائی ہے[3] وہ نظر نہیں آتی۔ موصوف نے لکھا ہے۔ کہ "احمد معمار کے پہلے جو جگہ خالی ہے۔ وہاں دو اور لفظ "پور استاد" یا "ابن استاد" کا اضافہ ہونا چاہیئے[4]

احمد معمار کے پہلے کوئی خالی جگہ نہیں ہے۔ اگر "پور استاد" لکھا جائے تو سطر کرسی سے باہر چلی جاتی ہے۔

"جمگی داس" صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس لفظ پر سب متفق ہیں۔ کتبہ کی دسویں سطر کا جو آخری لفظ باقی رہ گیا ہے۔ اس کو "مشرف" پڑھا گیا ہے

ریہاٹسک اور ینڈوانی صاحب نے "شرف" پڑھا ہے[5]

دیلو خین" اور کرنل صاحب نے چھوڑ دیا ہے[6]

"مشرف" کا میم جھڑ گیا ہے۔

"مشرف" ایک منصب ہے۔ آئین اکبری میں مرقوم ہے

"باوارہ نویسی معاملہ فہمی و دیانت مندی سر رشتہ خرج و دخل استوار دارد۔ روزنامچہ خرد پسند سرانجام دہد"[7]

دولتِ مغلیہ کی ہیئت مرکزی (مصنفہ ابن حسن) میں مرقوم ہے۔ کہ مشرف کل وجز صدر محاسب ہوتا تھا۔ محکمے کے ہر شعبے میں اس کے ماتحت ایک ایک محاسب ہوتا تھا[8]

---

[1] برہان اپریل ۱۹۵۶ء صـ ۲۱۸ [2] ایضاً صـ ۱۳-۲۱۲ [3] ایضاً صـ ۲۱۹ [4] ایضاً صـ ۲۱۷

[5] برہان اپریل ۱۹۵۶ء صـ ۲۱۳ [6] ایضاً صـ ۲۱۲/صـ ۲۱۸ [7] آئین اکبری صـ ۱۵

[8] دولتِ مغلیہ کی ہیئت مرکزی صـ ۲۵۵

"دیالداس" ——— بلوخمن نے "دیبی داس" پڑھا ہے جو صرف اندازہ ہے۔

"تحویلدار" ——— تمام خواندگیوں میں تحویلدار صاحب[1] پڑھا گیا ہے۔ ہر جگہ کاتب نے "ر" بہت لمبی لکھی ہے۔

"در" ——— سنہ کے پہلے در کسی نے نہیں پڑھا جو ہو۔ ضروری ہے "در" کے نیچے کے حصے باقی ہیں۔

"سنہ" ——— سنہ کا پتھر ٹوٹ گیا ہے۔

"ہجری کاھ" ——— سنہ کے پاس ہجری کا ھ نہیں پڑھا جاتا۔ بلوخمن نے ہجری لکھ دیا ہے۔ اور کرنل صاحب نے دو چشمی ھ بنایا ہے۔ ھ کا دائیں جانب کا مڑا ہوا حصہ کتبہ کے چربے کے فوٹو میں موجود ہے۔

۱۰۸۳ھ ——— اکائی کا ہندسہ تین صاف نہیں ہے۔

مگر

ھ ناصیۂ مہوش ہندوستان

سنہ ۱۰۸۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس لیے اکائی ہندسہ کا "تین" تسلیم کرنا چاہیے۔ کرنل صاحب نے مہوش میں الف بڑھا کر ۱۰۸۴ھ بنا دیا۔

آخری سطر ———

"مرتب شد" ——— "شد" کی شین جگہ جگہ سے جھڑ گئی ہے۔ ریہالٹنگ اور کرنل صاحب نے مرمت پڑھا ہے۔ یزدانی صاحب نے مرتب پڑھا ہے۔

عاجز راقم کے خیال میں مرتب صحیح ہے۔

ملاحظہ فرمائیے ———

---

[1] تحویلدار ——— داروغہ کی طرح ہر کارخانہ میں ایک تحویلدار بھی ہوتا تھا۔ اس کی تحویل میں وہ نقد رقم اور سامان رہتا تھا جس کی ضرورت اس کے شعبے کے لیے ہوتی تھی (دولتِ مغلیہ کی ہیئت مرکزی ص ۲۵۴)

• "مرؔ" ——— صاف ہے
• "مت" کی "م" کہیں نظر نہیں آتی۔

"تب" کے "ت" اور "ب" کے نقطے موجود ہیں۔ جو آگے پیچھے ہو گئے ہیں عموماً کتبات اور اسناد میں نقطے صحیح مقام پر نہیں دیئے جاتے۔ نقطوں کی ترتیب کے اس پیش و پس کو مدّنظر رکھنا چاہیے۔

۱۹۵۵ء میں کرنل صاحب کو کتبہ کا جو فوٹو ملا ہے۔ اس میں ممکن ہے کہ ب کا نقطہ جھڑ گیا ہو۔

قطعہ تاریخ میں ساخت کا لفظ موجود ہے۔

ع ساخت چنان شاہ رہے باشرف

"ساخت" کا لفظ صاف بتلا رہا ہے۔ کہ یہاں "مرتب" ہونا چاہیے۔ اشعار میں "مرمت" کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔

سڑک کی مرمت کوئی اتنا اہم اور دشوار کام نہ تھا معمولی انجینئر بھی کر سکتا تھا شیر قوی پنجہ مہابت شکوہ مہابت خاں کو لطف اللہ جیسے زبردست اور مشہور مہندس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

مقام سخت صعب گذار تھا۔ بلند پہاڑی کے اوپر سے جگہ جگہ سے کاٹ کر سڑک بنائی تھی اور افغانوں کی شورش عام تھی۔ اس لیے مہابت خاں جیسے ہیبت خیز بہادر کے اہتمام سے کُتل مارگلہ پر لطف اللہ جیسے فاضل مہندس نے یہ سڑک بنائی۔

سڑک کی تعمیر کا کام ۱۰۸۳ھ میں ختم ہوا۔

کرنل صاحب کا خیال ہے۔ کہ مارگلہ پر سڑک کی دگرگوں حالت دیکھ کر اس کی مرمت کا حکم دے دیا[1]

۱۸ محرم ۱۰۸۵ھ کو اورنگ زیب حسن ابدال کی طرف کوچ کرتا ہے اور ۲ ربیع الاول کو مارگلہ سے دس میل حسن ابدال پہنچ جاتا ہے۔ افغانوں کی شورش کے پیش نظر وہ آہستہ آہستہ

---

[1] برہان اپریل ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۱۲

احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔

راقم السطور کے ناقص خیال میں یہ سڑک مہابت خاں نے اپنے لیے بنوائی۔ اورنگ زیب کے حکم سے یا اس کے لیے تعمیر کروائی جاتی۔ تو اشعار میں کہیں اشارہ ضرور ہوتا۔ اورنگ زیب کے حسن ابدال پہونچنے کے پہلے مہابت خاں کابل میں پہونچ چکا تھا۔ وہاں سے ناراض ہوکر وہ بادشاہ کو خط لکھتا ہے جس میں اپنے اور جسونت سنگھ کے عمل کی مدافعت کرتا ہے۔ شجاعت خاں کو پاجی کہتا ہے۔ بادشاہ پر یہ الزام لگاتا ہے۔ کہ وہ سفلہ نواز ہے۔ اور نئے لوگوں کی سرپرستی کرتا ہے۔

اس خط کا حوالہ جادو ناتھ سرکار نے تاریخ اورنگ زیب میں دو جگہ کیا ہے[1]

تاریخی واقعات[2]۔ مہابت خاں کی معزولی، شجاعت خاں کی تباہی و بربادی اور مہابت خاں کا خط کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سڑک مہابت خاں نے اپنے لیے بنوائی تھی۔

کرنل صاحب نے جس لطف اللہ کا حوالہ دیا ہے۔ وہ لطف اللہ خان تھے۔ جو اورنگ زیب کے ہمراہ تھے[3]

بادشاہ کے ہمراہیوں میں ایک شیخ عبدالعزیز بھی تھے۔ وہ عالم اور بزرگ آدمی تھے۔ کرنل صاحب نے مرمت کا اہتمام کرنے والوں میں ان کو شامل کرکے داروغہ شیخ عبدالعزیز لکھا ہے[4]

کتبہ میں "پور استاد" کے لیے جگہ بناتے ہوئے کرنل صاحب نے لکھا ہے کہ۔

"کتبہ میں احمد معمار کے لفظ سے پہلے کچھ جگہ خالی پڑی ہے جس میں گرے ہوئے الفاظ

---

[1] تاریخ اورنگ زیب (مطبوعہ ۱۹۱۶ء) ص ۲۷۱/۳ ص ۲۶۷ خط۔ انڈیا آفس لائبریری مخطوطہ ۳۴۷۰ ص ۲۶-۲۲

[2] تاریخ واقعات۔ ۱۹ محرم ۱۰۸۵ھ کو اورنگ زیب کو معلوم ہوا کہ مہابت خاں حوالی پشاور یعنی باغ ظفر سے کوچ کرکے کابل روانہ ہوا۔ مہابت خاں نے افغانوں کو قصداً واقعی تنبیہ کرنے سے چشم پوشی کی [3] ماثر عالمگیری اردو ترجمہ ص ۹۴ [4] برہان اپریل ۱۹۶۹ء ص ۲۱۵/ ص ۲۱۹ شیخ عبدالعزیز کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجئے۔ ماثر عالمگیری ص ۹۹/ ص ۹۴، ۹۳ کلمات سرخوش ص ۹۰/ نقوش لاہور نمبر ص ۵۲۵

کے نشانات موجود ہیں اور یہ ہمارے والے نوٹ سے بخوبی ظاہر ہے۔ اس خلاء میں ہماری دانست کے مطابق دو اور الفاظ موجود تھے۔ اور وہ یہ تھے۔

"پور استاد"۔۔۔۔

لطف اللہ کی یہ عادت تھی۔ کہ وہ اپنے کو بسا اوقات پور استاد احمد معمار کہتا تھا۔ اور کبھی ابن استاد احمد معمار بھی لکھ دیتا تھا چنانچہ اپنی ایک رباعی میں لطف اللہ لکھتا ہے: ع

منکہ ہستم فقیر لطف اللہ　　　بہندس شہیر در افواہ

خاکپائے ہنروران کبار　　　پورِ استاد احمدِ معمار

ہوشنگ غوری کا مقبرہ جو مانڈو میں ہے۔ اس پر ایک کتبہ میں لطف اللہ نے اپنے آپ کو ابن استاد احمد معمار لکھا ہے۔

اس لیے ہماری دانست میں لفظ احمد معمار سے پہلے جو جگہ خالی ہے۔ اس میں دو اور الفاظ کا ۔۔۔۔ "پور استاد یا ابن استاد" کا اضافہ ہونا چاہیے۔[1]

مذکورہ طویل اقتباس میں کرنل صاحب نے "پور استاد" کے لیے جو جگہ بنائی ہے۔ وہ نظرثانی کی محتاج رہ گئی ہے۔ حقیقت کرنل صاحب کے مفروضہ کے برعکس ہے۔

اس ذیل میں عرض ہے کہ لطف اللہ نے اکثر "لطف اللہ ابن استاد احمد معمار" لکھا ہے۔ اور مذکورہ بالا اشعار میں پور استاد احمد معمار لکھا ہے۔

کرنل صاحب نے ان اشعار کو رباعی لکھا ہے۔ یہ اشعار ایک "حسابی مسئلہ کے منظوم حل" کے آخری دو شعر ہیں۔[2]

لطف اللہ نے اپنی تصانیف میں جگہ جگہ "لطف اللہ ابن استاد احمد معمار" لکھا ہے۔ چند مقامات ملاحظہ کیجیے ۔۔۔۔

---

[1] برہان اپریل ۱۹۵۶ء ص ۲۱۷　[2] مضامین سلیمان ص ۳۰۱۔

(۱) "لطف اللہ بن احمد النادر المعمار ۔ ۔ ۔ ۔"

(دیباچہ ۔۔۔ صور صوفی ۔ قلمی نسخہ علی گڑھ یونیورسٹی)[1]

(۲) "لطف اللہ متخلص بہ مہندس ابن استاد احمد لاہوری ۔ ۔ ۔ ۔"

رسالہ خواص اعداد ۔۔۔ قلمی ۔ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن)[2]

(۳) "لطف اللہ المتخلص بالمہندس بن الاستاد احمد المعمار"

(شرح خلاصۃ الحساب) ۔۔۔۔۔۔ انڈیا آفس[3]

(۴) "لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار لاہوری"

(منتخب خلاصۃ الحساب)[4]

اس کتاب کے آخر میں ایک حسابی مسئلہ کے منظوم حل کے آخری دو شعر اوپر نقل کئے جا چکے ہیں[5]

۵ ۔ جمیع البدائع میں مختلف مقامات پر "لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار" مرقوم ہے[6]

۶ ۔ اشعار میں لطف اللہ احمد بھی ملتا ہے ۔

باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بہ علم ۔۔۔ جہل ازیں علم تو بہتر کہ نیاید بہ عمل[7]

خواہم کہ کشم بادہ چو لطف اللہ احمد ۔۔۔ تا چند کشم محنتِ دورِ قمری را[8]

ہمچو لطف اللہ احمد کوس دانش می زدم ۔۔۔ چوں شدم عاشق بجہل خویش کردم اعتراف[9]

---

[1] مضامین سلیمان ص ۲۹۸ [2] ایضاً ص ۳۰۰ [3] ایضاً ص ۳۰۰ [4] ایضاً ص ۳۰۱ [5] ایضاً ص ۳۰۲

[6] جمیع البدائع ۔ صفحات ۴۱۵ ، ۴۱۶ ، ص ۴۱۸ ، ص ۴۲۰ (ہمایوں جون ۱۹۳۷ء)

[7] مضامین سلیمان ص ۳۰۵ [8] ایضاً ص ۳۰۶ [9] مضامین سلیمان ص ۳۰۷

لطف اللہ معمار مہندس شد و استاد   گر کار داریت نگند پس چہ کند کس[1]

ہوشنگ شاہ غوری کے مقبرہ کے دروازے پر جو کتبہ ہے۔ اس کی دوسری سطر ملاحظہ کیجئے ـــــ

"فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار شاہ جہانی"[2]

مضمون کے آخر میں، ہم میرزا اپنی خواندگی کے نتائج پیش کرتا ہے۔

ہو القادر

خان قوی پنجہ مہابت شکوہ	شیر ز سہم پنجہ او ناتوان
در کتل بارگہ آنکہ بود	باکرہ چرخ بریں توامان
ساخت چنان شاہ رہی با شرف	رشک برد چرخ بر او ہر زمان
گفت مغل از پی تاریخ سال	ناصیۂ مہوش ہندوستان

باہتمام میرزا محمد زمان لطف اللہ
احمد معمار جو گید اس مشرف وو یالداس
تحویلدار در ۱۰۸۳ھ مرتب شد

۱۔ مضامین سلیمان ص ۳۰۸ ۲۔ ایضاً ص ۳۹۶

ہندو تہذیب اور مسلمان

از جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

چند متفرق توہمات (۱) بعض گھروں میں کنواری لڑکی کا ہونا مبارک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی طرح مربہ اور اچار مدت العمر دوست واحباب کے گھر سے یا بازار سے لیکر کھاتے تھے گھر میں تیار نہیں کرتے تھے۔[۱]

(۲) صفر کے مہینے میں تیرہ دن منحوس تصور کئے جاتے تھے۔[۲]

(۳) بالعموم منگل اور سنیچر کے دن منحوس تصور کئے جاتے تھے۔[۳]

(۴) سر پر چوٹی رکھنا۔ شاہ مدار یا سالار مسعود غازی یا کسی دوسرے بزرگ کے نام کی چوٹی بچوں کے سر پر رکھی جاتی تھی۔ یہ عمل بطور منت ہوتا تھا۔ جب وہ مدت پوری ہوجاتی تھی تو اس بچے کو لیکر اس بزرگ کے مزار پر جاتے تھے اور وہاں وہ چوٹی ترشوائی جاتی تھی۔[۴] شاہ عالم ثانی نے اپنے بیٹے کے سر پر شاہ شرف الدین پانی پتی کے نام کی چوٹی رکھی تھی اور اس بچے کو مزار پر بھیج کر وہ چوٹی ترشوائی تھی۔[۵]

---

[۱] ہفت تماشا۔ ص ۱۴۲ [۲] تقویۃ الایمان ص ۷۷، ۷۸ [۳] ایضاً ص ۷۸۔ ۱۷
W. CROOK. P. 216
ہندوؤں میں مبارک اور منحوس دنوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ کتاب الہند جلد دوم صفحہ ۲۷۴۔ ۲۰۴، ابواب ۷۷ تا ۷۹ [۴] نصیحۃ المسلمین (قلمی) ص ۴۳، ہفت تماشا۔ ص ۹۸۔ ۹۹، ۱۰۶ [۵] برائے تفصیلی حالات ملاحظہ ہو۔ بزرگان پانی پت ص ۳۰ مابعد [۶] تقویۃ الایمان۔ ص ۵۰
EAST INDIA GAZETTEER, I, P. 367.

(۵) بدھی اور بیڑی! اسی طرح کسی بزرگ کے نام کی بدھی[۱] بچوں کے گلے میں اور پیروں میں بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں[۲]۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ایام طفلی میں میرے بھائیوں کے پیروں میں بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں - اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر بلا ناگہانی امراض سے محفوظ رہیں - یہ بیڑیاں بڑے پیر کے نام کی تھیں -

(۶) جن دنوں چیچک کی وبا پھیلتی تھی تو مسلمانوں کے گھروں میں طرح طرح کے ٹونے ٹوٹکے عمل میں آتے تھے۔ مثلاً مالن پھول لے کر گھر میں آتی تھی - اِن دنوں گوشت نہیں پکتا تھا[۳]۔ اس موقع پر بالعموم سیتلا دیوی کی پوجا ہوتی تھی - مرزا مظہر جان جاناں اس ضمن میں فرماتے ہیں

"در وقت عروض مرض جدری (چیچک) کہ زبان ہندی سیتلا معروف و مشہور است، کم زنی باشد کہ از دقائق ایں شرک خالی بود و برسمی از رسوم آں اقدام نہ نماید"[۴]

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ایک صاحب قدرت عورت ہے جس کے اختیار میں بچوں کی موت وحیات ہے۔ اس کا نام ادب سے لیتے تھے بلکہ اُسے ماتا (ماں) کہتے تھے۔ اس کی کمی کو روٹھنے سے اور کثرت کو عنایت مادرانہ سے تعبیر کرتے تھے - دربانوں اور باغبانوں کے ساتھ بڑی توقیر سے پیش آتے تھے۔ اس خیال سے کہ انھیں چیچک ماتا کے حضور میں تقرب حاصل تھا جب تک چیچک بچے پر "مہربان" ہوتی اس وقت تک گھر

---

[۱] مرزا قتیل نے بدھی کی وضاحت یوں کی ہے - ڈورے کی طرح ریشم کی بنی ہوئی چیز ہوتی ہے - یہ بازار میں بکتی ہے - اسے لوگ خرید کر شاہ مدار کے عرس کے دن بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں ہفت تماشا ص ۱۷۸

[۲] تقویۃ الایمان - ص ۵ [۳] نصیحۃ المسلمین - ص ۳۴ [۴] معمولات مظہری ص ۳۸

میں سالم مسور اور گیہوں کی روٹی کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں پکاتے تھے۔[۱]

ان دنوں کی رسموں میں سے ایک بہت ہی دلچسپ رسم کا ذکر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نواب آصف الدولہ کے لڑکے کے چیچک نکل آئیں۔ ہندوستانی رواج کے مطابق نواب اور اس کی اہلیہ نے اپنے ہاتھوں میں بھیگے ہوئے چنے لیکر گدھوں کو کھلائے اور اس کے اثر سے لڑکے کو چیچک سے نجات حاصل ہو گئی۔[۲]

بچوں کے گلے میں ہنسلی، تعویذ یا شیر کے ناخن پہنانا دفع بلیات کے لئے بچوں کے گلے میں تانبے یا چاندی کی ہنسلی ڈالی جاتی تھی۔ اسی غرض سے بعض مرتبہ شیر کے ناخن دھاگے میں باندھکر گلے میں ڈالے جاتے تھے۔ اور طرح طرح کی تعویذیں بھی پہنائی جاتی تھیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں یہاں کے تہذیبی عناصر کا اس حد تک غلبہ تھا کہ ہندوستان کے باہر کی تہذیب یا واقعات کا ذکر کرتے وقت انھیں اس بات کا خیال تک نہیں رہتا تھا کہ اس قسم کی رسموں کا ان ممالک میں ہونا ناممکن ہے۔ حضرت امام قاسم کے ایام طفلی کا ذکر کرتے ہوئے سودا نے اس رسم کا ذکر کیا ہے حالانکہ انکے ملک میں نہ اس زمانے میں اور نہ اس زمانے میں اس قسم کی رسم کا وجود تھا۔ یہ خالص ہندوستان کی رسم ہے۔

ہیکل میں ڈالے تھے تیرے لاکھوں طرح کے میں تعویذ
بُری گھڑی کچھ کام نہ آدے جو حفاظت کی کچھ چیز
شیر کے ناخن تک ڈالا جینے کو تجھ ہیکل میں
موت کی روبہ سے نہ بچا پر آن کے تو اس جنگل میں[۳]

---

[۱] ہفت تماشا۔ ص ۸۴۔ ۸۵۔ نیز حیات طیبہ (از مرزا حیرت) ص ۱۵۶، تقویۃ الایمان ص ۴۳، سہاگن نامہ ص ۲۳۔ ۲۴۔ نصیحتہ المسلمین۔ ۲۲۔ ۲۳، ۳۴۔

[۲] احوال محمد شاہ۔ تا آصف الدولہ (قلمی) ص ۶۔ ۷۔ سیتلا دیوی سے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو۔ BUCK. C. H: FAITHS, FAIRS AND FESTIVALS. PP. 74-75

[۳] کلیات سودا۔ جلد دوم ص ۱۶۶

اہلیہ میر حسن علی کا یہ بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ

"بچوں کی ولادت کے دن سے انھیں تعویذ گنڈوں سے مسلح کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر بے باکی سے کوئی اس رسم کا مذاق اُڑاتا ہے تو یہ عقائد باطلہ رکھنے والے اس کو ایک کافر سے بدتر خیال کرتے ہیں" ؎۱

لوگوں کو تعویذ گنڈوں پر بے حد عقیدہ تھا۔ اور ہر طرح کے امراض اور بلائے آسمانی کے دفع کے لئے بھی ان چیزوں کا استعمال کرتے تھے۔ مثلاً تعویذ برائے طفل، تعویذ برائے دفع تپ لرزہ، تعویذ برائے دفع حمرۃ، برائے دفع درد چشم، دفع جدری وغیرہ ؎۲

(۸) اختراعی اسمار کے نام کے روزے | البیرونی نے ہندوؤں کے مروجہ روزوں کے اقسام کا تفصیلی ذکر باب ۷۸ میں کیا ہے۔

بقول البیرونی "ہندوؤں کے نزدیک کل روزے نفل اور مستحب ہیں، کوئی بھی فرض نہیں ہے۔ روزہ نام ہے کسی مدت تک کھانا چھوڑ دینے کا۔ مدت کی مقدار اور فعل کی صورت کے لحاظ سے روزہ مختلف قسم کا ہوتا ہے۔"

؎۱ OBSERVATIONS ETC. II. P. 373,

آنند رام مخلص نے ہنسلی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "بطور حلقہ از طلا سازند و در گلوئے طفل می باشد۔ ہندی زبان آنرا ہنسلی نامند" میرآۃ الاصلاح۔ ص ۱۶۵ ب

؎۲ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ معمولات مظہری ص ۸۲ - ۸۴۔ کاشف الاستار (قلمی) ص ۳۶۹ الف تا ۴۱ ب - ہندوؤں کے ہاں جھاڑ پھونک سے متعلق اوہام کے لئے ملاحظہ ہو۔

کتاب الہند۔ جلد اول۔ ص ۲۵۷ - ۲۵۹

مثلاً اوسط درجے کا روزہ وہ ہے جس میں روزے کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔ کہ ایک دن مقرر کرے جس میں روزہ رکھا جائے گا۔ روزے سے جس کی خوشنودی کا حاصل کرنا مقصود ہے یا جس کے واسطے روزہ رکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ مثلاً اللہ یا کوئی فرشتہ (دیوتا) یا کوئی دوسرا شخص جس کا نام دل میں رکھے۔ پھر روزہ رکھنے والا آگے بڑھے اور روزہ رکھنے کے ایک دن پہلے کھانا دوپہر کے وقت کھلائے اور دانتوں کو خلال اور مسواک سے صاف کرکے دوسرے دن روزہ کی نیت کرے۔ اور اس وقت سے کھانا ترک کردے۔ جب روزہ کے دن کی صبح ہو دوبارہ مسواک کرے اور غسل کرے اس دن کے فرائض ادا کرے۔ اور ہاتھ میں پانی لیکر ہر "چہار" طرف پھینکے۔ اور جس کے واسطے روزہ رکھا ہے زبان سے اس کا نام لیتا رہے۔ روزے کے دوسرے دن صبح تک اسی حال میں رہے۔ جب آفتاب طلوع ہو جائے تو انطار کرے۔ [1]

اسی طرح روزے کے دنوں کا تعین کیا جاتا تھا۔ اور ہر ماہ کے نصف روشن کا آٹھواں اور گیارہواں دن عموماً روزہ کا دن ہوتا تھا۔ بالاستثنا رلون کے مہینے کے اس لئے کہ یہ مہینہ منحوس مانا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی نیک کام نہیں ہوتا۔ [2]

گیارہواں دن باسدیو کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ شہر متھرا کا راجہ ہوا تو اس کے قبل وہاں کے باشندے ہر مہینے ایک دن آندر کے نام کا میلہ لگاتے تھے۔ باسدیو نے ان لوگوں کو ترغیب دی کہ اس میلے کو گیارہویں دن منتقل کردیں تاکہ میلا اس کے نام پر ہو جائے۔ متھرا والوں نے ایسا ہی کیا۔ [3]

گمان غالب ہے کہ مسلمانوں نے بھی اس میلے سے متاثر ہو کر حضرت غوث الاعظم کی گیارہویں کے جلسے منعقد کرنے کا اہتمام کیا ہوگا۔

---

[1] کتاب الھند (ا۔ ف) ۲/ص ۵۷۔۳۶۰ [2] ایضاً ص ۳۶۱ [3] ایضاً ص ۳۶۱۔۳۶۲

اسی طرح مسلمان عورتوں نے بہت سے مصنوعی روزے کسی خاص تاریخی شخصیت کے نام سے اختراع کر لئے تھے۔ اور اسی طرح اِن کو اسلامی رنگ دیدیا تھا۔ اِن میں سے ہر ایک کے نام کے روزہ کا دن متعین کر لیا تھا۔ اور اسی مخصوص دن وہ روزہ رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح ہر دن کے روزہ کے افطار کے لئے اُنھوں نے مختلف اشیائے نُقل وطعام بھی مقرر کر لی تھیں اور اُنھیں سے افطار کیا جاتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ فلاں شخص کے نام کے روزہ رکھنے سے ان کی فلاں مراد بار آور ہو جائے گی۔ [1]

(۹) ارواح خبیثہ پر اعتقاد | ارواح خبیثہ کے اثرات پر عقیدہ رکھنے کا جتنا رواج ہندستان میں پایا جاتا تھا غالباً دنیا کے کسی دوسرے حصے میں نہیں تھا۔ [2] الہیہ میر حسن علی کا بیان ہے

"یہاں علماء اور جہلاء دونوں بعید از قواعد طبی ارواح کے اثر انداز ہونے پر اتنا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر کسی کو دورہ پڑ جائے تو ناظرین کو اس بات کا کامل یقین ہو جاتا ہے کہ اس مریض پر کسی ناپاک روح کا اثر ہے" [3] مزید براں وہ لکھتی ہیں کہ:

"اگر اچانک کوئی بیمار پڑ جائے اور ڈاکٹر اس کی تشخیص میں ناکام رہے تو یہی خیال

---

[1] معمولات۔ مظہری۔ ص ۳۹، نصیحتہ المسلمین کے مصنف نے لکھا ہے کہ 'حاضری حضرت عباس کی، صحنک۔ حضرت فاطمہ علیہ السلام کی، گیارہویں عبد القادر جیلانی کی، ملیدہ شاہ مدار کا۔ سمنی بو علی قلندر کی، توشہ شاہ عبد الحق کا کرنا اس نیت سے کہ یا حضرت تم ہمارا فلاں کام کر دو۔ کھانے کا خاص اہتمام کرنا کہ فاتحہ عباس کا صرف شیرمال اور کباب ہی پر ہو۔ اور فاتحہ شاہ عبد الحق کا بری حلوے ہی پر ہو، اور تاریخ کی تخصیص صرف ہندوستانیوں نے نکالی ہے۔ اور ہندوؤں کی طرح لیپنا۔ اور پوتنا۔ کھانے کے ساتھ پانی کا رکھنا اور بعضے تو حقہ اور افیون بھی رکھ لیتے ہیں۔' ص ۲۳، ۴۴، ۴۵

[2] ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS. III, P. 441A

[3] OBSERVATIONS ETC, II, P. 372-73

غالب آجاتا ہے کہ مریض پر کوئی بھوت پریت چڑھ آیا ہے۔ ایسی حالت میں شہر کے پاک اور متقی لوگوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مصیبت زدہ کی شفا کے لئے دعا کریں اس کے لئے ان بزرگوں سے تعویذ لکھوائے جاتے ہیں۔ ان تعویذوں کے متعقدین کا کہنا ہے کہ یہ تعویذ نہ صرف ان کے پہننے والوں کو بھوت پریت کے حملے سے محفوظ رکھیں گے بلکہ یہ ان کو اس بات کے لئے بھی مجبور کردیں گے کہ وہ فی الفور اس آدمی کو آزاد کردیں" [۱]

مختصر یہ کہ عورتوں کے عقیدے کے مطابق یہ بات لوگ شیخ سدّو وغیرہ [۲] اور سات عورتیں خدا کی قدرت سے سب عورتوں کے معاملات بنانے اور بگاڑنے کے مختار ہیں۔ یہ جس پر مہرباں ہوں وہ ہمیشہ آرام سے بسر کرتا ہے۔ اور اس کے برعکس اگر ان کا عتاب نازل ہو تو مدت العمر بیمار رہتا ہے بلکہ شب و روز غشی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ ان کی مہربانی اور نامہربانی کا دار و مدار ان کی نذر ادا کرنے پر ہے۔ اگر مدت کے بعد یہ کسی عورت کے سر پر آجائیں یعنی اس عورت میں حلول کر جائیں تو عورتیں شام ہی سے صاف ستھرے مکان میں عمدہ فرش بچھا کر جمع ہو جاتی ہیں اور تمام رات گاتی بجاتی رہتی ہیں [۳]۔ اکثر و بیشتر شیخ سدو کی روح عورتوں میں حلول کر جاتی تھی اور اس سے خلاصی کے لئے بیٹھک [۴] ہوتی تھی مٹھائیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔ اور بکرے کی قربانی کرنا لازمی سمجھا جاتا تھا۔ اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس طرح آسیب زدہ کو نجات مل جائیگی۔ سودا نے اپنے خاص شاعرانہ انداز میں ایک بیٹھک کا یوں ذکر کیا ہے۔

---

[۱] OBSERVATIONS ETC., II, P. 372-73.

[۲] برائے تفصیلی حالات مفتاح التواریخ ص ۵۰۱ ہفت تماشا ص ۹۹ خزینۃ الاصفیاء ۲/۳۱۰

[۳] ہفت تماشا - ص ۱۷۷

[۴] اس موقع پر جو رات کو مجلس ہوتی تھی وہ بیٹھک کہلاتی تھی۔ اس میں شرط یہ تھی کہ جس عورت کیلئے بیٹھک منعقد ہو وہ خود کو عمدہ لباس میں اور زیوروں میں آراستہ کرے۔ ہفت تماشا۔ ص ۱۷۷

ضاحک[1] کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا ؞ بے وجہ ساری رات ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا تب شیخ سدو اس پر اک تاؤ کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

ضاحک یہ سن کے بولا تم نے زباں نکالی بے آج کو کہا ہے کل دو گے مجھ کو گالی
بکرے کی شکل یاں تو نے گوری ہے نکالی بی بی کو اور ہم کو گھر کر دیا ہے خالی
بکرا دہ دیگی تم کو جن نے کہ سر چڑھایا

میراں یہ سن کے بولے پھر کہیو کیا کہا جی میں اس سوا نہیں کچھ اور حرف جانتا جی
بکرا اگر نہ آیا چھوڑوں گا کب چچا جی گالی تو اک طرف ہے یہ سن رکھو بچا جی
آگے ہے ڈھول دھپّا میں تم کو کہہ سنایا

ضاحک نے تب کہا یوں مجھ پاس کب ہیں کوڑے گڑ کے تو گلگلے ہیں اور تیل کے پکوڑے
میٹھا کرو جو منہ کو ڈھیلے کے ہیں گنڈورے تب شیخ سدو بولا سنتا ہے دھی کے ...
بھینسا ہی لے کے چھوڑوں خاطر میں کیا تو لایا

دمڑی میں منہ کو میٹھا تجھ کو ہمارے کرنا ؞ دو تیل کے پکوڑے آگے ہمارے دھرنا
گاے اپنے پر نہ دیکھا بھُس کا ہمارے بھرنا بکرا نہ لوں نہ بھینسا لوں تجھ سے گر تو ارنا
تب جانے گا تو بھڑ دے پیروں کو میں منایا[2]

ان سات افراد کے نام یہ ہیں۔ شیخ سدو، زین خاں، ننھے خاں، صدر جہاں، جہل تن، شاہ دریا اور شاہ سکندر اور ان سات عورتوں کے نام۔ لال پری، سبز پری، سیاہ پری، زرد پری، آسمان پری، دریا پری، اور نور پری۔[3] ان میں سے ہر ایک باری باری کسی عورت میں حلول کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض نسوانی اطوار رکھنے والے مرد بھی ان جودہ

---

[1] برائے حالات ملاحظہ ہو۔ تذکرہ شعرائے اردو۔ (میر حسن دہلوی) ص ۱۰۴۔ سودا نے بڑے طمطراق سے میر ضاحک پر کئی ہجویں لکھی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ کلیات سودا ا/ص ۳۲۲۔۔۳۴۰
[2] کلیات سودا۔ ا/ص ۳۴۰۔۳۴۱ باقی حاشیہ صفحہ ۴۱۸ پر

مرد عورت میں سے کسی نہ کسی کو اپنے میں حلول کرتے ہیں۔ ایسے مرد امیر زادوں میں سے ہی ہوتے ہیں وہ اس دن کے لئے رنگین لباس، زیور اور بغچہ رکھتے تھے۔ مردوں میں شاہ دریا اور شاہ سکندر دوسروں سے بلند مرتبہ سمجھے جاتے تھے۔ انھیں نوری شہزادے بھی کہا جاتا تھا۔ ان کو باہم سگے بھائی بتاتے تھے اور پریاں ان کی بہنیں تھیں، جو ایک ہی بطن سے تھیں۔ حد یہ تھی کہ یہ عقیدہ عورتوں کے ذہن سے نکالنا ناممکن تھا۔[۱]

(۱۰) تغیر دادن:۔ یہ رسم بھی تھی کہ جس راستے سے جاتے تھے اس راستے سے دوبارہ واپس نہیں آتے تھے۔

بادشاہوں اور حاکموں کا طبقہ بالخصوص اس توہم کے شکار تھے۔ آنندرام مخلص نے اس قاعدہ کی وضاحت یوں کی ہے۔

"بمعنی آنست کہ براہی کہ آمدہ شود براں راہ... نیامد رفت۔ وبراہ دیگر مراجعت باید نمود۔ وایں حرکت را متبارک می دانند۔ چنانچہ ملوک ہندوستاں قاعدہ دارند کہ براہی دروازہ... کہ جائے متوجہ می شوند بازباں راہ ہنگام مراجعت نمی آیند"[۲]

(۱۱) چراغی برائے حاجت:۔ خواہشمند لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اگر اپنی مراد باروری کی غرض سے کسی بزرگ کی خدمت میں کچھ نقدی ۔۔۔ بطور نذر پیش کی جائے۔ تو ان کی دلی مراد پوری ہو جائے گی۔ اس رسم کو "چراغی برائے حاجت دادن" کہتے تھے[۳]

(۱۲) قرون وسطیٰ میں اور اس زمانے میں بھی اگر کوئی شخص کسی اہم کام سے کہیں جا رہا ہو اور کوئی دوسرا شخص چھینک دے تو اس کو بدشگونی کی علامت سمجھتے تھے اور اس کام کو ملتوی کر دیتے تھے[۴]

(۱۳) کوچہ چیلاں (دہلی) محلہ کے کئی دروازے تھے اندر کی جانب ایک کنواں تھا جو

---

[۱] ہفت تماشا ص ۱۷۷۔ نیز ملاحظہ ہو۔ دریائے لطافت (ا۔ت) ص ۷۸، ۱۶۳، ۱۰۶، ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی ص ۴۸، نصیحتۃ المسلمین ص ۱۷، ۲۷

[۲] ہفت تماشا ص ۱۷۷، نصیحتۃ المسلمین ص ۴۳

[۳] مرآۃ الاصطلاح۔ ص ۶۳ ب [۴] ایضاً ص ۴۸ ب

[۵] کتاب الہند، ص ۲۴۲

پریوں کے کنویں کے نام سے مشہور تھا۔ شب شہادت کو ہزارہا مسلمان عورتیں اپنی مرادیں پوری کرنے کے لئے اس میں دو پڑیاں ڈالا کرتی تھیں۔ ایک پھول کی اور دوسری شیرینی کی اور جب کسی کی مراد پوری ہو جاتی تھی تو وہ حلوہ کا ایک کونڈا لاکر یہاں بہت سی عورتوں کو کھلاتی تھی۔ اس رات کو اس کنویں پر ایک جم غفیر ہوتا تھا۔[1]

(۱۴) بچہ کی ولادت سے متعلق بہت سی رسمیں مثلاً چھٹی، چلّہ وغیرہ کا غسل کی بنیاد بھی کسی نہ کسی وہم کی بنا پر تھی۔[2]

(۱۵) تل شکری کی رسم نہ صرف عوام میں بلکہ شاہی خاندان تک میں برتی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ سنکرانت کے موقع پر پٹیل (مادھوراؤ سندھیہ) نے شاہ عالم بادشاہ کی خدمت میں تل شکری پیش کی۔ بادشاہ نے زنان خانے میں جاکر خود بھی کھائی اور بیگمات کو بھی کھلائی۔ اس پر ایک منہ چڑھی بیگم بولیں "قصور معاف۔ ہندوستان میں یہ رسم ہے کہ باندی، غلام یا گھوڑا خریدتے ہیں، تو اسے تل شکری کھلاتے ہیں۔ تاکہ وفادار نکلے۔ حضور نے پٹیل کی تل شکری کھائی ہے، تو وفاداری بھی برتنا ہوگی"۔[3]

(۱۶) جس طرح ہندوؤں میں کسی خوشی کے موقع پر ست نرائن کی کتھا کی جاتی ہے اسی طرح مسلمانوں نے منّت کے طور پر سیدہ کی کہانی ماننا شروع کر دی تھی اور بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ ست نرائن کی کتھا اور جناب سیدہ کی کہانی کے بعض اجزاء بالکل یکساں ہیں۔[4]

(۱۷) دربار مغلیہ میں یہ رسم تھی کہ بادشاہوں کو نذر پیش کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا کہ رقم جفت نہ ہو بلکہ طاق ہو۔ مثلاً ۵۱، ۱۰۱، وغیرہ۔ یہ رسم ہندوستانی مسلمانوں میں اب بھی شادی بیاہ کے موقع پر برتی جاتی ہے۔ دولہا کو سلامی میں جو رقم دی جاتی ہے وہ طاق ہی ہوتی ہے

۱؎ ہفت قلزم (ساتواں قلزم) دہلی ۱۸۷۹ء ص ۳۹ ۲؎ سہاگن نامہ ص ۱۹، ۳؎ وقائع عالم شاہی ص ۱۱۲ ۴؎ رجب علی بیگ، حیات اور کارنامے (از نیر مسعود رضوی) لکھنؤ ۱۹۶۷ء ص ۳۶-۳۷۔

مزاروں پر چھڑیاں چڑھانا قدیم الایام سے ہندوؤں میں یہ رسم بدستور چلی آرہی ہے کہ وہ لوگ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کے مندروں پر سالانہ میلہ منعقد کرتے ہیں اور بالعموم زائرین اپنے ہاتھوں میں جھنڈیاں لے کر شرکت کے لئے دُور دراز مسافت طے کرکے آتے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی اس رسم کو دوسری شکل میں اپنا لیا۔ اور انہوں نے مندروں کے بجائے اپنے بزرگوں کے مزاروں پر جھنڈے لے کر جانا شروع کر دیا۔ قرون وسطیٰ میں ان جھنڈوں کو چھڑی یا نیزہ کہتے تھے۔ ہندو مسلمان دونوں ان بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ چھڑیاں لے کر عرس اور میلہ میں شرکت کے لئے جاتے تھے۔ رائے چترمن کایستھ اور دیگر مصنفین نے ان چھڑیوں یا نیزوں جلوسوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو دہلی سے مختلف جوانب کے لئے روانہ ہوتے تھے۔

چھڑی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری خواجہ معین الدین چشتی (متوفی ۶۳۵ھ ہجری) کا مزار اجمیر میں ہے۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان دونوں ان کی ذات بابرکات سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔ اور ایام عرس میں دُور دُور سے مسافرت طے کرکے لاکھوں کی تعداد میں خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے وہاں جاتے ہیں۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں سترھویں جمادی الثانی [1] کو حوض شمسی [2] کے قریب واقع خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ پر (یہ درگاہ مہرولی میں واقع ہے) اور دوسرے مقامات پر بے شمار زائرین اور تماشہ بیں جمع ہوتے تھے۔ نیزے کھڑے کرتے تھے۔ اور اجمیر کے لئے روانہ ہوتے تھے [3]

---

[1] ہفت قلزم (از منشی گوری شنکر) دہلی ۱۸۷۹ء میں ۱۴ جمادی الثانی لکھا ہے ص ۲۵۔ یہ غالباً غلطی سے لکھ دیا گیا ہے۔ عرس سترہویں جمادی الثانی کو ہوتا ہے۔ [2] قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے نواح میں سلطان شمس الدین التمش کا تعمیر کردہ حوض جو اس نے قریب ۶۲۷ھ/۱۲۲۹ء میں بنوایا تھا۔ یہ حوض سنگ سرخ کا بنا ہوا تھا۔ مگر اب سب ٹوٹ گیا ہے اور نرا تالاب ہی رہ گیا ہے۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ آثار الصنادید (مطبوعہ ۱۹۶۵ء) ص ۱۷۵۔ [3] خلاصۃ التواریخ و چہار گلشن محمد شاہی (قلمی) ص ۲۳۶ الف۔

چھڑی ظاہر پیر یا گوگا پیر | ان کا مزار میوات کے علاقے میں ..... کسی پہاڑی پر واقع ہے۔ عرفی مہینے کے سلونوں کے دن بولی بھٹیاری[1] نامی مقام پر نیزے گڑھے کرکے میوات کی جانب گوگا پہاڑی کے لئے روانہ ہوتے تھے[2]

چھڑی غازی میاں یا بالے میاں | عرفی مہینے کی سترھویں کو غازی میاں[3] کی چھڑیاں کھڑی کی جاتی تھیں۔ اور زائرین بہرائچ کے لئے کوچ کرتے تھے[4] ان ایام میں ان کی درگاہ پر بڑا مجمع ہوتا تھا۔ اور تین دن تک اُن کے آستانے پر لوگ عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ گرد ونواح کے عوام اور خواص اپنی مرادوں کی بار آوری کی غرض سے ان کے مزار پر چادریں چڑھاتے تھے۔ اور اپنے اس فعل کو عقبیٰ کے لئے سرمایہ سعادت اور دنیوی ترقیوں کا وسیلہ سمجھتے تھے۔[5] ماقبل غدر یہ چھڑیاں قلعہ معلی (دہلی) کے نیچے کھڑی کی جاتی تھیں۔ مگر مابعد جامع مسجد کے قریب کھڑی کی جانے لگی تھیں اور اسی مقام سے بہرائچ لے جاتے تھے۔[6] دہلی میں غازی بجر بوبجہ نامی ایک شخص تھا جو ہر سال غازی میاں کی چھڑیوں کا جلسہ منعقد کیا کرتا تھا اور اس میں صدہا روپے صرف ہوتے تھے۔ اس جلسہ کی کیفیت یہ تھی کہ تین دن تک وہ چھڑیاں برابر کھڑی رہتی تھیں اور اپنی دوکان میں جامع مسجد کی ایک نقل رکھ کر اس کے آگے ایک باغ معنوی اور اس میں

---

[1] اجمیری دروازے سے دو میل آگے یہ مشہور مقام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ محل بولا خاں پٹھان نے ایک پہاڑی پر بنوایا تھا۔ اور بعض لوگوں کا بیان ہے بوعلی بختیار نامی کسی ... بزرگ نے تعمیر کروایا تھا۔ غرض کہ اصلی نام کو بگاڑ کر بھوری یا بولی یا بھولی بھٹیاری کا محل کر دیا ہے۔ برائے تفصیل دیکھئے۔ واقعات دار الحکومت دہلی ۲/ ۵۶۱-۵۶۲ [2] تاریخ چہار گلشن محمد شاہی ص ۳۶ الف،

[3] کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے نواسے تھے۔ بہرائچ میں ہندو سرداروں سے لڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے سمیت ۱۰۲۳ھ میں شہید ہوئے۔ اور اسی مقام پر دفن کر دیئے گئے۔ برائے حالات ملاحظہ ہو خلاصۃ التواریخ ص ۳۴، ہفت تماشا ص ۱۰۴-۱۰۶، خزینۃ الاصفیا ۲/ ۲۱۷، تاریخ سید سالار مسعود غازی المعروف غزنامہ مسعود، قاموس المشاہیر ۲/ ص ۲۱۴ [4] تاریخ چہار گلشن محمد شاہی ص ۳۶ الف، خلاصۃ التواریخ ص ۳۴۔ [5] ہفت تماشا ص ۱۰۶

[6] ہفت قلزم ص ۲۵

فوارہ اور ہزارہ لگاتا تھا اور بہت روشنی کرتا تھا۔ نوبت بجتی تھی۔ جھاڑ فانوس اور قمقمے روشن ہوتے تھے۔ اور طرح طرح کی آتش بازی چھوٹتی تھی۔ ہزاروں آدمیوں کا اژدھام ہوتا تھا۔ عورت مرد جمع ہوتے تھے۔ اور ایک دلچسپ منظر ہوتا تھا[۱]

چھڑی سرور سلطان یا سلطان سخی سرور[۲] ہندی مہینہ ماگھ کے پہلے سوموار کو سلطان سخی سرور کی چھڑیاں روانہ ہوتی تھیں۔ غالباً شیخ نظام الدین اولیا کی باولی کے سامنے یہ چھڑیاں کھڑی ہوتی تھیں اور زائرین لکھی جنگل کے لئے روانہ ہوتے تھے[۳]۔ غدر کے بعد لاہوری دروازے کے باہر کھڑی کی جاتی تھیں۔ اور پھر وہاں سے ملتان کو جاتے تھے۔ یہ بھی ایک اچھا خاصہ میلہ ہوتا تھا اور بہت سے لوگ شریک ہوتے تھے[۴] رزاقیل نے لکھا ہے کہ جس طرح نچلے طبقے کے مسلمان نزدیک اور دُور سے جھنڈے لیکر شاہ مدار کے مزار پر ہر سال جمع ہوتے تھے۔ اسی طرح ہر سال ہر شہر کے باہر سرور کے نیزے بھی اٹھائے جاتے تھے۔ اور براہی (سخی سرور کے معتقد براہی کہلاتے تھے) ہر جھنڈے کے نیچے ڈھول بجاتے تھے۔ اور اپنے پیر کی مدح و ستائش میں گیت گاتے تھے، وہ خود بھی ناچتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی نچاتے تھے۔[۵]

---

[۱] ہفت قلزم ص ۳۴۴ ——— [۲] نام سید احمد اور سلطان سخی سرور یا لکھ داتا کے نام سے مشہور ہیں۔ مضافاتِ ملتان میں ایک موضع کرسی کوٹ میں ولادت ...... ہوئی اور لاہور میں مولوی محمد اسحٰق لاہوری سے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور تصوف میں اپنے والد کے علاوہ غوث اعظم اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے بھی فیوض حاصل کیے۔ بعدازاں وزیرآباد کے نزدیک موضع سودھرہ میں سکونت اختیار کی اور ہدایتِ خلق میں مشغول ہوئے۔ مابعد مقام دھونکل میں کئی برس رہے اور پھر اپنے وطن ڈیرہ غازی خاں کے قریب شاہ کوٹ چلے گئے۔ آپ کی شہادت ۱۸۱ھ میں ہوئی۔ مزار شاہ کوٹ کے قریب ہے۔ آپ کے زیر اثر سیکڑوں ہندو مسلمان ہوئے۔ برائے تفصیل دیکھیے۔ آب کوثر (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) ص ۸۲-۸۰ خزینۃ الاصفیا ۲ ص ۲۴۵-۲۴۸ W. Crook: PP. 132-33

[۳] تاریخ چہار گلشن محمد شاہی ص ۱۳۹ الف [۴] ہفت قلزم ص ۲۵ [۵] ہفت تماشا ص ۱۰۳-۱۰۴

چھڑی شاہ مدار[۱] المعروف بہ شاہ مدار | جمادی الاوّل میں بارہ پلہ[۲] کے قریب چھڑیاں برپا کرتے تھے۔ اور اسی ماہ کی پندرھویں کو مکن پور[۳] لے جاتے تھے۔ اور ان دنوں اسی مقام پر ایک بھاری میلہ لگتا تھا۔ یہ میلہ اب بھی لگتا ہے لاکھوں زائرین اور تجار دُور و نزدیک سے یہاں جمع ہوتے تھے۔ تین دن تک یہ میلہ رہتا تھا۔ مداری فقیر جن کا بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ بڑے طمطراق سے نقارہ، نرسنگھا اور توری بجاتے ہوئے معہ اپنے مریدین کے الگ الگ گروہوں میں وہاں پہونچتے تھے۔ ہر ایک گروہ کا اپنا ایک پیشوا ہوتا تھا۔ دُور سے آنے والے قافلے راستے میں پڑاؤ کرتے ہوئے سفر طے کرتے تھے[۴] میر حسن دہلوی نے اپنا لکھنؤ کا سفر شاہ مدار کے ایک قافلے کے ہمراہ کیا تھا۔ لہٰذا اُنھوں نے چشم دید منظر بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

مکن پور کو چھڑی چلتی تھی واں سے	اُٹھے ہم ساتھ اس کے اس مکاں سے
یہ مشفق میر... سیف اللہ جو ہیں	اور ان کے بھائی نور اللہ جو ہیں،
یہ دونوں اس سفر کے آشنا ہیں	اگرچہ ان دنوں مجھ سے جدا ہیں
مدار اس قافلہ کا تھا چھڑی پر	چلے ہم وہاں سے چھڑیاں ساتھ لیکر
زمیں میوات[۵] کا اکثر تھا عالم	عجائب مہوشاں تھیں اس میں باہم

۱۔ برائے حالات۔ ملاحظہ ہو۔ مرآۃ مداری۔ از عبدالرحمن چشتی، اذکار ابرار (ا۔ ت۔ گلزار ابرار) ص ۴۷-۴۸، ہفت تماشا ص ۹۹-۱۰۱، خلاصۃ التواریخ ص ۴۰-۴۱، مفتاح التواریخ ص ۱۱۵، خزینۃ الاصفیا W. Crooke. pp. 137-141
۲/ص ۳۱۰-
۲۔ دہلی کا یہ وہ پل ہے جو نظام الدین بستی اور بھوگل یا شاہی ہوسپٹس کے مابین ہے مگر بعد میں دہلی قلعہ کے نیچے کھڑی کی جاتی تھیں۔ اور مابعد جامع مسجد کے نیچے جہاں نہر کا پنجرا تھا اور چونکہ غدر میں وہاں کے تمام مکانات مسمار کر دیے گئے تھے اور وہ علاقہ میدان سا ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس میدان میں نیزے کھڑے کیے جاتے تھے۔ پھر مکن پور کے لئے روانہ ہوتے تھے۔ ہفت قلزم ص ۲۵
۳۔ اتر پردیش میں قنوج کے قریب یہ مقام واقع ہے۔ ۴۔ تاریخ چہار گلشن محمد شاہی ص ۳۶ ب
۵۔ میوات۔ صوبہ ہریانہ میں ایک علاقہ ہے جو میوات کہلاتا ہے اور وہاں کے مسلمان اپنے کو میواتی یا میو کہتے ہیں

کوئی پردے سے تھی چہرہ دکھاتی | کوئی آواز کچھ گا کر سناتی،
کوئی چلتی اُترا اٹکھیلیوں سے | کوئی بیٹھی ہی جی لیتی دلوں سے
جہاں ملتا کہیں پانی کا منبع، | وہاں ہوتا پریزادوں کا مجمع
کنویں پر یوں نظر آتا ہر ایک ماہ | کہ جوں یوسف کھڑا ہو بر سرِ چاہ
کوئی لیتا مٹھائی اور کوئی پان | کوئی جاتا کسی کے پاس انجان
کوئی آنچل سے اپنا منہ چھپاتی | کوئی پردہ اٹھاتی اور گراتی
کوئی شربت کوئی ساقو بناتا | کسی کو کوئی حقہ ہی پلاتا
کوئی بیٹھا کہیں کوئی پڑا تھا | کسی کا منتظر کوئی کھڑا تھا
پریزادوں میں تھے باہم اشارات | ہر اک چوکی تھی وہاں تختِ طلسمات
پہنچتے آکے جب منزل سرِ شام | اُتر پڑتا ہر اک وہاں بہر آرام

ملنگ فقیروں کے حرکات وسکنات اور حاجتمندوں کی حالت

ڈفالی[1] واں کھڑی کرتے تھے چھڑیاں | وہ چھڑیاں کیا بھلی لگتی تھیں کھڑیاں
زیادہ حاجتی مائل تھے سب سے | رسوم اس کی بجالاتے ادب سے
دیا[2] باتی سرِ شب روز کرتے | دیئے چھڑیوں کے آگے لاکے دھرتے
ملنگوں[3] کو جو دیکھا تو عجب حال | کھڑے ہلتے ہیں اور کھیلیں ہیں دھمال[4]
رہا نے ڈفلیاں بجتی ہیں پیہم | الم دم[5] کا لگاتے ہیں کھڑے دم
چڑھاتا ریوڑی کوئی کوئی پھول | ملیدا ہی کوئی لاتا بہ معمول،
کوئی مجرا[6] کوئی کرتا دعائیں . . ! | کھڑا چٹ پٹ کوئی لیتا بلائیں،

---

[1] چراغ بتی۔ [2] ایک قسم کے آزاد فقیر جو ڈفلی بجا کر اور گا کر مانگتے ہیں [3] ملنگ، فقیروں کا ایک خاص وضع سے ہل ہل کر ناچنا کودنا اور شور وغل کرنا۔ [4] چنڈو یا سلفے یا حقے کا ایک لمبا کش لگانا۔ [5] سلام کرنا

دیئے تھے وہ کہ دعوت کے چراغاں | ہوئی تھی جمع داں جنس پرستاں
مثالِ بید مجنوں ہر چھڑی تھی، | کہ اس کے گرد ہر لیلا کھڑی تھی،
وہ نیزے تھے کہ یا قدِ بتاں تھے، | کہ سجدے میں جن آگے انس و جاں تھے
وہ چھڑیاں تھیں کہ تھیں مژگانِ دلدار | دیا تھے پیر[۱] کے نیزے نمودار
سیہ نیزوں کا ہے ازبسکہ دستور | چراغوں میں وہ تھے شب نور
سیاہی یوں بھلی لگتی تھی سب کو | کہ گویا زلف تھی بکھری وہ شب کی[۲]

زیارت مزارات بزرگان دین | ہندوستان کا کوئی ہی ایسا بدقسمت شہر یا قصبہ یا گاؤں ہوگا جس میں کسی نہ کسی صوفی بزرگ کا مزار نہ ہو۔ اِن بزرگوں کو بالعموم مخدوم صاحب کہا جاتا ہے اور اس ولایت کا والی سمجھا جاتا ہے اور بعض لوگ تو اس قصبے کی آبادی کو ان کے قدموں کی برکت کے باعث سمجھتے ہیں۔ اور ان کی کرامتوں اور معجزوں کے دفتر محفلوں اور مجلسوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔[۳]

مزارات پر زائرین کا طرزِ عمل ہندوؤں کے اثر کا نتیجہ تھا جس طرح وہ لوگ دیوی دیوتاؤں سے اپنی حاجتوں کی بارآوری کی استدعا کرتے ہیں۔ مندروں میں جاکر نذر و نیاز و چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ اس طرح مسلمان زائرین بھی مزاروں پر جاکر نذر چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔ فاتحہ اور نذر کے کھانے مخصوص قسم کے ہوتے ہیں اور کچھ مخصوص لوگوں کو ہی یہ کھانا کھلایا جاتا ہے۔ سید اسمٰعیل شہید لکھتے ہیں "پس اس طعام کے اوب کا حاصل ہندوؤں کے ساتھ مشابہت پیدا کر لینے کے بغیر اور کچھ نہیں ہے۔ کیوں کہ اکثر اوقات وہ دالوں اور غلوں اور طعام کے اجناس کی پرستش کرتے ہیں اور کھانے والوں

---

۱ کسی پیر کے جھنڈے
۲ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی (گلزار ارم) ص ۱۳۷-۱۳۸۔ اس میلے کے بارے میں دیکھئے۔ اقتباس۔
۳ وقائع برائع (اورینٹل کالج میگزین۔ نومبر ۱۹۴۱ء) ص ۱۱۲، خلاصۃ التواریخ ص ۱۴۱، ہنگامۂ عشق ص ۲ الف، دبستان مذاہب ص ۲۱۴-۲۱۵، مراۃ الاصطلاح ص ۸۴ ب، نصیحۃ المسلمین ص ۱۵۰/۲۴، مفتاح التواریخ ص ۱۱۵
۴ ہفت تماشا ص ۱۶۸

کے لئے قید لگائی یعنی ایک کو کھانے سے منع کرتے اور دوسرے کو اس کی اجازت دیتے[۱]

نذر و نیاز کی رسم اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ کھانے اور دوسرے اشیائے خور سے گذر کر جانوروں کی نیاز چڑھانے لگے تھے[۲]

عورتوں میں بالخصوص اور مردوں میں بالعموم گور پرستی کا عام رواج تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے فتوحات فیروز شاہی گور پرستی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے بحکم شاہی عورتوں کا مزاروں پر جانا بند کروایا تھا۔ مگر سلطان بذات خود بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دیتا تھا اور ان سے استمداد کی درخواست کرتا تھا[۳]

عوام میں گور پرستی کی وبا اس بری طرح سے پھیل چکی تھی کہ انھیں بزرگ اور غیر بزرگ کی تمیز تک نہیں رہی تھی مثلاً سلطان علاء الدین خلجی ایک جاہل مطلق سلطان تھا۔ جمعہ کی نماز نہ پڑھتا تھا۔ پھر بھی لوگ اس کی وفات کے بعد اسے ولی اللہ سمجھنے لگے اور اس کی قبر پر منتوں کے ڈورے باندھنے لگے۔ بقول برنی۔

"بر کرامت او حمل می کردند و سخنان او را کہ در بر آمد مہمات ملکی و در فتح و نصرت لشکر از زبان او بیروں آمدے بر کشف و کرامت او تصور می کردند"[۴] (یہ باتیں) اس کی کرامت پر محمول کی گئیں اور مہمات ملکی اور لشکر کی کامیابی کے سلسلے میں جو بات اس کی زبان سے نکلتی تھی اس کے کشف و کرامت کا نتیجہ سمجھتے تھے)

اس ضمن میں حمید قلندر کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کی موجودگی میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے کہا کہ لوگ اس کی قبر پر زیارت کو جاتے ہیں اور اپنی مراد کی ریسماں باندھتے ہیں اور ان کی حاجتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ بندہ کو اس موقع پر ایک قصہ یاد آیا۔ وہ بیان کیا۔ انہی دنوں میں بندہ سلطان علاء الدین خلجی کے

[۱] صراط مستقیم (مطبوعہ دیوبند) ص ۶۵ [۲] ایضاً ص ۶۵

[۳] عفیف تاریخ فیروز شاہی (ا۔ ت) ص ۵۸۰-۵۵-۲۳۱ [۴] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۲۴

مزار کی زیارت کے لئے گیا تھا۔ نماز کے بعد زیارت کی اور وہاں پہونچا جہاں لوگ کلاوہ باندھتے ہیں اگرچہ میری کوئی حاجت نہ تھی۔ لیکن میں نے اپنے دستارچہ میں سے ایک ڈورا کھینچا اور وہاں باندھ دیا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص پکارتا ہے کہ وہ کون ہے جو سلطان علاء الدین کی قبر پر کلاوہ باندھ گیا ہے۔ اس کے چند بار پکارنے پر میں آگے بڑھا اور کہا میں نے باندھا ہے۔ کہا، تیری کیا حاجت ہے۔ بیان کر۔ میں نے کہا میری کوئی حاجت نہیں ہے۔ کیا بیان کروں" [۱]

حالانکہ سلطان فیروز شاہ تغلق نے گور پرستی کے تدارک کی پوری کوششیں کیں مگر وہ اس کام میں ناکام رہا۔ دورِ مغلیہ میں گور پرستی کے عقیدے کو بے حد تقویت ملی، کیوں کہ شاہانِ مغلیہ بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ شیخ سلیم چشتی [۲] کی دعا کی برکت سے اکبر بادشاہ کے حرم میں لڑکا تو ضرور پیدا ہو گیا [۳] مگر عوام پر اس کا اثر بہت زیادہ ہوا۔ اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ان بزرگوں کی برکت سے اولاد بھی ہو سکتی ہے۔ اور وفات کے بعد بھی ان کی کرامات اپنا اثر رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں اکبر بادشاہ جوشِ عقیدت میں برہنہ پا اور پیادہ خواجہ معین الدین چشتی کے مزار کی زیارت کے لئے آگرہ سے اجمیر جایا کرتا تھا [۴]۔ عوام اور امراء نے بھی اس کی تقلید میں یہ عمل شروع کر دیا تھا۔ جہانگیر بھی بزرگوں کے مزار پر حاضری دیتا تھا۔ شاہ جہاں اپنی دینداری اور دین پروری اور مذہبی جوش میں اکبر اور جہانگیر سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جب لگاتار کئی لڑکیاں اس کے حرم میں پیدا ہوئیں اور لڑکے کی ولادت کی امید نہ رہی تو اولادِ نرینہ کی خواہش نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ کسی بزرگ کے مزار پر جا کر اپنی دلی مراد کی تکمیل کی درخواست کرے (باقی)

۱؎ خیر المجالس (ا ت) ص ۲۴۱-۲۴۲ ۲؎ خزینۃ الاصفیا ۱/ ص ۴۳۲-۴۳۶، بدایونی (ا ت) ص ۵۶۸ ۳؎ بدایونی (ا ت) ص ۳۹۲ ۴؎ ایضاً ص ۲۳۸-۲۵۰

ادبیات

غزل

الٓم مظفر نگری

اہلِ چمن ہیں عزمِ بیاباں کئے ہوئے
جوشِ جنوں سے پھر کوئی پیماں کئے ہوئے

وہ آرہے ہیں حشر کا ساماں کئے ہوئے
شانوں پہ گیسوؤں کو پریشاں کئے ہوئے

دیوانے ہیں انھیں کہے بہاروں میں اس لئے
آتے ہیں پھول چاکِ گریباں کئے ہوئے

لے کام شوقِ دید ذرا تابِ دید سے
ہر جلوے کو ہیں آج وہ عریاں کئے ہوئے

منزل کی سمت بڑھتے ہی جاتے ہیں اہلِ شوق
دشواریوں کو راہ کی آساں کئے ہوئے

تنظیمِ ناروا سے یہ اربابِ گلستاں
گلشن کی وسعتوں کو ہیں زنداں کئے ہوئے

میں جا رہا ہوں پھر طرفِ جلوہ گاہِ ناز
ہر جنبشِ نظر کو غزلخواں کئے ہوئے

تسکیں ملے گی دونوں جہاں سے ہو بے نیاز
خوئے طلب ہے تجھکو پریشاں کئے ہوئے

مجبور مجھکو لطفِ اسیری نے کر دیا
بیٹھا ہوں دل کو خوگرِ زنداں کئے ہوئے

اے انقلابِ تازہ نہ چھیڑ ہمکو تو کہ ہم
ہیں امتحانِ گردشِ دوراں کئے ہوئے

کیا کام ناخدا سے، کہ ہم بحرِ عشق میں
ہر موجِ زندگی کو ہیں طوفاں کئے ہوئے

بیٹھا ہوں غمکدے میں، بگرمیِ سوزِ غم
ہر اک نفس کو شمعِ شبستاں کئے ہوئے

یہ کون چھپ کے لالہ وگل میں سرِ چمن
ہے داغہائے دل کو نمایاں کئے ہوئے

تہذیبِ نو کی تیغ طرازی نہ پوچھیے
انساں کو ہے مخالفِ انساں کئے ہوئے

وہ دے رہے ہیں دعوتِ تسکیں مجھے الٓم
تاروں سے شامِ غم کو درخشاں کئے ہوئے

غزل

از جناب سعادت نظیرؔ

ساری دنیا لے رہی ہے امتحاں پر امتحاں
اللہ، اللہ! پھر بھی جیتا ہے نظیرؔ خستہ جاں

واقعاتِ زندگی ہیں اک انوکھی داستاں
میں سناؤں بھی تو کیسے، کون سمجھے گا یہاں

ہے کبھی شامِ خزاں تو ہے کبھی صبحِ بہار
نت نئی تبدیلیوں کا نام ہے نظمِ جہاں

پیچ و خم سے راہ کی، بیگانہ ہے جس کی نظر
ہو چکا منزل کا رہبر ایسا میرِ کارواں،

حالِ دل کہہ کہہ کے ہمدم میں ادھر بے حال ہوں
اور مشتاقِ سماعت ہیں اُدھر اہلِ جہاں

ماہیِٔ بے آب کی صورت تڑپتا ہوں نظیرؔ
ہو غمِ ہجراں تو تسکینِ دلِ محزوں کہاں

غزل

فانیؔ مراد آبادی

چل کے آؤ غمِ تنہائی میں
وا دریچے ہیں اب مری شب کے

روشنی کو نہ چھو سکا کوئی
جانے والے پہنچ گئے کب کے

خردمندوں کی کون سنتا ہے
ہوش گم ہو گئے کہاں سب کے

غنچۂ دل نہ کھل سکا اب تک
آئی کیسی بہار ہے اب کے

کفر ہے اس سے مایوسی
ڈھنگ نرالے ہیں اس مرے رب کے

اس زمیں پر چلو مگر نہ ہو معلوم
دن گزارو جہاں میں یوں دب کے

تبصرے

شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول:- از ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تقطیع خورد ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت -/۲ پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ع۶

فاضل مصنف چند سال سے اسلامی نظام بنک کاری کا مفصل اور واضح خاکہ مرتب کرنے میں مصروف ہیں اور ایک بڑی حد تک اس کی تکمیل بھی کر چکے ہیں، لیکن چونکہ ایسے کسی نظام کی بنیاد شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول اور ان کے ماتحت فقہی احکام و مسائل ہی ہو سکتے ہیں اس بنا پر موصوف نے اس کتاب میں انھیں اصول کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے مختلف عنوانات کے ماتحت مجموعی طور پر بارہ اصول متعین کئے ہیں اور ہر ایک اصل کی تشریح اور اس کی تعیین کر کے اس پر بحث کی ہے۔ یہ بحث فقہ کے مذاہب اربعہ کے اندر دائر سائر ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان سے اختلاف ظاہر کر کے خود اپنی آزاد رائے بھی مدلل بیان کی ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے وسیع مطالعہ اور عمیق غور و خوض کے بعد اور بڑے اعتدال و توازن کے ساتھ مانوس و دلنشیں عبارت میں لکھا ہے معاشیات کے طلبا کے علاوہ مدارس عربیہ کے علماء اور اساتذہ کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے

معروف و منکر:- از مولانا سید جلال الدین عمری تقطیع خورد ضخامت ۱۵۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد -/۵ پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ع۶

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ہی ... اُمّت محمدی کے خیر امت ہونے کا دار و مدار ہے، اگر یہ ہے تو یہ امت خیر امت ہے۔ ورنہ نہیں ہے۔ اس بنا پر اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے اس کتاب میں ہے اس پر ہی گفتگو کی گئی ہے۔ کہ معروف اور منکر کی تعریف اور حقیقت کیا کی

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین ہے یا فرض کفایہ۔ ان کی شکلیں اور صورتیں کیا کیا ہوتی ہیں اور اشخاص و افراد اور حالات و ظروف کے تغیر و تبدل سے اس کے احکام میں کیا تغیر ہوجاتا ہے۔ اس کے شرائط و آداب اور وسائل و ذرائع کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ لیکن لائق مصنف نے پورے دین کو ہی ان دو لفظوں میں سمیٹ لیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں تواصی بالحق۔ تبلیغ، دعوت الی اللہ تذکیر۔ اور مجادلہ بالتی ہی احسن ان سب چیزوں کا ذکر ہے۔ اور موقع و محل۔ مصلحت و مناسبت اور اشخاص و افراد کے اعتبار سے ان میں سے ہر ایک کی وہی اہمیت ہے جو اپنی جگہ پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہے، پھر قرآن کی رو سے خود منکر کے مفہوم میں وہ وسعت نہیں ہے، جو مولف ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک منکر فحشا کے معنی میں ہے جو غایت درجہ بے حیائی اور وقاحت پر مشتمل ہے بہرحال کتاب بڑی محنت اور جستجو سے لکھی گئی ہے۔ اس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہوگا۔ اور مفید بھی!

جدید عربی ادب کا ارتقاء از ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی تقطیع خورد ضخامت ۱۶۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت 2/7 پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

عربی ادب کا دور جدید اس اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ کہ اس دور میں انشاء ادب۔ تنقید صحافت تحقیق و تصنیف ان میں سے ہر ایک کا معیار بہت اونچا ہوگیا ہے۔ اور اس دور میں ادبا، شعراء مصنفین اور محققین اس کثرت سے پیدا ہوئے ہیں کہ عربی زبان ایک چمن زار بن گئی ہے۔ یہ کتاب عربی ادب کے اس دور کی تاریخ ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن پُر از معلومات اور مفید ہے ہمارے ملک کا عربی خواں طبقہ اس دور جدید سے بالکل بے خبر ہے۔ اسے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

اصناف ادب کا ارتقاء از سید مرتضیٰ صاحب تقطیع خورد صفحات ۸۴ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱/۵۰ ...

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں ادب کے مختلف اصناف غزل، قصیدہ

مثنوی، افسانہ ناول اور ڈرامہ وغیرہ کا ارتقا بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کتاب اس درجہ مختصر ہے کہ کسی اسکول ٹیچر کے نوٹ معلوم ہوتے ہیں۔

داستانِ چند:۔ از جناب راز چاند پوری مرحوم تقطیع خورد

ضخامت ۲۷۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۔/۶ پتہ نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

مصنف اُردو زبان کے معروف ادیب اور شاعر ہیں۔ حضرت سیماب اکبر آبادی کے خاص اور نہایت بے تکلف دوستوں میں تھے۔ اور برسوں تک آگرہ میں ساتھ بھی رہے تھے۔ اس بنا پر سیماب صاحب مرحوم کی شخصیت شاعری اور ان کے دوسرے سوانح حیات کے متعلق ان کے پاس خطوط پُرانے رسالوں اور اپنی یادداشتوں کا ایک ایسا ذخیرہ موجود تھا جو کسی اور کے پاس مشکل سے ہوگا۔ یہ کتاب انہیں یادداشتوں پر مشتمل ہے اس کے بعض بیانات سے سیماب صاحب کے بعض خاص شاگردوں کو صدمہ ضرور ہوگا لیکن بہر حال اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔

حیاتِ ذاکر حسین

مؤلفہ: خورشید مصطفیٰ صاحب رضوی

صدر جمہوریہ ہند جناب ذاکر حسین خاں کی خدمات علم و ایثار و قربانی سے بھرپور زندگی کی کہانی جس پر پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے پیش لفظ تحریر فرمایا اور اس کتاب کو قابلِ رشک و تحسین قرار دیا ہے۔

یہ کتاب متعدد انگریزی، اردو کی کتابوں، ملکی اور غیر ملکی رسائل و اخبارات کی چھان بین کے بعد قلمبند کی گئی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی تاریخ کے "اہم دور" یعنی ذاکر صاحب کے زمانہ کے حالات و واقعات سے مستند ترین حوالوں اور خود ذاکر صاحب سے متعدد ملاقاتوں کی روشنی میں پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے۔

کتابت طباعت اور کاغذ بہتر، سائز متوسط ۲۰×۳۰ پارچہ کی عمدہ جلد قیمت آٹھ روپے

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

Registerd No. D. 183

DECEMBER 1969

مستم و مالک محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کے دفتر برہان دہلی سے شائع کیا